خدا رحمت کند

مولانا ندیم الواجدی

دار الکتاب دیوبند

خدا رحمت کند

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

تفصیلات

نام کتاب............ : خدا رحمت کند

نام مصنف............ : مولانا ندیم الواجدی

طبع اوّل .... : ۱۴۳۱ھ/۲۰۱۰ء

صفحات............ : ۳۶۸

کمپیوٹر کتابت ...... : محمد مستقیم سالکؔ قاسمی مدھوبنی

یاسر ندیم کمپیوٹرس دیوبند

مطبع.................. : یاسر ندیم آفسیٹ پریس دیوبند

باہتمام............... : واصف حسین مالک دار الکتاب دیوبند

ناشر................. : دار الکتاب دیوبند

بنا کردند خوش رَسمے بہ خاک وخُون غَلطیدن

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طِینَت را

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

اللّٰهم اَكْرِمْ نُزُلَهٗ وَوسِّعْ مَدْخَلَه وَاَبْدِلْه دَاراً
خَيْراً مِّنْ دَارِهٖ وَاَهْلاً خَيْراً مِّنْ اَهْلِهٖ وَنَقِّهٗ مِنَ الْخَطَايَا
وَالذُّنُوْبِ كَمَا يُنَقَّى الثَّوبُ الْاَبْيَضُ مِنَ الدَّنَسِ وَبَاعِد
بَيْنَه وَبَيْنَ خَطَايَاهُ كَمَا بَاعدتَّ بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ
اَللّٰهُمَّ لاَ تَحْرِمْنَا اَجْرَه وَلاَ تَفْتِنَّا بَعْدَه.

فہرست مضامین

نمبرشمار	عنوانات	سن وفات	صفحات
	پیش لفظ		۹
۱	ایک شمع رہ گئی تھی دلیل سحر سو وہ بھی خموش ہے سعودی عرب کے شاہ فیصل کی وفات	۱۳؍مارچ ۱۹۷۵ء	۱۱
۲	بے باک صحافی، مصنف اور شاعر حضرت مولانا عامر عثمانی دیوبندیؒ	۱۲؍اپریل ۱۹۷۵ء	۱۵
۳	ایک مؤرخ، ایک عالم، ایک قائد حضرت مولانا محمد میاں دیوبندیؒ	۲۲؍اکتوبر ۱۹۷۵ء	۲۱
۴	دارالعلوم دیوبند کے ترجمان، مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع عثمانی دیوبندیؒ	۱۱؍شوال ۱۹۷۶ء	۲۹
۵	فن حدیث کی عظمتوں کے نقیب، فخر المحدثین شیخ الحدیث حضرت مولانا شریف حسن دیوبندیؒ	۲؍جون ۱۹۷۷ء	۴۰
۶	تاریخ دارالعلوم دیوبند کے مصنف جناب سید محبوب رضویؒ	۲۵؍مارچ ۱۹۷۹ء	۴۷
۷	علوم اسلامیہ کے تاج دار، اسلاف کی آخری یادگار حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ	۱۷؍جولائی ۱۹۸۳ء	۵۸
۸	دارالعلوم دیوبند کی تاریخ کا قیمتی اثاثہ حکیم الام حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ	۱۷؍جولائی ۱۹۸۳ء	۷۰

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

۹	صاحب علم وفضل، حامل دین وشریعت میرے دادا حضرت مولانا احمد حسن دیوبندیؒ	۱۸/۱کتوبر۱۹۸۳ء	۷۸
۱۰	ملی تاریخ کا روشن عنوان مفکر ملّت حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ	۱۲/مئی۱۹۸۴ء	۹۲
۱۱	علم وتحقیق کی دنیا کے بے تاج بادشاہ حضرت مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ	۲۴/مئی۱۹۸۵ء	۱۰۱
۱۲	مشفق، مربّی، محسن، کرم فرما رئیس القلم حضرت مولانا سید ازہر شاہ قیصرؒ	۲۷/نومبر۱۹۸۵ء	۱۱۱
۱۳	ملّت کے عظیم رہ نما امیر شریعت حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ	۲۰/مارچ۱۹۹۱ء	۱۲۰
۱۴	ایک دل آویز شخصیت کے مالک حضرت مولانا حامد الانصاری غازیؒ	۱۶/۱کتوبر۱۹۹۲ء	۱۳۰
۱۵	ولی کامل، مرد حق آگاہ حضرت مولانا مسیح اللہ خاں شروانیؒ	۱۳/نومبر۱۹۹۲ء	۱۴۰
۱۶	مجسّم شفقت، سراپا محبت میری دادی مرحومہ	۱۵/مئی۱۹۹۴ء	۱۵۰
۱۷	آج کچھ درد میرے دل میں سوا ہوتا ہے حضرت مولانا وحید الزماں کیرانویؒ کچھ حقائق، کچھ تأثرات	۱۵/اپریل۱۹۹۵ء	۱۶۲
۱۸	ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہوں جسے وحید العصر حضرت مولانا وحید الزماں کیرانویؒ	۱۵/اپریل۱۹۹۵ء	۱۹۱

۱۹	ایک عظیم فقیہ ایک عظیم مرشد فقیہ الامت حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہیؒ	۲/ستمبر ۱۹۹۶ء	۲۰۳
۲۰	ہمارے زمانے کے جنید و شبلی اور بایزید بسطامی حضرت مولانا قاری صدیق احمد باندویؒ	۲۸/اگست ۱۹۹۷ء	۲۱۳
۲۱	رائد علم، قائد ملّت مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی میاں ندویؒ	۳۱/دسمبر ۱۹۹۹ء	۲۲۴
۲۲	عالم، مصنف، صحافی حضرت مولانا محمد عثمان معروفی اعظمیؒ	۶/جون ۲۰۰۰ء	۲۳۶
۲۳	مدرسہ شاہی مراد آباد کے مہتمم حضرت مولانا رشید الدین حمیدیؒ	۲/جون ۲۰۰۱ء	۲۳۹
۲۴	قابل اعتماد اور لائق استاذ مفتی حضرت مولانا عبد الرحیم لاجپوریؒ	۱۸/نومبر ۲۰۰۱ء	۲۴۳
۲۵	بے باک صحافی، پرجوش قائد حضرت مولانا سید احمد ہاشمیؒ	۲۲/نومبر ۲۰۰۱ء	۲۵۲
۲۶	مفسّر قرآن، شارح حدیث حضرت مولانا عاشق الٰہی بلند شہریؒ	۲۸/نومبر ۲۰۰۱ء	۲۵۵
۲۷	دیوبند کے ایک نیک سیرت انسان حافظ محمد اکرم الٰہی دیوبندیؒ	۹/جنوری ۲۰۰۲ء	۲۶۰
۲۸	کتاب زندگی کے آخری باب کا اختتام حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ	۴/اپریل ۲۰۰۲ء	۲۶۴
۲۹	لائق استاذ اور فعال منتظم مولانا مفتی محمد انوار الحق دربھنگویؒ	یکم/اپریل ۲۰۰۴ء	۲۷۶

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

۳۰	ملّت اسلامیہ کے لائق فرزند، دارالعلوم کے ممتاز فاضل حضرت مولانا محمد رضوان القاسمیؒ	۱۱؍اکتوبر۲۰۰۴ء	۲۸۱
۳۱	آخری صف بھی چراغوں کی بجھا چاہتی ہے محی السنّہ حضرت مولانا شاہ ابرارالحق حقیؒ	۱۷؍مئی۲۰۰۵ء	۲۸۵
۳۲	ملت کے عظیم رہنما اور قائد حضرت مولانا سید اسعد مدنیؒ	۶؍فروری۲۰۰۶ء	۲۹۰
۳۳	سفر تمام ہوا آبلوں پہ چلتے ہوئے صحافی بابو نسیم مسعود عثمانیؒ	۷؍جولائی۲۰۰۶ء	۳۰۰
۳۴	درخشید و لے شعلۂ مستعجل بود دیوبند کے ایک صحافی اسلم انصاریؒ	۱۵؍جولائی۲۰۰۶ء	۳۰۷
۳۵	قادرالکلام شاعر، متواضع مفتی اور عالم مفتی کفیل الرحمٰن نشاط	یکم؍اگست۲۰۰۶ء	۳۱۰
۳۶	یادگار اکابر، محدث جلیل، مفسّر قرآن شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد نعیم دیوبندیؒ	۲۳؍اگست۲۰۰۷ء	۳۱۸
۳۷	سلطنت علم کا بے تاج بادشاہ حضرت مولانا سید انظر شاہ کشمیریؒ	۲۶؍اپریل ۲۰۰۸ء	۳۲۷
۳۸	منفرد عالم دین حضرت مولانا سید انظر شاہ کشمیریؒ	۲۶؍اپریل ۲۰۰۸ء	۳۴۷
۳۹	رفتید و لے نہ از دلِ ما شیخ الحدیث حضرت مولانا نصیر احمد خاںؒ	۴؍فروری۲۰۱۰ء	۳۵۷

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

پیش لفظ

پیش نظر کتاب ’’خدا رحمت کند‘‘ مرحومین پر لکھے گئے تعزیتی اور تأثراتی مضامین پر مشتمل ہے، جن حضرات سے احقر کو قربت یا قرابت رہی ہے یا جن بزرگوں سے اس کو عقیدت اور محبت رہی ہے ان کی وفات کے بعد دل میں لکھنے کی تحریک پیدا ہوئی جس کے نتیجے میں یہ مضامین وجود میں آئے، ان میں سے اکثر مضامین اخبارات ورسائل میں چھپے ہوئے ہیں، مضامین کو مجموعی شکل دینے اور شائع کرنے کی بات سامنے آئی تو خیال ہوا کہ اس طرح کے تمام مضامین بھی یک جا کردئے جائیں، ان مضامین میں محض کسی آزردہ خاطر یا کسی دل گرفتہ شخص کے تأثرات ہی نہیں ہیں بلکہ جس شخصیت پر مضمون لکھا گیا ہے اس میں اس شخصیت کی علمی اور اصلاحی زندگی کے بعض پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، اس طرح کتاب میں بہت سی چیزیں ایسی جمع ہوگئی ہیں جن سے پڑھنے والے کچھ نہ کچھ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

دارالعلوم دیوبند میرا مادر علمی ہے، میری زندگی کا بڑا حصّہ یہیں گزرا ہے، فطری طور پر میرا تعلق ان حضرات سے زیادہ ہے جو کسی نہ کسی طور پر اس ادارے سے وابستہ رہے ہیں، اس طرح یہ پوری کتاب دارالعلوم کے اردگرد ہی گھومتی ہے، اس ادارے کے ذمہ دار حضرات، اس ادارے کی مجلس شوریٰ کے اراکین، اس ادارے کے اساتذہ، اس ادارے سے فارغ ہونے والے علما وصلحا، یہی حضرات ہیں جن کے انتقال کے بعد مضامین لکھے گئے ہیں، مقصد تحریر اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرلیا جائے اور پڑھنے والوں کے سامنے مرحومین کی زندگی کے کچھ روشن پہلو آجائیں، جانے والے چلے جاتے ہیں، اپنے پیچھے یادوں کا کارواں چھوڑ جاتے ہیں، پیچھے رہ جانے والوں کے لئے اسی کارواں کی گرد سفر قیمتی متاع حیات بن جاتی ہے، حدیث شریف میں تلقین فرمائی گئی ہے کہ اپنے مرحومین کے

محاسن کا ذکر کیا کرو، غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے محاسن کے ذکر سے حسن عمل کی تحریک اور توفیق ہو، اور دل میں ان جیسا بننے کا جذبہ پیدا ہو۔

تقدم وتأخر سے بچنے کے لئے مضامین کی ترتیب سن وفات کے لحاظ سے قائم کی گئی ہے یعنی جس شخصیت کی وفات پہلے ہوئی اس شخصیت پر لکھا گیا مضمون پہلے دیا گیا ہے، اور جس کی بعد میں ہوئی اس کا بعد میں دیا گیا ہے، اس ترتیب سے واقعات کے بیان میں ایک گونہ تسلسل بھی نظر آتا ہے، مجھے امید ہے یہ مجموعۂ مضامین پسند کیا جائے گا بہت سے بزرگوں پر مضامین لکھے ہوئے موجود ہیں لیکن وقت کی کمی کی وجہ سے ان پر نظر ثانی نہ ہوسکی، خیال ہے کہ یہ مضامین کسی دوسرے مجموعۂ مضامین میں کسی دوسرے نام سے شائع کئے جائیں، کئی اور شخصیتوں پر لکھنا چاہتا تھا لیکن نہ لکھ سکا، وہ شخصیتیں میرے سامنے رخصت ہوئی ہیں اور میں خود ان کو کاندھا دینے میں شریک رہا ہوں، ایسے حضرات کے روشن نام اور پاکیزہ چہرے ہر وقت دل کے نہاں خانوں میں آباد رہتے ہیں، دل میں ان پر لکھنے کا تقاضا شدید تھا لیکن ان دنوں ہجوم کار نے فرصت نہ دی اور یہ ارادہ اور دل کا یہ تقاضا عمل کا ملبوس نہیں پہن سکا، خدا توفیق دے، ان شاء اللہ یہ قرض بھی اتارا جائے گا بالخصوص ان حضرات اساتذۂ کرام پر لکھنے کو دل بڑا بے چین رہتا ہے جو اب اس دنیا میں نہیں رہے، جن کے بے شمار احسانات ہیں، اب صرف ان کی یادیں باقی رہ گئی ہیں یادوں کے ان چراغوں کو روشن کرکے آنے والی نسلوں کے سامنے رکھنے کی ضرورت شدت سے محسوس کرتا ہوں، خدا کرے بزرگوں کا یہ ذکر جمیل ہم سب کے لئے مفید ہو، اور ان حضرات کے واقعات پڑھ کر ہمیں اپنی زندگی سنوارنے کا موقع مل جائے، اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

آپ کا
ندیم الواجدی
مدیر ماہ نامہ ''ترجمان دیوبند''
۱۵/مارچ ۲۰۱۰ء

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

ایک شمع تھی دلیل سحر سو وہ بھی خموش ہے

سعودی عرب کے شاہ فیصل کی وفات

شاہ فیصل کی شہادت پر ہر دل سوگوار ہے اور ہر آنکھ پرنم، یہ ماتم، یہ نالۂ وشیون اس لیے نہیں کہ ایک شہنشاہ وفات پا گئے، ایک ملک کا سربراہ شہید کر دیا گیا، بلکہ غم اس کا ہے کہ اسلام کا مخلص، جاں باز اور اس کی خاطر ہمیشہ مضطرب رہنے والا خادم نگاہوں سے اوجھل ہو گیا، یہ صرف ایک فرد کی موت نہیں، اس پوری تاریخ کی موت ہے جو اس فرد کی ذات سے وابستہ تھی اور جس کی سطر سطر اس نے اپنے خونِ جگر سے لکھی تھی شہادت کی تفصیل اخبارات میں آ چکی ہے، کوشش کی گئی تھی کہ حادثے کی شدت میں تخفیف کی جائے اور اس کا بھیانک پہلو ہلکا بنا دیا جائے، اس کے لیے یہ افسانہ گھڑا گیا کہ قاتل کا ذہنی توازن ٹھیک نہ تھا، مگر اب اس کا بھرم کھل گیا ہے اور ڈاکٹروں کے معائنے سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آ گئی ہے کہ قتل پورے شعور کے ساتھ کیا گیا تھا، مگر اب بھی معاملے کے بہت سے پہلوؤں سے غبار صاف نہیں ہو سکا ہے، تاہم ایسا لگتا ہے کہ یہ صورتِ حال زیادہ دیر تک باقی نہیں رہے گی جلدی ہی اس سانحے کا واقعی پس منظر واضح ہو جائے گا، وہ شخصیتیں، ادارے اور ملک ابھر کر سامنے آئیں گے جنھوں نے اس خوفناک سازش میں حصہ لیا ہے وقت سے پہلے کوئی رائے قائم کرنا بہت مشکل ہے، روس نے امریکہ کو موردالزام ٹھہرانے کی کوشش کی ہے۔

اگر مشرق وسطیٰ کے حالات کا صحیح تجزیہ کیا جائے تو یہ الزام محض الزام ہی نہیں حقیقت بھی بن سکتا ہے۔

گذرے ہوئے سال کے آغاز میں ایک ایسے منصوبے پر ہاتھ رکھا ہی جا چکا ہے جسے امریکہ کے بدنام ترین ادارے سی آئی اے نے تیار کیا تھا اور جس کی رو سے یہ طے تھا کہ سعودی عرب کا شیرازہ منتشر کر دیا جائے، ظاہر ہے اگر امریکہ داخلی بغاوت کے اس منصوبے میں کامیاب ہوگیا ہوتا تو مشرق وسطیٰ کی صورت حال بہت کچھ بدلی ہوئی ہوتی۔

حقیقت یہ ہے کہ امیر فیصل بہت سی آنکھوں میں کھٹک رہے تھے، ان کی زندگی کا ہر لمحہ اسلامی طاقتوں کی شیرازہ بندی، اتحاد اور تنظیم کے لیے وقف ہو چکا تھا، سعودی عرب کی دولت کا بڑا حصہ کلمۂ حق کی سربلندی کے لیے صرف ہو رہا تھا، ایک ایسا شخص دشمنوں کا محبوب نظر کیسے ہوسکتا ہے جس کے دل کی ہر دھڑکن اسلام کی آواز بن کر نکلتی ہو جس کی ہر سانس میں اسلام کی خوشبو رچی بسی ہوئی ہو، پہاڑوں جیسے بلند اور مضبوط عزائم رکھنے والا یہ مجاہد صہیونی شر پسندوں کے لیے خطرے کا زبردست نشان تھا، اس مجاہد کی شہادت سے ان طاقتوں کو مشرق وسطیٰ میں نفوذ کی بہت سی سہولتیں حاصل ہوگئی ہیں۔

کون جانتا تھا کہ ۱۹۰۶ء میں پیدا ہونے والا ایک بدوی بچہ اس صدی کا صلاح الدین ایوبی بنے گا، اس کی ذات سے بہت سی امیدیں وابستہ ہو جائیں گی یہ ایک مینارۂ نور ہوگا جس سے دور دور تک روشنی پھیلے گی۔ اس کی خبر کسی کو بھی نہ تھی، وہ نجد کے مشہور خاندان ''آل سعود'' میں پیدا ہوئے، دور بینی، گہرائی اور تدبر جیسے اوصاف انھیں ورثے میں ملے تھے، ۱۹۲۶ء میں جب یہ خاندان نجد و حجاز کی متحدہ مملکت کا سربراہ تسلیم کیا گیا اور امیر فیصل کے والد اس عظیم منصب کے لیے منتخب ہوئے تو انہیں ملک کے خارجی امور کی نگرانی کے لیے نامزد کیا گیا، انھوں نے عیش کوشی اور سہل انگاری کے بجائے وہ

راہیں اپنائیں جو دشوار گذار تھیں، اور جن کے لیے بڑی جد و جہد درکار تھی، انہوں نے اپنی بیدار مغزی، مومنانہ فراست اور راست بازی سے ملک کو جلدی ہی اس قابل بنا دیا کہ اس کا شمار دنیا کے اہم ملکوں میں ہونے لگا، دولت کے صحیح مصرف کی دریافت کا سہرا بھی ان ہی کے سر ہے۔

پاس پڑوس کے ملکوں سے تعلقات قائم کرنے میں انہوں نے بڑی جاں فشانی سے کام لیا، ملک کے لیے ان کی خدمات رائیگاں نہیں گئیں، انہیں قبولیت عام حاصل ہوئی اور وہ سعودی عرب میں ہر آنکھ کا تارہ بن گئے، یہی وجہ ہے کہ جب ان کے بڑے بھائی برسر اقتدار آئے تو عوامی سطح پر وہ اعتماد حاصل نہ کر سکے جو ملک کو کنٹرول کرنے کے لیے ضروری ہے، ہر طرف سے امیر فیصل کو شاہ بنانے کا مطالبہ شروع ہو گیا، وقت کے تقاضے رد نہ ہو سکے، اور فیصل نے اپنے سوتیلے بھائی کو اقتدار سے الگ کر دیا، بعد کے دنوں نے خود بتلا دیا کہ شاہ فیصل کا اقتدار عالم اسلام کے لیے کتنی اہمیت اور دور رس نتائج کا حامل تھا۔

شاہ فیصل ایک شہنشاہ ضرور تھے مگر ان میں شہنشاہیت نام کو نہ تھی سادہ طرز کی زندگی، مومنانہ کردار اور اخلاق، عدل و انصاف کا نمونہ، ایسے شہنشاہ مسلمانوں کو خال ہی خال ملے ہیں، ان کی سادگی ہی ان کے ہر دل عزیزی کا راز تھی وہ کم گو تھے مگر معاملہ فہم تھے وقت کی نبضوں پر ان کی گرفت انتہائی مضبوط تھی، ۱۹۷۳ء کی جنگ کے بعد انہوں نے جو کردار ادا کیا اسے شاید عرب کبھی نہ بھول سکیں، انہوں نے عربوں کو طاقت کے اصل سر چشمے سے روشناس کرایا، اگر شاہ فیصل کا تدبر نہ ہوتا تو نہ جانے مغربی ملکوں کو تیل سپلائی نہ کرنے کے فیصلے کے لیے عربوں کو کتنی بار سوچنا پڑتا، وہ صرف عربوں کے سربراہ نہ تھے، صدر ناصر کی طرح وہ ''العروبۃ'' کے دائرے میں محصور نہ تھے، انہیں سب سے زیادہ اسلام کی سربلندی عزیز تھی، یورپ اور افریقہ میں اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

لیے کوشش کر رہے تھے، اس کے لیے انہوں نے اپنے ملک کی دولت وقف کردی تھی ان برّ اعظموں کے ایسے ایسے شہروں میں انہوں نے اسلام کا پیغام پہنچایا، اسلامی مراکز، مساجد اور مدارس قائم کیے جہاں کے لوگ اس کے نام سے بھی اجنبی تھے مسلمان برسوں یاد کریں گے شاہ فیصل کو، وہ ابدی نیند سو رہے ہیں، لوگ کہتے ہیں وہ مر چکے ہیں، اس دنیا سے ان کی زندگی کی کڑیاں ہمیشہ کے لیے ٹوٹ چکی ہیں، مگر کروڑوں دلوں میں وہ اب بھی زندہ ہیں یوں دنیا میں کوئی شخص بھی ہمیشہ کے لیے نہیں آیا، باقی رہنے والی ذات تو صرف اللہ کی ہے۔

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

بے باک صحافی، مصنف اور شاعر

حضرت مولانا عامر عثمانی دیوبندیؒ

۱۲/ اپریل ۱۹۷۵ء کو مولانا عامر عثمانی پونہ میں وفات پا گئے وہ جس حالت میں یہاں سے رخصت ہوئے تھے اس کے پیش نظر یہ کہنا بہت مشکل تھا کہ وہ جان کی سلامتی کے ساتھ واپس آسکیں گے صرف پندرہ دن پہلے وہ دل کے زبردست دورے میں مبتلا ہوئے تھے، انہی دنوں انہیں بمبئی اور پونہ وغیرہ کے ایشائی مشاعرے میں شرکت کی دعوت ملی، ان کی خواہش تھی کہ وہ مشاعرے میں شریک ہوں، یار دوستوں نے سمجھایا عزیزوں نے منت سماجت کی، اپنوں غیروں نے سر پٹخا، ڈاکٹروں نے منع کیا مگر انہوں نے ایک نہ سنی، مجبور ہو کر دوستوں اور عزیزوں نے اللہ کے حوالے کیا۔

راستے بھر اطمینان سے رہے، قرآن پاک کی تلاوت کرتے رہے، بمبئی اترے تو چاق و چوبند تھے، وہاں کا مشاعرہ پڑھا، گھر والوں کو اپنی خیرت کا تار ارسال کیا، مشاعرے کے بعد اپنی اہلیہ کو ایک طویل خط لکھا، وہ اپنی صحت اور مشاعرے کی تکان کے باعث پونہ کے مشاعرے میں شرکت کا ارادہ ملتوی کر چکے تھے، مگر قدرت کو کچھ اور منظور تھا، منتظمین کے اصرار پر بالآخر پونہ چلے گئے، وہاں مشاعرہ پڑھا، مائک سے علیحدہ ہی ہوئے تھے کہ دل کا دورہ پڑا، اسپتال تک بھاگ دوڑ کی گئی مگر وقت موعود آ چکا تھا عامر عثمانی اپنے حقیقی رب سے جا ملے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

وہ دیوبند کی ادبی اور علمی محفلوں کی جان اور روح رواں تھے، یہاں کہ رونقیں ان ہی کی ذات سے وابستہ تھیں، وہ اوجھل ہوگئے تو محفلیں اجڑ گئیں، ہنگامے خاموش ہوگئے وہ آواز ڈوب گئی جو یہاں ابھرتی تھی، اور کشمیر سے لے کر راس کماری تک ہر علاقے میں، ہر جگہ اور ہر شہر میں سنی جاتی تھی، ہزاروں لوگ اس آواز کے بے چینی کے ساتھ منتظر رہتے، سیکڑوں دلوں کو چھو کر گذرتی اور ان گنت دماغوں کو جھنجھوڑ کر آگے بڑھ جاتی۔

میری زندگی کے بیس برس انہی گلیوں میں بھاگتے دوڑتے گذرے ہیں جن گلیوں میں عامؔر مرحوم کے باون برس گذرے میں نے شعور کی آنکھ کھولی تو دیوبند میں شعر وادب کا مذاق اپنے عروج پر تھا، آئے دن شعری نشستیں ہوتیں، ان چھوٹے چھوٹے مشاعروں میں علامہ انور صابری، مولانا عبدالواحد آباد مرحوم، محزوں نیازیؒ اور نشاط بھائی کے علاوہ عامر صاحب کے بھی نغمے گونجا کرتے تھے، میں نے عامر صاحب کو انہی محفلوں میں سنا، اس زمانے میں مجھے ان کے کلام میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوئی، ایک ایسے بچے کو جس کی تمام تر دلچسپی آواز کے زیر و بم اور ترنم کی آہٹوں تک محدود ہو عامر صاحب کا کلام کیسے پسند آسکتا تھا، جس میں شعریت بھی تھی، عالمانہ رنگ بھی، متانت و بردباری بھی، زبان وادب کی چاشنی بھی، اس زمانہ میں میرے نزدیک عامر صاحب کا شمار ان شعراء میں تھا جو بور کرتے ہیں، اس لیے یار دوستوں کی محفلوں میں جب انہیں بلانے کی بات چھڑتی تو میں منھ بنالیا کرتا، مگر بڑا ہوا، اور ادھر ادھر کا مطالعہ کیا تو عامر صاحب کی شخصیت ہی کچھ ایسی محسوس ہوئی جس کے شعر سمجھنے اور سننے کے قابل تھے، بڑے شوق سے ان کے اشعار سننے لگا، خاص طور پر ان کی نظمیں، اور قطعات بہت پسند آتے، تجلی میں ان کا کلام شائع ہوتا تو میں بڑے شوق سے اسے پڑھتا۔

اسی زمانہ میں تجلی بھی پڑھنا شروع کیا، میں نے جس ماحول میں تعلیم پائی

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

وہاں تجلی جیسے ''گستاخ'' اور ''دریدہ دہن'' پرچوں کی کھپت نہ تھی بچوں کو اور نوعمر لڑکوں کو اس کے مطالعے سے منع کیا جاتا، گھریلو حالات کی وجہ سے مجھ پر اس طرح کی کوئی پابندی نہیں تھی، تجلی سے دلچسپی کا آغاز اس کے مستقل کالم ''مسجد سے میخانے تک'' کی وجہ سے ہوا مگر جلد ہی آغازِ سخن، تجلی کی ڈاک، کھرے کھوٹے وغیرہ عنوانوں پر نظر پڑنے لگی، اسی زمانے میں وہ مسلم شریف کی شرح بھی لکھ رہے تھے، اسے بھی پڑھا۔

وہ ایک عالم بھی تھے، مفتی بھی، ناقد بھی، ادیب بھی، شاعر بھی، طنز و مزاح نگار بھی اور صحافی بھی، ہر پہلو سے اور ہر حیثیت سے وہ مکمل اور ممتاز تھے، منفرد اسلوب رکھتے، شگفتہ نثر لکھتے، لکھنے پر خوب قادر تھے، رواں دواں لکھتے رہتے، گھنٹوں تک لکھتے رہتے دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوکر، بے نیاز ہوکر مگر تھکتے نہ تھے، علمی مسائل پر جچے تلے انداز میں گفتگو کرتے، تجزیہ و تحلیل میں ان کا ایک خاص رنگ تھا، ایک ایک پہلو روشن اور واضح کرتے، فقہی مسائل پر بھی اتنے سہل اور دل چسپ انداز سے لکھتے کہ ایک عامی بھی سمجھ لیتا، بے لاگ تنقید کرتے، کھرے کھوٹے میں امتیاز کرتے، صحیح کو غلط سے اور غلط کو صحیح سے الگ کرکے پیش کرنے کا ڈھنگ انہیں خوب آتا تھا، زبان وادب کی باریکیوں پر بھی بڑا عبور تھا، کتابوں پر ہی کیا موقوف ہے وہ ہر مسئلے میں یہی موقف رکھتے تھے ملی مسائل پر، ملکی معاملات پر عملی نظریات پر تنقید کرنے کا یہی رنگ تھا، لوگ ان کی گرفت سے گھبراتے تھے، اسی وجہ سے وہ بدنام بھی بہت ہوئے اور دنیائے علم میں خاص طور پر بازاری قلم کار کہے گئے، مگر غور سے دیکھئے تو ان کی تحریر میں شوخی اور ظرافت تو بہت تھی مگر بھونڈا پن نہ تھا بہت تیز، تند اور تلخ لکھتے، مگر سطر سطر میں خلوص کی چاشنی بھی موجود ہوتی، اور حق پسندی اور اس سے بڑھ کر حق کے اظہار کا جذبہ بھی، اگر کوئی بات ان کے قلم سے غلط نکل جاتی تو یہ عادت بالکل نہ تھی کہ اس پر بہ ضد رہیں ان گنت موقعوں پر انہوں نے اپنے خیالات سے رجوع کیا ہے، ابھی آخری شمارے

میں انھوں نے اپنی ایک غلطی کا اعتراف کیا ہے۔

وہ ایک ممتاز دایب وشاعر ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین طنز ومزاح نگار بھی تھے، بہت کم لوگ واقف ہوں گے کہ انھوں نے اپنی ابتدائی زندگی میں ناول بھی لکھے ہیں، ادبی انداز میں انھوں نے برسوں تک جو کچھ لکھا وہ اسی ریاضت اور مشق کا نتیجہ تھا، عام ملکی اور ملی مسائل پر ان کے جو مضامین ''آغاز سخن'' کے عنوان سے چوتھائی صدی تک تجلی میں چھپتے رہے، وہ ان کی صحافتی ژرف نگاہی، بصیرت اور دقت نظری پر دلالت کرتے ہیں، ان کے مرنے سے ایک ایسا ادیب شاعر، ناقد، مزاح نگار اور صحافی بھی مرگیا ہے جس کے رشحات قلم میں سادگی تھی، بے تکلفی تھی جس کی تحریروں میں تبسم کا اجالا بھی ہوتا تھا، قہقہوں کا شور بھی، آہوں کی آہٹ بھی اور آنسوؤں کی کسک بھی، شوخی کا رنگ بھی اور دل کشی کی ترنگ بھی۔

انھوں نے دیوبند کا نام روشن کیا، وہ یہاں کے ایک ممتاز خاندان کے چشم و چراغ تھے، دیوبند کو ان جیسا قلم کار عا لمشکل سے ملے گا، انھوں نے یہاں کے مشہور علمی مرکز اور دینی درسگاہ ''دارالعلوم'' میں تعلیم پائی، حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے شاگرد تھے طالب علمی کے زمانہ میں بہت کم پڑھا، بعد میں ذاتی مطالعے سے استعداد پختہ کی لکھنے کا شوق خاندان سے وراثت میں ملا اور زندگی کے آخری لمحوں تک اس شوق کو انھوں نے گلے سے لگائے رکھا۔

دارالعلوم دیوبند کے اکابرین کے ساتھ ان کو کچھ اختلاف تھا، وہ اگرچہ جماعتِ اسلامی سے باقاعدہ وابستہ نہ تھے، مگر اس جماعت کی حمایت تائید اور دفاع ان کی زندگی کا مشغلہ بن گئی تھی، دیوبند سے اس فکر واختلاف کے باوجود یہاں کے بڑے چھوٹوں سے ان کو بڑا لگاؤ بھی تھا، اس مسلک کے عاشق تھے اور زندگی بھر اس کا دفاع کرتے رہے بریلویوں سے لڑتے رہے، ہزاروں صفحات ان کی تردید میں لکھ ڈالے غیر مقلدوں

کے ساتھ دست وگریباں رہے اور سیکڑوں مسائل میں ان کے ساتھ کھل کر بحث کی، ابھی طلاق ثلاثہ کے مسئلہ پر انہوں نے بڑے عالمانہ انداز میں لکھا تھا اور ایک ضخیم نمبر نکال کر اپنی علمی بصیرت اور فقہی آگہی کا ثبوت فراہم کیا تھا، مقابلے پر جماعت اسلامی کے افراد تھے، دیو بند کے علما بھی تھے، اور غیر مقلد حضرات بھی، مگر انہوں نے کسی کی پرواہ نہ کی، لکھا ڈٹ کر لکھا، دن رات ایک کر کے لکھا، ایک ایک بات کے لیے حوالے پیش کیے۔

علمی محاذ پر اس دفاع کے علاوہ بھی وہ اپنی نجی زندگی میں یہاں کے بزرگوں سے ملتے جلتے رہتے، دارالعلوم کے اساتذہ، طلبہ اور دوسرے متبسین اور متعلقین سے ان کے بہت ہی مخلصانہ روابط تھے۔

اخیر عمر میں انہوں نے قادیانیت کے خلاف لکھنے کا ارادہ کیا تھا، اس باطل فرقے کے خلاف انہوں نے پہلے بھی بہت کچھ لکھا ہے مگر اب پاکستان میں اس کی جو درگت بنی ہے اس سے بوکھلا کر ان کا رخ ہندوستان کی طرف ہو گیا ہے، عامر صاحب کا عزم تھا کہ وہ اس فرقے کو یہاں چین کی سانس نہ لینے دیں گے، مولانا محمد عثمان فارقلیط جیسے دانشوروں کی ہفوات کا انتہائی دقیع اور سنجیدہ جواب لکھا خود فارقلیط صاحب نے بھی اعتراف کیا، اور مولانا محمد منظور نعمانی نے بھی سراہا، قادیانی لٹریچر کا مطالعہ کر رہے تھے اور ایک ایک کر کے تمام کتابوں کا جواب لکھنے میں مشغول تھے کہ موت نے آلیا، دیو بند میں وہ ابھی جب بیمار پڑے تھے تو بے ہوشی کے عالم میں بھی ان کی زبان پر یہی ایمان افروز جملہ تھا ''قادیانیوں کو چین سے نہیں بیٹھنے دوں گا''۔

اس میں شک نہیں کہ انہوں نے اپنے ''تجلی'' کا چراغ انتہائی تاریکیوں ہی میں نہیں سخت آندھیوں میں بھی جلائے رکھا، خلافت وملوکیت نمبر کی تیاری میں مشغول تھے تو صرف دو ڈھائی گھنٹے آرام کیا کرتے تھے، لگن تھی، ایک جذبہ تھا کام کرنے کا

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

اتنی محنت اور زبردست قوت مطالعہ کی مثالیں نادر نہیں تو کم یاب ضرور ہیں۔

وہ غریبوں کے ہمدرد بھی تھے اور خلیق اور شفیق انسان بھی، قصبے کے انتہائی مفلوک الحال اور میلے کچیلے لوگوں کے گلے میں باہیں ڈال کر بے تکلف چل پھر لیتے تھے، نجی زندگی میں انتہائی سادہ اور بے ضرر انسان، کسی کو تکلیف نہیں دی، کسی کو ضرر نہیں پہنچایا، کسی کا دل نہیں دکھایا اور یہ بات تو ان کے مرنے کے بعد کھُلی کہ وہ بہت سے گھروں کی کفالت بھی کرتے تھے، بہت سے لوگوں کو قرض دیا، واپس لینا تو درکنار مانگا تک نہیں۔

آخر عمر میں سب لوگوں کے قرض معاف کردیئے، اپنی اپنی پائی پائی چکائی اور ہدایت کردی کہ جو بھی قرض کا دعویٰ کرے، کسی جرح کے بغیر ادا کردو۔

بیماری سے چند روز پہلے ہی ان کے گھر گیا دیر تک گفتگو رہی اس ملاقات کے دوران دارالعلوم کے ساتھ ان کے لگاؤ اور تعلق کا بھی اندازہ ہوا، دیر تک بیٹھا رہا، اگر پتہ ہوتا کہ یہ صحبت اب کبھی نصیب نہ ہوگی تو کچھ دیر اور بیٹھ جاتا اور اتنا بیٹھتا کہ عامر صاحب خود ہی اکتا کر کہہ دیتے کہ ”اچھا بھائی، اب جاؤ پھر آنا“ اب صرف ان کی یادیں باقی رہ گئی ہیں۔

اللہ انہیں آخرت کی نعمتوں سے نوازے۔

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

ایک مؤرخ، ایک عالم، ایک قائد

حضرت مولانا محمد میاں دیوبندیؒ

دیوبند کا نام آتا ہے تو بزرگوں کی وہ پوری نسل چشمِ تصور میں نمایاں ہوجاتی ہے جو دس، بیس پچاس برس نہیں؛ بل کہ پوری ایک صدی پر پھیلی ہوئی ہے، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ سے لے کر حضرت شیخ الہندؒ اوران کے باکمال وممتاز تلامذہ تک قد آور شخصیتوں کا ایک ہجوم ہے، بے شمار اوران گنت لوگ ہیں جنھیں کردار کی عظمت کے ساتھ ساتھ فکروفن کی عظمت بھی حاصل رہی ہے، ان کے ظاہر کی بلندی اور باطن کے اجلے پن سے نگاہیں خیرہ ہوکر رہ جاتی ہیں، میں نے نہ ان بزرگوں کو دیکھا ہے اور نہ ان کا زمانہ پایا ہے، شعور بل کہ وجود سے بہت پہلے یہ لوگ اپنے سفر کا بگل بجاچکے تھے، ان میں سے جو دو چار لوگ باقی رہ گئے تھے، وہ بھی شعور کی دہلیز تک پہنچتے پہنچتے رخصت ہوگئے، راستے کے نقوش پا اور دور تک اڑتے ہوئے غبار راہ نے بتلایا کہ ادھر سے ایک پورا عہد اور ایک پوری تاریخ گذر گئی ہے، یہ لوگ گذرے تو شاگردوں کے شاگردوں نے جگہ لی، اور اپنے اپنے اساتذہ کی عظمتوں کے امین قرار پائے، حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیریؒ کے تلامذہ رہ گئے تھے، جو نہ صرف اپنے استاذ کی علمی جلالت کا مظہر تھے؛ بل کہ ان میں پچھلوں کے کردار کا جمال اور ان کے علم کی سطوت اور روحانیت کا دبدبہ صاف دکھائی پڑتا تھا۔

مولانا محمد میاں صاحب جنھوں نے اکتوبر ۱۹۷۵ء کی بائیس تاریخ کو دہلی میں وفات پائی اسی دوسری نسل کے ممتاز فرد تھے، یہ حادثہ بجائے خود بڑا اضطراب انگیز اور انتہائی افسوس ناک ہے، اوراب اس احساس کی حدت بھی جھلسائے دے رہی ہے کہ وہ نسل بھی پا بہ رکاب ہے جو نئ اور پرانی نسلوں کے لیے نقطۂ اتصال رہی ہے اور جس نے اپنے سے پہلوں کی سونپی ہوئی علم وعمل کی امانت کو دیانت کے پورے مفہوم اور اس لفظ کے صحیح تقاضوں کے ساتھ ہم تک پہنچانے کی کوشش کی ہے، نئ نسل اس اعتبار سے یقیناً بدقسمت ہے کہ اسے اپنی محرومیوں کے دن دیکھنے پڑ رہے ہیں، ایک ہی سال کے ادھر ادھر مولانا محمد ادریسؒ کاندھلوی نے وفات پائی، مولانا ظفر احمد تھانویؒ رخصت ہوئے، اوراب ایک نام کا اور اضافہ ہوگیا خدا برے دنوں سے بچائے، نہیں کہا جاسکتا کہ آنے والی صبح کیا ہونے والا ہے، موت ایک اٹل حقیت ہےاس سے فرار نہ پہلے ممکن تھا اور نہ اب ممکن ہے، آدمی کا وجود خود اس کی موت کی علامت ہے، اس دن سے ڈر لگتا ہے جب نئ نسل اپنے بزرگوں کی شفقتوں کے لیے ترسا کرے گی حقیقت یہ ہے کہ مولانا محمد میاں صاحب کی وفات نے مجھ جیسے لوگوں کو ایک اذیت ناک خلش، اور ایک اضطراب انگیز الجھن میں مبتلا کردیا ہے، جن کا کل سرمایہ ان ہی بزرگوں کا وجود ہے۔ وہ دن بڑا بھیانک، اور دیوبند کی تاریخ کا خاص طور سے الم ناک باب ہوگا جب ان میں سے ایک بھی باقی نہیں رہے گا، جو ابھی ہم میں موجود ہیں اور جن کے تنفس کی تمازت، اور علم وعمل کے اجلے پن سے ماحول کو گرمی اور پاکیزگی حاصل ہے۔

مولانا محمد میاں ۱۹۰۳ء میں پیدا ہوئے، ان کا تعلق اس سرزمین سے ہے جسے لوگ دیوبند کہتے ہیں، یہ اگرچہ مختصر آبادی پر مشتمل ایک قدیم بستی ہے اور اس کی خاک ہر دور میں مردم خیز رہی ہے، اس کے سینے میں آج بھی ان قدسی صفت انسانوں کی آرام گاہیں ہیں، جنھوں نے مسلمانوں کے دور حکمرانی میں یہاں آکر ایمان ویقین

کے چراغ روشن کیے تھے، اور علم وعمل کے نور سے ماحول کو روشنی عطا کی تھی، ان میں شیخ ابوالوفاء عثمانی اور سید محمد ابراہیم کے نام بڑے اہم ہیں، یہ دونوں بزرگ اپنی جدوجہد، اصلاح ودعوت کے عظیم کام اور اس کے عظیم تر نتائج سے قطع نظر اس لیے بھی دیوبند کی تاریخ کے اہم نشان ہیں کہ ان کے بعد ان کی اولاد نے اپنے بزرگوں کے نقش قدم کو مشغل راہ بنایا ہے، عثمانی خانوادے کے جد امجد شیخ ابوالوفاء عثمانیؒ ہیں ان کی اولاد میں مولانا رفیع الدینؒ (م ۱۸۹۰ء) ملا محمودؒ (م ۱۸۸۶ء) مولانا ذوالفقار علیؒ (م ۱۸۵۱ء) مولانا فضل الرحمٰن عثمانیؒ (م ۱۸۸۳ء) مولانا مناظر حسنؒ (م ۱۹۲۳ء) شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ (م ۱۹۲۰ء) حبیب وحشیؒ (م ۱۹۲۵ء) مولانا مفتی عزیز الرحمٰنؒ (م ۱۹۲۸ء) مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ (م ۱۹۱۲۹ء) مولانا شبیر احمد عثمانیؒ (م ۱۹۴۹ء) مولانا یعقوب الرحمٰن عثمانیؒ (م ۱۹۵۲ء) مولانا ظفر احمد تھانویؒ (م ۱۹۷۵ء) مولانا عامر عثمانیؒ (م ۱۹۷۷ء) کے نام ایسے نہیں ہیں جنھیں تاریخ نظر انداز کر کے آگے بڑھ جائے، آج بھی ہندوستان میں مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی اور پاکستان میں مولانا مفتی محمد شفیع صاحب اسی خاندان کی علمی یادگاریں ہیں۔ (۱)

سید محمد ابراہیم (۱۶۲۴ء) گیارہویں صدی ہجری کے اوائل میں بعض اہل دل اور صاحب نظر بزرگوں کی تحریک پر، ان کے اشارے یا حکم پر دعوت واصلاح کے ارادے سے دیوبند تشریف لائے اور زندگی بھر اپنے اس مشن کی تکمیل میں مصروف رہے، وہ مسجد جس میں ان کا مدرسہ تھا اور وہ خانقاہ جو دعوت وتبلیغ کا اور اصلاح نفوس کا مرکز بنی ہوئی تھی آج بھی موجود ہے، خود سید ابراہیم کا مزار بھی مسجد کے شمال میں واقع ہے، اس خاندان کے حالات کا بڑا حصہ ۵۷ء کی خوف ناک شکست وریخت کی نذر ہو گیا آخری دور میں جو چند باکمال لوگ پیدا ہوئے ان میں حاجی سید عابد حسینؒ (م ۱۹۱۲ء)

(۱) افسوس اب یہ دونوں بھی رخصت ہو چکے ہیں اوّل الذکر نے ۱۹۸۴ء میں اور ثانی الذکر نے ۱۹۷۶ء میں وفات پائی۔

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

کا نام سب سے پہلے ہے، دارالعلوم دیوبند کی تاسیس میں شریک رہے، اس کے پہلے مہتمم بھی بنے، جامع مسجد دیوبند کی تعمیر بھی آپ کی ہی کی مساعی کا نتیجہ ہے۔ درویشی خو تھی، اس کے آثار بعد تک باقی رہے، اس شان سے زندگی بسر کی کہ اٹھائیس سال تک با جماعت نماز کا اتنا غیر معمولی اہتمام رہا کہ کبھی تکبیر اولیٰ فوت نہیں ہوئی اٹھائیس سال کے بعد ایک صبح پہلی تکبیر رہ گئ باقی پوری زندگی اس کا افسوس رہا۔

حاجی سید محمد انور (م۱۸۹۴ء) منشی فضل حق (م۱۸۹۳ء) حکیم سید جعفر حسین (م۱۸۹۷ء) حاجی سید آل حسن وغیرہ وغیرہ اسی خاندان سادات کے اہم افراد ہیں مولانا محمد میاں کا نسبی رشتہ اسی سلسلے سے تھا۔ ہندوستان میں سادات رضویہ کے سلسلے خیرآباد، لکھنؤ، زید پور، امروہہ وغیرہ میں ہیں، سرسید مرحوم بھی اسی خاندان سے تھے ایک نام پر پہنچ کر دیوبند، اور سرسید مرحوم کے نسبی سلسلے ایک ہوجاتے ہیں، مولانا محمد میاں کے بعد دیوبند میں اس خاندان کی علمی نشانی کے طور پر مولانا سید محبوب رضوی رہ گئے ہیں(۲) جو تاریخ پر اپنی وسیع نظر، اور لکھنے میں تحقیقی مزاج کی بنا پر علمی حلقوں میں متعارف ہیں۔

میری خوش نصیبی ہے کہ مجھے دیوبند سے نہ صرف فکری اور علمی نسبت حاصل ہے؛ بل کہ جسمانی اتصال بھی ہے، یہیں پیدا ہوا، شعور اور لاشعور کے بیس بائیس برسوں کی طویل یا مختصر شاہ راہ یہیں طے کی، مسلمانوں کے دینی اور فکری مرکز سے اس قدر قربت اور اتنے تعلق کے علاوہ جو سعادت مجھے نصیب رہی وہ یہ تھی کہ اس دوسری نسل کے بہت سے افراد کو قریب سے دیکھنے، ان کی مجلسوں میں بیٹھنے اٹھنے اور ان سے استفادہ کرنے کے مواقع بار بار ملے ہیں، مولانا محمد میاں کو بھی دیوبند ہی میں دیکھا اور میں ان کی سادگی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا، وہ دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے رکن

(۲) سید محبوب رضوی مصنف دارالعلوم دیوبند بھی ۱۹۷۹ء میں رخصت ہوگئے۔

تھے، اس تعلق سے وہ سال میں کم از کم چار بار دیوبند ضرور آتے، سب سے پہلے تشریف لاتے اور مجلس کی تمام کارروائیوں میں شرکت کے بعد واپس ہوتے، یہ دارالعلوم سے ان کے تعلق خاطر کی بات تھی، ان کا مزاج مجلس کے دوسرے ممبران سے ذرا مختلف تھا، وہ بہت کم کھلتے ملتے دیکھے گئے، کئی بار ایسا ہوا کہ دارالعلوم کے بعض تعلیمی وانتظامی نوعیت کے مسائل میں طلبہ کے وفود ان سے ملے، میں بھی ان میں شریک رہا، مگر انھوں نے پذیرائی نہیں کی، شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ وہ طلبہ کی انتظامی معاملات میں مداخلت کو ناپسند کرتے ہوں۔

مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میرے کانوں میں مولانا کا نام کب پڑا، اتنا مجھے یاد ہے کہ میں نے مولوی اسماعیل میرٹھی کے اردو نصاب اور دینی تعلیم کے رسالوں سے اردو لکھنے پڑھنے کی ابتدا کی، مگر یہ تو بعد کو معلوم ہوا کہ دینی تعلیم کے جو دس بارہ رسالے ہیں ان میں سے بیشتر مولانا محمد میاں کے قلم کا عمل ہیں، اس سلسلے میں کہ یہ رسالے نوآموز یا بالکل مبتدی طلباء کے لیے کہاں تک اور کس حد تک مفید ہیں، اور یہ کہ ان رسالوں کی ترتیب میں بچوں کی نفسیات اوران کے ننھے منے ذہنوں کو پیش نظر رکھا گیا ہے، یا نہیں، میری رائے اور میرا تجربہ بالکل دوسرا ہے، مگر یہ رسالے اسلامی عقائد ضرورت بھر کے فقہی مسائل اور سیرت مقدسہ کے بعض اہم پہلوؤں کا جس خوبصورتی سے احاطہ کئے ہوئے ہیں اس کی تعریف نہ کرنا غلط ہے، مولانا کو بنیادی طور پر جس چیز سے لگاؤ تھا، وہ قلم ہے اور لکھنے کے لیے بھی انھوں نے تاریخ کے موضوع کو منتخب کیا جس کے لیے فنی بصیرت، مشاہدے کی گہرائی، اور واقعات کے انتشار سے مسلسل کہانی جنم دینے کے فن سے واقفیت کی کچھ زیادہ ہی ضرورت ہے، اس موضوع پر انھوں نے محنت کی ہے، یہی وجہ ہے کہ جو بصیرت ان کی تاریخی کتابوں میں نمایاں ہے وہ دوسرے موضوعات پر ان کی تحریروں میں کم ہے یا بہت زیادہ واضح نہیں ہے، علما ہند کی

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

سیاسی تاریخ پر اپنے کام کے لیے وہ دینی اور علمی حلقوں کی طرف سے شکریے کے مستحق ہیں، بہت ممکن تھا کہ کسی وقت محض غفلت یا حالات کے دباؤ کی وجہ سے تاریخ کا یہ باب یہاں کے اس ذہن کی نذر ہو جاتا، جو ایسی معلوم حقیقتوں کو جھٹلانے میں کوئی عار، کوئی شرم اور کوئی خوف محسوس نہیں کرتا۔

ہندوستان میں اسلامی نشأۃ ثانیہ کے لیے حضرت شاہ ولی اللہ کی جدوجہد، اس جدوجہد کی اہمیت اور اس کے دوررس اثرات کا انکار نہیں کیا جا سکتا، مدرسہ رحیمیہ نے جو دہلی کی اکبری مسجد میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے والد بزرگوار حضرت شاہ عبدالرحیم دہلویؒ نے اس دور کے مروج دینی نصاب کی تدریس کے لیے قائم کیا تھا اگلی صدی کی دینی تجدید اور اسلامی فکر کے احیا کے لیے مرکز کی حیثیت اختیار کر لی تھی، شاہ ولی اللہ کے عہد میں اس مدرسے سے جو نسل تیار ہوئی اس میں شاہ صاحب کے چاروں جلیل القدر صاحبزادوں کے علاوہ بہت سے اہم نام ہیں، بعد میں یہ سلسلہ دراز ہوا۔ حضرت سید احمد شہید کی تحریک حریت، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی، مولانا فضل حق خیرآبادی کا کارنامہ اور مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی کی خدمات دارالعلوم کی تاسیس، شاملی کے میدان کا جہاد اور ریشمی رومال کی تحریک یہ سب اسی مکتب فکر کے شاخسانے ہیں۔ مولانا محمد میاں کی کتابیں ''علمائے ہند کا شاندار ماضی'' اور ''علمائے حق'' ۵۷ء سے پہلے اور بعد کے ان واقعات کی تاریخی نوعیت، علما کی رہنمائی، اور ان کی جدوجہد کے تسلسل کے لیے ماخذ بننے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔

دینی موضوعات پر لکھی ہوئی ان کی کتابیں بھی بڑی وقیع سمجھی جاتی ہیں، اور ہندوستان کے عام دینی حلقوں میں مقبولیت بھی رکھتی ہیں، ابھی آخری دور میں سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر ان کے قلم سے جو کتاب نکلی ہے، اسے اسلامی لائبریری میں مفید اضافہ کہنا بجا ہوگا، مولانا کے یہاں علمی بحثوں میں بھی سمندر کے

سکون اور ٹھہراؤ کے بجائے آبشار کا مسلسل شور ملتا ہے، لہجے میں دھیمے پن کے بجائے وہ الفاظ کی شوکت پر نظر رکھتے تھے، اور ایسا اسلوب اختیار کرتے تھے جس میں خطیبوں کا سا زور بیان نمایاں ہو، وہ علما کے محدود حلقے میں بہت اچھا لکھنے والے تھے، انھوں نے جتنا کچھ لکھا ہے، جس قدر مدت تک لکھا ہے، جس جگر کاوی اور نظر سوزی کے ساتھ لکھا ہے اس کی نظیریں کم نہیں تو زیادہ بھی نہیں ہیں۔

انھیں قلم عزیز تھا، ابھی زیادہ دیر نہیں گذری کہ انھوں نے تحریک شیخ الہند پر ایک جلد مرتب کی تھی، دوسری جلد کی تالیف مشغول تھے کہ مہلتِ نفس نہ ملی اور یہ کام نامکمل رہ گیا۔

مولانا سیاسی مزاج رکھتے تھے، نظریاتی طور پر وہ اس گروہ میں شامل تھے جو تقسیم ہند اور فرقہ وارانہ بنیادوں پر سیاسی خیالات کی تشکیل کا ناقد رہا ہے، حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ اور حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیہوارویؒ کا دست و بازو بن کر جمعیۃ علما ہند اور نیشنل کانگریس میں کام کیا، سیاسی زندگی میں ان مرحلوں سے بھی گذرے ہیں جہاں استقامت کا امتحان لیا جاتا ہے، دارالعلوم سے نکلے تو مدرسوں کی دنیا آباد کی مدرسہ شاہی مراد آباد کے مہتمم اور غالباً وہاں کے شیخ الحدیث بھی رہے۔ یہ وہ وقت تھا جب مراد آباد کا یہ مدرسہ نیشنلسٹ مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد کا مرکز بنا ہوا تھا، مولانا نے گردوپیش کے ان ہنگاموں میں اپنے لیے کشش محسوس کی، اور اس جدوجہد میں جو وہ لوگ کر رہے تھے عملی شرکت کر کے اپنی دلچسپی کا اظہار بھی کر دیا، بعد میں جمعیۃ علما کے اہم عہدہ دار ہو کر دہلی منتقل ہو گئے۔

تنظیمی کاموں کے علاوہ مولانا نے جماعتی تاریخ کی تدوین و ترتیب کا کام بھی کیا۔ مجھے معلوم نہیں کہ جمعیۃ علما کے ذمہ دار مولانا کی کمی محسوس کریں گے یا نہیں مگر صحیح بات یہ ہے کہ وہ جمعیۃ کے افراد میں سب سے زیادہ تجربہ کار، سب سے زیادہ دور اندیش

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

اور غالباً سب سے زیادہ کام کرنے والے تھے۔

مولانا نے ایک عرصہ تک حدیث کا درس دیا ہے۔ ان کے درسی حلقوں میں بیٹھنے، یا بہ راہ راست ان سے استفادہ کرنے کا تو موقع نہیں ملا، مگر حضرت علامہ کشمیریؒ سے ان کے علمی انتساب کا مطلب اس کے علاوہ کچھ نہیں تھا کہ حدیث پر ان کی نظر وسیع تھی، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی خلافت وملوکیت کے جواب میں جو کتاب انھوں نے ''شواہد تقدس'' کے نام سے لکھی تھی اس میں تاریخ وحدیث کے بعض اہم مباحث ملتے ہیں، مگر کتاب کے مناظرانہ اسلوب نے کتاب کی قدر و قیمت پر اثر ڈالا ہے۔ مجھے مولانا سید ازہر شاہ قیصر کی زبانی پتہ چلا کہ وہ علامہ کشمیری کے ان افادات پر کام کر رہے تھے جو انھوں نے علامہ شوق نیموی کی ''آثار السنن'' پر اپنی نوعمری کے زمانے میں لکھے تھے۔ معلوم نہیں یہ کام کہاں تک پہنچا ہے۔

ایک بار پھر میں اس تأثر کا اظہار کرنا چاہتا ہوں کہ مولانا محمد میاں کی وفات سے بیچ کے سلسلے کی ایک کڑی غائب ہوگئ، اس نسل کا ایک فرد کم ہوگیا جو ایک صدی کی تاریخی عظمتیں سمیٹے ہوئے ہے اور جس نے پورے ایک عہد کی حفاظت کی ہے، سدا رہے نام اللہ کا۔

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

دارالعلوم دیوبند کے ترجمان مفتی اعظم پاکستان

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع عثمانیؒ

شوال کا مہینہ ہے، گیارہ تاریخ ہے، سال ۱۳۹۶ھ مطابق ۱۹۷۶ء ہے، جدید طلبہ دارالعلوم میں داخلہ کے لئے آ چکے ہیں، میں دیوبند کے رہنے والا ہوں، دارالعلوم ہی کے ایک کمرے میں فروکش ہوں، اچانک دارالعلوم دیوبند کی مسجد سے مائیک کا سوئچ آن کرنے کی آواز آئی، ایسے موقع پر دیوبند کے رہنے والوں کا دل دھک سے رہ جاتا ہے اور بے ساختہ زبان سے یہ جملہ نکلتا ہے خدا خیر کرے، اذان کے علاوہ اوقات میں جب لاؤڈ اسپیکر چالو کرنے کی آواز سنائی دیتی ہے کسی نہ کسی اہم شخصیت کے انتقال کی خبر دی جاتی ہے، وہی ہوا، مگر جو خبر سنی اس کی تو توقع بھی نہ تھی، نہ بیماری کی کوئی اطلاع تھی، نہ اب سے پہلے کچھ سنا تھا مگر قضا وقدر کے فیصلوں کے سامنے سب مجبور ہیں سب بے بس ہیں، اعلان کرنے والے نے گلوگیر لہجے میں اعلان کیا کہ رات پاکستان کے ممتاز عالم دین دارالعلوم دیوبند کے سابق مفتی اور استاذ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع عثمانی انتقال فرما گئے، إنّا للّٰہ وانا الیہ راجعون، میں گھبرا کر اپنے کمرے سے باہر نکلا، احاطہ مولسری میں بھیڑ جمع ہونے لگی، کچھ ہی لمحوں کے بعد نودرے میں گٹھلیوں کے کٹے آکر رکھے گئے، اساتذہ، طلبہ اور ملازمین نودرے میں اور ملحقہ کمروں میں بیٹھ گئے

کچھ لوگوں نے قرآن کریم کی تلاوت شروع کردی، کچھ آیت کریمہ اور کلمۂ طیبہ کے ورد میں مشغول ہوگئے، جب سب لوگ تلاوت، ذکر اور ورد سے فارغ ہوگئے حضرت مہتمم صاحب (مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ) حاضرین کے سامنے کھڑے ہوئے اور ارشاد فرمایا! ''مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع عثمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم دیوبند کے ممتاز علما وفضلا میں سے تھے، قوی الاستعداد اور استحضار علم کے ساتھ معروف، فقہ وادب میں خاص امتیاز رکھتے تھے، میرا اور ان کا تعلق بھائیوں جیسا تھا، اور تقریباً سارے ہی مبادیات تعلیم وتربیت میں ہم ساتھ ہی رہے درجۂ فارسی سے لے کر دورۂ حدیث اور کتب عالیہ وآلیہ میں رفاقت رہی تھی، حتیٰ کہ سیر وتفریح میں بھی رفاقت رہتی تھی، حج وغیرہ میں بھی اکٹھے شرکت ہوتی تھی، جب حضرت شیخ الہند اسارت مالٹا سے رہا ہوکر وطن واپس تشریف لائے تو ہم اکٹھے ہی ان سے بیعت ہوئے اور پھر ان کے وصال کے بعد احقر ہی کی معیت میں حضرت اقدس مولانا تھانوی کی طرف رجوع کیا، تقسیم ملک کے بعد جب آپ پاکستان تشریف لے گئے تو میں کسی مرنے والے کے لئے بھی اتنا کبھی نہیں رویا تھا جتنا آپ کے فراق پر رویا تھا، یہ حالت دیکھ کر سب گھر والے پریشان ہوگئے کہ آخر کیا حادثہ پیش آگیا جو اتنا گریہ طاری ہے،'' یہ فرما کر حضرت قاری صاحب قدرے ٹھہر گئے گویا گریہ ضبط کر رہے ہوں، ہماری آنکھوں میں بھی آنسو چھلک آئے۔

حضرت مفتی محمد شفیع عثمانیؒ کی ہم نے کبھی زیارت نہیں کی، ہمارے ہوش سنبھالنے سے پہلے بلکہ پیدائش سے پہلے ہی وہ پاکستان تشریف لے گئے تھے، لیکن ان کی اتنی کتابیں پڑھی تھیں، اور ان کا اس قدر نام پڑھا تھا کہ ان سے ایک خاص طرح کی انسیت اور عقیدت سی ہوگئی تھی، دل چاہتا تھا کہ وہ دارالعلوم میں تشریف لائیں، ہم طلبہ ان کی زیارت کریں، ان سے استفادہ کریں، سنا ہے ایک دفعہ تشریف بھی لائے تھے

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

مگر تب ہمیں شعور نہ تھا، دارالعلوم دیوبند کی کتنی بڑی بڑی شخصیتیں پاکستان جا کر بس گئی ہیں، تقسیم ملک نے جسم ہی جدا نہیں کئے علم بھی تقسیم کردیا ہے، مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تقسیم سے پہلے دارالعلوم دیوبند کا فیض لاہور، کراچی بلکہ صوبہ سرحد کے پشاور اور دوسرے قبائلی علاقوں تک جاری تھا، تقسیم کے بعد صورت حال بدل گئی اب اگر یہاں سے جیّد الاستعداد علما وہاں نہ جاتے تو دارالعلوم کا یہ فیض کیسے پھیلتا جواب پھیل رہا ہے، حضرت مفتی صاحب ہی کو لیجئے، انھوں نے پاکستان جا کر دارالعلوم کراچی قائم کیا، آج ان کا قائم کردہ دارالعلوم پاکستان میں دیوبند کا سب سے بڑا مدرسہ ہے، پھر نظام افتا کے قیام کا مسئلہ تھا، دارالعلوم دیوبند کو تو دوسرے مفتی مل گئے لیکن پاکستان میں مستند مفتیوں کی بڑی ضرورت تھی، حضرت مفتی صاحب کی ہجرت سے یہ ضرورت بھی پوری ہوئی ہے، خدا جو کرتا ہے بہتر ہی کرتا ہے، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے، بس اس کا افسوس ہے کہ ہمارے طلبہ کو اپنے بزرگوں کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں انتقال کا اعلان نشر ہونے کے بعد طلبہ خاص طور پر جدید طلبہ ایک دوسرے سے پوچھتے نظر آئے کون تھے مفتی شفیع دیوبندی؟ (۱) اللہ جزائے خیر دے حضرت مہتمم صاحب مدظلہ العالی کو، اور ان کو صحت وتن درستی کے ساتھ تادیر ہمارے سروں پر قائم دائم رکھے انھوں نے اپنی تعزیتی تقریر میں اُن کی شخصیت، ان کی خدمات پر، ان کے ذاتی اوصاف وکمالات پر بہت کچھ روشنی ڈال دی، اس طرح طلبہ کو حضرت مفتی صاحب علیہ الرحمۃ کو جاننے اور سمجھنے کا موقع مل گیا، دل چاہتا ہے کہ کچھ مفتی صاحب کے متعلق لکھوں، یہ مضمون اسی خواہش کی تکمیل کے لئے لکھا جارہا ہے۔

حضرت مفتی صاحب کا تعلق دیوبند کے ایک مشہور علمی گھرانے سے ہے، جس

(۱) یہ اس وقت کی بات ہے، جب مضمون لکھا جارہا تھا، آج صورت حال بدل چکی ہے، معارف القرآن کے حوالے سے حضرت مفتی محمد شفیع عثمانی دیوبندیؒ کو ہر طالب علم جانتا ہے۔

کا سلسلۂ نسب حضرت عثمان غنیؓ سے جا کر مل جاتا ہے، اگرچہ حضرت مفتی صاحب فرمایا کرتے تھے کہ مجھے اپنے خاندان کا کوئی مستند شجرہ یا نسب نامہ نہیں ملا لیکن خاندان کے بزرگوں سے سنا ہے کہ ہم عثمانی ہیں، والدہ ماجدہ سادات میں سے تھیں، والد ماجد حضرت مولانا محمد یٰسین صاحب دارالعلوم دیوبند میں فارسی کے استاذ تھے، اور خارج اوقات میں عربی کے اسباق بھی پڑھادیا کرتے تھے، جن مشاہیر نے حضرت مولانا یٰسین صاحب سے شرف تلمذ حاصل کیا ان میں حضرت سید میاں اصغر حسین، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی، حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری قابل ذکر ہیں، میرے دادا حضرت مولانا احمد حسن نے بھی ان سے فارسی پڑھی ہے، میرے دادا اکثر ان کا ذکر فرمایا کرتے تھے، حضرت مفتی شفیع صاحب کی پیدائش ۲۰ رشعبان ۱۳۱۴ھ مطابق ۱۸۹۷ء میں ہوئی، اس لحاظ سے انتقال کے وقت حضرت مفتی صاحب کی عمر شمسی حساب سے اناسی سال تھی، حضرت کے والد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے بیعت وارادت کا تعلق رکھتے تھے، اس تعلق کی بنا پر انھوں نے اپنے پیر و مرشد کو گھر میں بیٹے کی ولادت کی اطلاع دی، اُدھر سے خوشی اور مسرت کا اظہار ہوا اور فرمایا محمد شفیع نام رکھنا۔

دیوبند سے حضرت مفتی صاحب کو والہانہ تعلق تھا، ہجرت کے بعد ایک مرتبہ دیوبند تشریف لائے، واپس جا کر اپنا سفر نامہ لکھا ''نقوش وتأثرات'' بڑا دلچسپ رسالہ ہے، دیوبند کے متعلق لکھتے ہیں ''دیوبند کیا ہے، ایک چھوٹا سا قصبہ سہارن پور کا جس کو نہ جغرافیائی اور عمرانی حیثیت سے کوئی خاص شہرت حاصل ہے نہ تجارتی یا صنعتی اعتبار سے، ہاں اس خوش نصیب خطۂ زمین میں علوم اسلامیہ کا ایک عظیم دارالعلوم ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کو حسن قبول عطا فرمایا اور مرکز علوم بنادیا، اور اس سے پیدا ہونے والے رجال اس آخری صدی کے مجدد ہوئے اس طرح دیوبند اس دور انحطاط میں اسلام اور مسلمانوں کے لئے ایک پناہ گاہ بن گیا، احقر نے اسی مبارک سرزمین پر آنکھ کھولی، اسی

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

میں بچپن سے پچپن تک کے تمام ادوار طے کیے، میرا وطن کہنے کو تو دیوبند تھا لیکن در حقیقت اس کا بھی ایک گوشہ یعنی دارالعلوم تھا۔‘‘

دیوبند اور دارالعلوم دیوبند سے اس قدر محبت اور عشق کے باوجود حضرت مفتی صاحب کو پاکستان جانا پڑا، یہ ایک افسوس ناک حادثہ ہے لیکن اس کے نتائج نومولود مملکت اسلامیہ کے حق میں اچھے رہے ہیں، یہ اس واقعے کا روشن پہلو ہے، پاکستان کو رہبری کی ضرورت تھی، سیاسی لیڈر اور قائدین تو وہاں بہت تھے لیکن صحیح الفکر اور راسخ العقیدہ علما بہت کم تھے، ان حالات میں مفتی صاحب کا پاکستان تشریف لے جانا اچھا ہی رہا، خود ان کے حق میں بھی اور اہل پاکستان کے حق میں بھی۔

حضرت مفتی صاحب کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی، والد محترم جیّد الاستعداد عالم تھے، فارسی اور عربی کی ابتدائی کتابیں ان سے پڑھیں، متوسط درجات کی تعلیم کے لئے دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے، لکھنے پڑھنے کا شوق تھا، مطالعہ وتکرار سے کافی شغف تھا، صبح کو دارالعلوم آ کر رات ہی کو گھر واپسی ہوتی تھی، بعض اوقات تکرار کراتے کراتے مولسری کے نیچے ہی پڑ کر سو جاتے، امتحانات میں اعلیٰ نمبروں سے کامیابی حاصل کرتے، مفتی صاحب کو پڑھنے کے علاوہ کوئی دوسرا کام نہ تھا، نہ کسی سے دوستی تھی، نہ رشتہ داریوں میں آنا جانا تھا، حتی کہ دیوبند کے گلی کوچوں سے بھی اچھی طرح واقف نہ تھے، حالاں کہ یہیں کے رہنے والے تھے، شرح جامی کا پرچہ اتنا اچھا لکھا کہ ممتحن جھوم اٹھے اس وقت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی مہتمم تھے، ان کو بتلایا گیا کہ کسی طالب علم نے شرح جامی کا اتنا عمدہ پرچہ لکھا ہے گویا اس کی شرح لکھدی ہے، مہتمم صاحب یہ سن کر اس قدر خوش ہوئے کہ اسی وقت امتحان ہال میں پہنچے اور مفتی صاحب کو کھڑا کر کے سر پر ہاتھ رکھا اور اعلان فرمایا کہ اس لڑکے نے بہترین پرچہ کیا ہے والد محترم کی تربیت، گھر کا ماحول، مفتی صاحب کا شوق، اساتذہ کی توجہ ان سب چیزوں

نے مل کر مفتی صاحب کو علم کا شیدائی بنا دیا تھا، اساتذہ بھی کون تھے، وہ جن پر اس وقت دارالعلوم ناز کرتا تھا، وہ جبال علم جن میں سے ہر ایک اپنے فن میں یکتا و یگانہ تھا، یعنی حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ، حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ، حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ، حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، حضرت مولانا سید میاں اصغر حسین صاحبؒ حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ، حضرت مولانا رسول خاں صاحبؒ، حضرت علامہ ابراہیم بلیاوی صاحبؒ، جس طالب علم نے ان حضرات اساتذۂ کرام سے پڑھا ہو اس کی خوش بختی میں کسے کلام ہو سکتا ہے۔

حضرت شیخ الہندؒ اس وقت حیات تھے، مفتی صاحب نے اگرچہ نو عمری کے باعث حضرت شیخ الہند سے کوئی کتاب نہیں پڑھی لیکن حضرت کی مجلسوں میں برابر حاضر رہتے، جب بھی ذرا وقت ملتا آستانۂ شیخ الہند پہنچ جاتے، اگرچہ اس مجلس میں جو باتیں ہوتیں وہ مفتی صاحب کے سمجھ میں نہ آتیں مگر اس سے حاضری کے شوق میں کمی نہ آتی مفتی صاحب کی پرورش جس ماحول میں ہوئی تھی اس میں بزرگوں کا بڑا احترام کیا جاتا تھا، خود ان کے والد اس زمانے کے تمام بزرگوں کی خدمت میں حاضری دیتے اور اپنے بیٹے کو بھی ساتھ لے جاتے، مفتی صاحب نے شعور کی آنکھیں کھولیں تو گھر میں اس زمانے کے تین بڑے بزرگوں کا ذکر بار بار سنا، ان تین میں سے ایک حضرت شیخ الہند تھے، جو بلاشبہ اس زمانے کے رئیس العلما اور امام الاتقیا تھے، دوسرے بزرگ حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوری تھے، جن کی طرف اہل علم اور عوام کا بڑا رجوع تھا، تیسری شخصیت حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی تھی جو جامع شریعت بھی تھے اور جامع طریقت بھی، اس دور کے بڑے بڑے علما اصلاح حال کے لئے انہی کے آستانے پر نیاز مندانہ حاضری دینے کو بڑی سعادت سمجھتے تھے، حضرت مفتی صاحب ان تینوں حضرات اکابر کی خدمت میں بار بار حاضری کی سعادت سے سرفراز

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

ہوئے، حضرت شیخ الہندؒ سے بیعت کی تمنا تھی مگر حضرت نے بیعت کی درخواست یہ کہہ کر قبول نہیں فرمائی کہ ابھی تم بچے ہو، پڑھ رہے ہو، حضرت شیخ الہند سے پڑھنے کی بھی تمنا تھی، لیکن حضرت کی سیاسی مصروفیات کے باعث، بعد میں ہجرت مکہ گرفتاری اور مالٹا میں اسارت کی وجہ سے یہ تمنا پوری نہ ہوسکی، یہ کمی اس طرح پوری ہوئی کہ حضرت علامہ انورشاہ کشمیریؒ جیسے محدث کبیر کے سامنے بیٹھ کر حدیث کی کتابیں پڑھنے کا موقع مل گیا، دوسری طرف بیعت وارادت کے سلسلے میں حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے دامن رشد وہدایت سے وابستہ ہوگئے، یہ دونوں حضرات اپنے اپنے میدان میں یکتا اور منفرد تھے، یہ شان انفرادیت حضرت مفتی صاحب میں بھی نمایاں رہی۔

حضرت مفتی صاحب نے بائیس سال کی عمر میں دورۂ حدیث سے فراغت اور دیگر علوم وفنون کی تکمیل کے بعد ۱۹۳۶ء میں دارالعلوم دیوبند میں درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا، شروع میں نیت یہ تھی کہ درس وتدریس پر کوئی معاوضہ نہیں لیں گے اور یہ خدمت فی سبیل اللہ انجام دیں گے اس مقصد کے لئے انھوں نے خطاطی اور جلدسازی بھی سیکھی تھی، اور طبّ یونانی کی باقاعدہ تعلیم بھی حاصل کی تھی، مگر یہ ممکن نہ ہوسکا کیوں کہ درس وتدریس میں جس یکسوئی اور انہماک کی ضرورت ہے وہ دوسرے مشاغل اختیار کرنے کی صورت میں باقی نہیں رہتا، مجبوراً تن خواہ لینی پڑی، دارالعلوم دیوبند میں مفتی صاحب نے چھبیس سال تک درس دیا، اس خدمت کے ساتھ ہی وہ افتا کے شعبے سے بھی وابستہ رہے، اور تصنیف وتالیف کے کاموں میں بھی لگے رہے اس ہمہ جہتی مصروفیت کے باوجود دارالعلوم دیوبند میں مفتی صاحب کی تن خواہ صرف پینسٹھ روپے تھی، دوسرے مدارس میں اس سے کہیں زیادہ تن خواہ تھی اور مفتی صاحب کو دوسری جگہوں سے پرکشش تن خواہ کے ساتھ ملازمت کی پیش کش بھی کی جاتی تھی مثال کے طور پر مدرسہ عالیہ کلکتہ سے سات سو روپیہ مہینہ پر ملازمت کی پیش کش کی

گئی، مگر مفتی صاحب کی قناعت پسندانہ طبیعت نے اپنے بزرگوں کے زیر سایہ دارالعلوم دیوبند سے وابستگی کو ترجیح دی۔

ادھر مفتی صاحب نے تصوف وسلوک کی وادی میں قدم رکھا تو کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا، بیعت وارادت کا تعلق حکیم الامت حضرت تھانویؒ سے قائم کرنے کے ارادے سے تھانہ بھون حاضر ہوئے اور جا کر صاف صاف عرض کر دیا کہ میرا ارادہ حضرت شیخ الہند سے بیعت ہونے کا تھا لیکن وہ مالٹا میں ہیں، اب مجھے بتلائیے میں کیا کروں، حضرت تھانویؒ نے فرمایا کہ اس میں کوئی مضائقہ نہیں، آپ حضرت شیخ الہند کا انتظار کریں، اس وقت تک میں حاضر ہوں، اس میں تاخیر نہ کریں، اعمال ظاہرہ کی اصلاح کے ساتھ اعمال باطنہ کی اصلاح بھی فرض کے درجے میں ہے، آپ میرے مشورے پر عمل کرتے رہیں، اور اپنے حالات سے مجھے مطلع کرتے رہیں، ۱۹۲۰ء میں حضرت شیخ الہندؒ کی رہائی اور واپسی پر حضرت مفتی صاحب نے حضرت شیخ الہندؒ کے ہاتھ پر بیعت کر کے اپنی دیرینہ خواہش کی تکمیل تو کر لی، لیکن حضرت شیخ الہندؒ کی مصروفیات کی بنا پر ان سے زیادہ استفادے کا موقع حاصل نہ کر سکے، مالٹا سے رہائی کے بعد حضرت شیخ الہندؒ صرف ایک سال چھ مہینے حیات رہے، اس عرصے میں کچھ زیادہ استفادہ کیا بھی نہیں جا سکتا تھا حکیم الامت حضرت تھانویؒ سے وابستگی تو تھی ہی، اس وابستگی کو اور مضبوط کرنے کے لئے تھانہ بھون پہنچے اور عرض کیا کہ میں تصوف وسلوک کے مراحل طے کرنے کی آرزو تو بہت رکھتا ہوں مگر سنا ہے اس راہ میں مجاہدے اور ریاضتیں بہت ہیں، میں کم زور انسان ہوں، اور مصروف بھی بہت ہوں، ایسی حالت میں میری یہ آرزو کس طرح پوری ہو سکتی ہے، حکیم الامت نے بڑی تسلّی دی، کچھ نصیحتیں کیں، اس طرح حضرت تھانوی سے یہ تعلق گہرا اور مضبوط ہوتا چلا گیا، یہاں تک کہ خلافت سے سرفراز کئے گئے۔

حضرت مفتی صاحب نے جتنے میدانوں میں کام کیا ہے، سب میں کامیاب رہے

ہیں لیکن ان کے مزاج کے مطابق ان کے لئے کام کا اصل میدان فقہ وفتاوی کا تھا دارالعلوم دیوبند میں درس وتدریس کے ساتھ افتا کی ذمہ داریاں بھی آپ کے سپرد کی گئیں تھیں بلکہ ۱۹۵۰ء میں آپ کو صدر مفتی بھی بنادیا گیا تھا، یہ منصب بڑا نازک ہے، اور انتہائی ذمہ داری کا ہے، ایک مفتی کے لئے ضروری ہے کہ وہ فقہی جزئیات پر گہری نظر رکھتا ہو اور انھیں پیش آمدہ مسائل پر منطبق کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہو، یہ کام وہی شخص صحیح طور پر انجام دے سکتا ہے جس کا مطالعہ وسیع، علم عمیق، ذہن وفکر میں اعتدال کے ساتھ توسع، اور جسے فقہ وفتاوی کے فن سے مکمل مناسبت ہو، اس کے ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ اس میں احتیاط کا پہلو غالب ہو، خوف وخشیت اور صلاح وتقویٰ جیسے اوصاف بھی رکھتا ہو، حضرت مفتی صاحب فطری طور پر فقیہہ تھے، ان کی یہ شان تفقہ اس موضوع پر لکھی گئی ان کی کتابوں سے اور ان کے فتاوی سے نمایاں ہے، اس سلسلے کا حیرت انگیز پہلو یہ ہے کہ حضرت مفتی صاحب نے ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۴ء تک محض چار سال کے عرصے میں بارہ ہزار فتوے اپنے قلم سے لکھے، ان میں اڑتیس فتاوی باقاعدہ رسالوں اور کتابوں کی شکل میں نہایت تفصیل سے لکھے گئے ہیں، یہ رسائل اب امداد المفتیین اور جواہر الفقہ میں طبع ہو چکے ہیں۔

حضرت مفتی صاحب نے سیاست حضرت شیخ الہندؒ سے سیکھی تھی، تاہم انھوں نے طرز سیاست میں حضرت شیخ الہند کا اتباع نہیں کیا، اس وقت دارالعلوم دیوبند میں سیاسی طور پر علما کے دو گروپ کام کر رہے تھے، اگر چہ دونوں کا مقصد استخلاص وطن تھا مگر حضرت شیخ الہندؒ اور ان کے تلامذہ کانگریس کے ساتھ مل کر یہ جدوجہد کر رہے تھے اور دوسرا گروپ جس کی علمی رہ نمائی حکیم الامت حضرت تھانویؒ فرمارہے تھے اور جس کی عملی قیادت شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کر رہے تھے مسلم لیگ کے ساتھ تعاون کر رہا تھا، حضرت مفتی صاحب اسی دوسرے گروپ میں تھے، انھوں نے سیاست میں

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

عملی حصہ بھی لیا، اور قلمی جہاد بھی کیا، انھوں نے کانگریسی نظریات کی تردید اور قیام پاکستان کی حمایت میں مستقل رسائل لکھے اور فتوے جاری کئے، ایسا ہی ایک رسالہ تھا ”کانگریس اور مسلم لیگ کے متعلق شرعی فیصلہ“ علمی اور سیاسی حلقوں میں اس رسالے کی بڑی دھوم مچی، اور جو لوگ نظریۂ پاکستان کے حامی تھے اس رسالے سے انہیں بڑی رہ نمائی اور تقویت حاصل ہوئی، بہ ہر حال ان حضرات علمائے کرام کی جدوجہد سے پاکستان تو بن گیا اب ان مقاصد کا حصول ان حضرات کا نصب العین تھا جن مقاصد کے لئے پاکستان وجود میں آیا تھا۔

پاکستان میں حضرت مفتی صاحب کی سرگرمیاں بڑھ گئیں، دستوری ڈھانچے کی تعمیر و تشکیل کے لئے متعدد کمیٹیاں بنائی گئیں، اور مفتی صاحب کو ان کمیٹیوں کا رکن نامزد کیا گیا، حضرت مفتی صاحب نے بڑی عرق ریزی کے ساتھ راتوں کو جاگ جاگ کر مسوّدے تیار کئے، لیکن افسوس علما کی تمام محنتیں رائے گاں گئیں، ان حضرات نے مملکت اسلامیہ پاکستان کا جو خواب دیکھا تھا وہ بکھر گیا، آخر میں شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی خود بھی مایوس اور دل گرفتہ رہنے لگے تھے، یہی حال ان کے شاگرد رشید حضرت مفتی صاحب کا بھی تھا، ان حضرات نے اگرچہ سرکاری کمیٹیوں اور کمیشنوں سے کنارہ کشی اختیار کر لی لیکن عوامی رہ نمائی سے غفلت نہیں برتی، اس طرح جمعیۃ علمائے اسلام پاکستان وجود میں آئی، دار العلوم جیسا مرکزی ادارہ بنا، دار الافتا قائم کیا گیا، درس قرآن کے سلسلے شروع کئے گئے، علما ہر دور میں اپنی ذمہ داریاں محسوس کرتے ہیں اور ان کی تکمیل کے لئے کوشاں رہتے ہیں، یہی حال حضرت مفتی صاحب کا بھی تھا۔

میرے نزدیک پاکستان بننے کے بعد حضرت مفتی صاحب کے اصل کارنامے دو ہیں، ایک دار العلوم کراچی کا قیام، اور دوسرے تفسیر معارف القرآن کی تکمیل یہ دونوں ہی کارنامے مفتی صاحب کو صدیوں تک بلکہ قیامت تک زندہ و تابندہ

رکھیں گے، دارالعلوم کراچی کا شمار آج پاکستان کے بڑے اداروں میں ہوتا ہے، بلکہ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اس کا شمار دنیا کی چند بڑی تعلیم گاہوں میں ہونے لگا ہے، حیرت ہوتی ہے کہ ایک مہاجر نے محض اپنی خداداد صلاحیت کی بنیاد پر ہزار مخالفتوں کے باوجود کس طرح کراچی کے صحرا میں علم کا یہ نخلستان لگایا کہ آج ساری دنیا میں یہ پاکستان کا نام روشن کر رہا ہے۔

''تفسیر معارف القرآن'' نے وہ شہرت دوام حاصل کی ہے جو اُردو زبان کی کسی دوسری تفسیر کو حاصل نہ ہوسکی، اصلاً یہ ان دروس کا مجموعہ ہے جو حضرت مفتی صاحب نے ریڈیو پاکستان پر مسلسل گیارہ سال تک دئے ہیں، بعد میں مفتی صاحب کی نظر ثانی کے بعد ان دروس کو کتابی شکل میں ترتیب دیا گیا، اس سلسلے کا قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ حضرت مفتی صاحب نے اس گراں قدر خدمت کے عوض ریڈیو پاکستان سے کوئی رقم وصول نہیں کی، غالباً یہ اسی خلاص کی برکت ہے کہ آج یہ تفسیر اردو داں حلقوں میں اپنی مقبولیت کے تمام ریکارڈ توڑ چکی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت مفتی صاحب کو نیک وصالح اور حافظ وعالم اولاد سے نوازا ہے، ماشاءاللہ مفتی صاحب کے تمام بیٹے پڑھے لکھے ہیں، بلکہ دو بیٹے مولانا محمد تقی عثمانی اور مولانا محمد رفیع عثمانی تو علم کے آسمان پر ابھی سے چمکنے لگے ہیں (۲) اللہ تعالیٰ ان حضرات کو علمی ترقیات سے نوازے اور اپنے والد مرحوم کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

(۲) میرا یہ تأثر اس وقت کا ہے جب حضرت مفتی صاحب کے انتقال کے بعد میں نے یہ مضمون لکھا، آج مولانا مفتی محمد تقی عثمانی عالمی افق پر علم کے آفتاب بن کر چمک رہے ہیں، ساری دنیا جانتی ہے اور مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی بھی علم کی دنیا میں زبردست شہرت کے حامل ہیں، ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

فن حدیث کی عظمتوں کے نقیب، فخر المحدثین

حضرت مولانا شریف حسن دیوبندیؒ

ادھر پچھلے تین چار سال کے دوران بہت سی شخصیتیں نگاہوں سے اوجھل ہوگئیں، حضرت مولانا ظفر احمد تھانویؒ، حضرت مولانا محمد میاں دیوبندیؒ، حضرت مولانا ادریس کاندھلویؒ، حضرت مولانا مفتی سید مہدی حسن شاہ جہاں پوریؒ، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع عثمانیؒ جیسے بزرگ اور بلند قامت لوگ اٹھ گئے یہ سب دیوبند کی قدیم نسل کے ممتاز افراد تھے، اور صحیح معنوں میں دیوبند کی آبرو، اس کا وقار اور اس کی عظمتوں کے امین! حضرت مولانا شریف حسن صاحب اس نسل کے فرد نہ تھے مگر ان میں اس نسل کی تمام خصوصیتیں موجود تھیں، ان کے علم کا، ان کا فکر اور فن کا ایسا گہرا رنگ ان پر تھا کہ وہ اسی نسل کے ایک فرد لگتے تھے، دو جون کی شب ساڑھے دس بجے اچانک یہ خبر ملی کہ حضرت مولانا شریف حسن صاحب رخصت ہوگئے، دل ڈوب سا گیا، آنکھیں چھلک پڑیں، خبر اتنی غیر متوقع تھی کہ علالت کے تسلسل کے باوجود یقین نہ آیا، اللہ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔

مولانا شریف حسنؒ ۹/ اگست ۱۹۲۰ء کو دیوبند میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم یہیں ہوئی، مشہور حافظ جناب عبدالخالق مرحوم سے قرآن پاک حفظ کیا، فارسی اور عربی درجات کی ابتدائی کتابیں مدرسہ اسلامیہ بہٹ میں پڑھیں، اور حضرت مولانا عبدالرحیم مظفر نگری

سے شرف تلمذ حاصل ہوا جو حضرت شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی کے ممتاز تلامذہ میں سے تھے، باقی تعلیم دار العلوم دیوبند میں ہوئی، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، حضرت مولانا اصغر حسین صاحب دیوبندیؒ شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علیؒ اور حضرت مولانا محمد ابراہیم بلیاویؒ جیسے ماہر و یگانۂ روزگار اساتذۂ فن سے اکتساب علم کیا، ۱۳۵۸ء میں فراغت کے بعد حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے طلب فرمانے پر مدرسہ امداد العلوم خانقاہ تھانہ بھون تشریف لے گئے اور وہاں صدر مدرس کی حیثیت سے خدمت انجام دی، حکیم الامتؒ کی مسلسل رہنمائی اور فیض صحبت کے اثر سے حدیث اور فقہ پر نظر وسیع ہوئی تقریباً تین ساڑھے تین برس تک مشکوۃ شریف، اور جلالین شریف کا درس دیا، بعد میں اساتذہ کے حکم سے بریلی تشریف لے گئے اور وہاں مدرسہ اشاعت العلوم میں صدر مدرس اور مفتی رہے، بریلی اور دیوبند کی کش مکش مشہور ہے، اس دور میں یہ کش مکش کچھ زیادہ ہی تھی، دیوبند مکتب فکر سے وابستہ کسی شخص کے لئے بریلی میں رہ کر اپنے مسلک کی اشاعت کرنا آسان نہ تھا، لیکن اللہ نے مولانا مرحومؒ کو خاص سلیقے سے نوازا تھا، آپ نے مسلسل کئی برس وہاں دینی خدمات انجام دیں، مناظرے بھی ہوئے تقریریں بھی ہوئیں اور درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری رہا، اکثر و بیشتر لوگ بدعت کی معصیت سے تائب ہو کر مولانا کی خدمت میں حاضر ہوتے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے صحتِ عقیدہ پر استقامت کا عہد کر کے واپس ہوتے، اسی دوران جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل میں ایک شیخ الحدیث کی ضرورت پیش آئی، یہ وہ جگہ ہے جہاں حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیریؒ جیسے عظیم محدث اپنے قابل ترین رفقا اور ممتاز تلامذہ کی ایک جماعت کے ساتھ مقیم رہے، ان میں حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، حضرت مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ، حضرت مولانا سید بدر عالم مہاجر مدنیؒ جیسے بزرگ اور قابل علما بھی

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

تھے، وہ مسند حدیث جس پر حضرت علامہ کشمیریؒ جلوہ افروز رہے آپ کے سپرد کی گئی اور آپ نے گیارہ سال تک بخاری وترمذی کا اس شان سے درس دیا کہ وہ لوگ حیرت سے دانتوں تلے انگلیاں دبالیا کرتے تھے جن کے کانوں میں علامہ کشمیریؒ کی تقریریں گونج رہی تھیں، یہاں سے آپ کی شہرت دور دور تک پہنچی اور اساتذہ کو آپ کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوا، ۱۳۸۲ھ میں آپ کو دارالعلوم تشریف لانے کی دعوت دی گئی اور یہاں درجۂ وسطیٰ الف کی کتابیں آپ کے سپرد کی گئیں، دو تین سال ادب تفسیر معقولات اور فقہ کی معیاری کتابیں پڑھانے کے بعد آپ کو درجۂ علیاء میں لے لیا گیا، اور دورۂ حدیث کے اسباق کا آغاز ہوا، آپ نے دارالعلوم میں مسلم شریف، ابن ماجہ شریف اور ابوداؤد شریف وغیرہ بلند پایہ کتابوں کا درس دیا، ۱۳۹۱ھ میں دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث حضرت مولانا فخر الدینؒ وفات پاگئے، یہ ایک زبردست حادثہ تھا اور ایک ایسا نقصان تھا جس کی تلافی بہ ظاہر ناممکن نظر آرہی تھی اس موقع پر سب کی زبانوں پر مولانا شریف حسنؒ کا نام تھا، ان کے تجربے، بے پناہ دقت نظری، وسعت مطالعہ، اور قوتِ حفظ کے چرچے عام تھے، چنانچہ طلبہ کی بے پناہ خواہش کے احترام میں، اور خود دارالعلوم کے وسیع تر علمی مفاد کی خاطر بخاری اور ترمذی مولانا مرحوم کے سپرد کی گئیں، اور آپ نے اس مسند درس کو زینت بخشی جو حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ، شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ، اور حضرت مولانا سید فخر الدین احمد صاحبؒ کی خوشبوؤں سے مہک رہی تھی۔

مولانا مرحوم نے چھ برس تک مسلسل اس امانت کی حفاظت کی جو دارالعلوم نے آپ کے سپرد کی تھی، دارالعلوم دیوبند کا دارالحدیث ہندوستان میں کشمیر سے کنیا کماری تک، اور باہر سماترا سے سائبیریا تک مشہور ہے، ہر جگہ سے یہاں لوگ علم حدیث

حاصل کرنے کے لئے آتے ہیں، صحیح بات یہ ہے کہ ہندوستان میں حدیث نبوی کی توسیع اشاعت کا سہرا اسی دارالحدیث کے سر ہے، یہاں سے ہزاروں علما نکلے اور دنیا کے ہر علاقے میں پھیلے، پچھلے ایک سو تیرہ برس سے ان کی آوازیں ہر جگہ گونج رہی ہیں، قرآن وسنت کے لئے ان کی جدوجہد صحابہ کے دور کی یاد تازہ کرتی ہے اس درس گاہ میں حدیث کو قرآن کے معانی، صحابہ کے عمل، اور اسلاف کے علوم کی روشنی میں دیکھا جاتا ہے، حدیث کی وہ تمام کتابیں پیش نظر رہتی ہیں جن پر امت کو اعتماد ہے اور جو ضعیف اور ناقابل اعتبار روایات سے پاک ہیں، متعارض روایات میں تطبیق، ترجیح، توجیہہ یا تنسیخ کا عمل محض اندازوں پر مبنی نہیں ہوتا بلکہ اس سلسلے میں حدیث کے تمام اصول سامنے رکھے جاتے ہیں، یہاں کا طالب علم وہ روشنی لے کر جاتا ہے جس سے وہ صحیح کو غلط سے جدا کر سکے اور مشکل مسائل میں حق کی راہ تلاش کر لے، یہاں درسِ حدیث کے جس اسلوب کی روایت مسلسل ملتی ہے اس کے تمام تقاضوں کو پورا کرنا ہر موضوع کی تمام روایات پر نظر، متعارض روایات میں صحیح موقف اختیار کرنے کی صلاحیت، رجالِ حدیث، اور فقہاء کے مذاہب کے بسیط مطالعے کے بغیر ناممکن ہے، حضرت مولانا شریف حسنؒ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے ممتاز تلامذہ میں سے تھے، آپ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی خدمت میں بھی رہے، اور ان سے بخاری کے متعدد مقامات سبقاً سبقاً پڑھے حضرت مولانا مدنیؒ کے ذریعہ آپ کو حضرت شیخ الہندؒ کے علوم پر گہری بصیرت حاصل ہوئی اور حضرت مولانا عثمانیؒ نے آپ کو حضرت علامہ کشمیریؒ کے اسلوب سے نوازا، آپ کی تقریروں میں مولانا مدنیؒ کی جامعیت اور تفصیل اور مولانا عثمانیؒ کے استدلال کا رنگ غالب تھا، یہی وجہ ہے کہ آپ نے دارالعلوم جیسی عظیم درس گاہ میں نہایت پر اعتماد اور باوقار لب ولہجے میں درس دیا اور اپنے پیش روؤں کی یاد تازہ کر دی، مطالعہ انتہائی وسیع تھا، خود فرمایا کرتے تھے کہ میں نے

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

بہ فضل خدا ''فتح الباری'' کا تقریباً چودہ بار مطالعہ کیا ہے، زمانۂ شباب میں اس قدر مطالعے کے باوجود اب بھی ہر چھوٹی بڑی کتاب پیش نظر رہتی، دارالعلوم کے کتب خانہ سے آپ کے نام ڈیڑھ سو سے زیادہ کتابیں ہر سال جایا کرتی تھیں، ان میں صحاح ستہ اور ان کی تمام شروح وحواشی کے علاوہ درس نظامی میں شامل تمام فنون کی بنیادی کتابیں شامل ہوتیں۔

ترمذی میں اختلافی مسائل میں علما کے اختلاف اور ان کے صحیح مذاہب کی تفصیل مستند کتابوں کے حوالے سے بیان فرماتے، پھر ائمہ کے دلائل اور آخر میں امام ابوحنیفہؒ کے دلائل کا ذکر ہوتا، مگر اس شان سے کہ ائمہ کی عظمت پر کوئی حرف نہ آئے بعض مسائل پر اس قدر تفصیلی بحث ہوتی کہ ایک ایک ہفتہ تک وہی موضوع رہتا بخاری میں ترجمۃ الباب کی تشریح اور حدیث سے اس کی مطابقت پر پوری توجہ صرف ہوتی، فقہی مسالک کی تفصیل کے لئے ترمذی کا درس کافی تھا مگر ضروری باتیں یہاں بھی بیان کی جاتیں، خاص طور سے بخاری کا فقہی مذہب، اور پیشِ نظر حدیث سے ان کے استدلال کا طریقہ بحث کا موضوع ہوا کرتا تھا، درس کے دوران اپنے اکابر حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ، حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیریؒ، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے تفردات پیش کرنے کا اہتمام تھا، دوران درس امام بخاریؒ، ابن تیمیہؒ، حافظ ابن حجرؒ اور عینیؒ پر نقد بھی فرماتے، مگر بڑے ادب کے ساتھ اور بہت مدلل انداز میں، الفاظ حدیث کی لغوی تشریح بھی فرماتے اور نحوی وصرفی مسائل کا تذکرہ بھی ہوتا، دورانِ درس آپ کا ذہن انتہائی مصروف ہوتا، بات میں بات نکلتی، اور ہر موضوع بہت سے نئے موضوعات کو جنم دیتا، زبان و بیان کی اس بے ربطی کے باوجود طلبہ کی دل چسپی کا عالم دیکھنے کے قابل ہوتا، حضرت مرحوم کے منھ سے نکلا ہوا لفظ لفظ طلبہ کی کاپیوں میں قید ہو جاتا، اور اس سے پہلے ان کے دل ودماغ

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

میں اتر جاتا، افسوس کہ موت کے بے رحم ہاتھوں نے یہ آواز خاموش کردی جو ہر صبح دارالعلوم کے دارالحدیث میں گونجتی تھی، دارالحدیث کے درو دیوار اب بھی اس آواز کے منتظر ہیں مگراب یہ آواز کبھی نہ گونجے گی، کبھی نہ ابھرے گی، نہ ابھرنے کے لیے ڈوب چکی ہے، سدا رہے نام اللہ کا۔

دارالعلوم میں وہ متعدد اعلیٰ مناصب پر فائز رہے، طلبہ میں آپ کے اثر ورسوخ اوران کے نزاعی مسائل نمٹانے میں آپ کی بے پناہ صلاحیت کے پیش نظر دارالاقامہ کی نظامت آپ کے سپرد رہی، اوردارالعلوم کے تین مقتدر اساتذہ آپ کے مددگار رہے۔

دارالعلوم میں بخاری شریف، اورترمذی شریف کی تدریس کا شرف حاصل ہوا، گزشتہ سال قائم مقام صدرالمدرسین بنائے گئے، بسا اوقات ناظم تعلیمی بھی رہتے اورکبھی کبھی حضرت مہتمم صاحب مدظلہ کی عدم موجودگی میں قائم مقام مہتمم کی حیثیت سے بھی کام انجام دیتے، اہتمام کی مشورہ کمیٹی کے ممتاز رکن تھے، اتنے بہت سے مناصب کے باوجود بے نفسی، سادگی اورتواضع کا یہ عالم تھا کہ دیوبند یا دارالعلوم کا کوئی بھی معمولی سا آدمی سرِ راہ آپ کو روک کر کھڑا ہوجاتا، جس وقت دل چاہے گھر پر دستک دے دیتا اورمولانا جس حالت میں بھی ہوتے باہر چلے آتے، بیماری میں ڈاکٹروں کی شدید پابندیوں کے باوجود آپ کبھی اس پر راضی نہ ہوئے کہ طلبۂ دارالعلوم کی آمدورفت پر پابندی لگائی جائے، آدھی رات بھی اگر دارالعلوم میں کوئی ضرورت پیش آتی فوراً اٹھ کھڑے ہوتے، شاگردوں کی لمبی چوڑی فوج کے باوجود بازار سے اپنا سامان خود لانے کے عادی تھے، دیوبند کے لوگ سوچتے ہیں کہ ایسا ایثار پیشہ مخلص، اوربے نفس عالم اب کہاں ملے گا؟

دارالعلوم کی تعلیمی اورانتظامی مصروفیات میں شب وروز کے انہماک سے مولانا کی صحت متأثر رہنے لگی تھی اپنوں اورغیروں سب ہی کا اصرار تھا کہ آرام زیادہ

سے زیادہ کیا جائے، مگران پر کسی مشورے کا اثر نہ ہوتا، چھپن ستاون برس کی عمر میں وہ اسّی سال کے بوڑھے نظر آنے لگے تھے، سرخ وسفید رنگت، لمبا چوڑا جسم مگر کم زور اور ناتواں، میں اکثر عرض کرتا کہ ماموں جان! تدریس کے علاوہ سب مصروفیتیں ترک کر دیجیے اور کچھ تصنیفی کام ضرور کر دیجیے، مولانا مسکرا کر رہ جاتے، آپ نے شمائل ترمذی کی عربی شرح تحریر فرمائی تھی، یہ بڑے سائز کے ساڑھے چار سو صفحات پر مشتمل ہے، اور بڑی گراں قدر ہے میں اکثر اس کی اشاعت پر اصرار کرتا، مولانا اخراجات کا عذر فرما دیتے، اور یہ ایک معقول عذر ہوتا، اب خیال آتا ہے کہ یہ قیمتی شرح جو مولانا کی علمی یادگار بھی ہے منظر عام پر آ ہی جانی چاہیئے۔

یہ مضمون لکھ رہا ہوں اور ذہن کے پردے پر سینکڑوں منظر ابھر رہے ہیں، اور ڈوب رہے ہیں، انھیں اپنے بھانجے، اپنے شاگرد سے کتنی محبت تھی، کتنا تعلق تھا رہ رہ کر اکثر خیال آتا ہے اور دل مسوس کر رہ جاتا ہے، ایسا لگتا ہے کہ سب کچھ چھن گیا ایک سہارا تھا وہ بھی جاتا رہا، جب کوئی مشکل پیش آتی آپ سے رجوع کرتا، اور مولانا کی مدد سے اس دشواری پر قابو پاتا، اب کس سے رجوع کروں، اور کون مجھے اتنا عزیز رکھ سکے گا، اب صرف یادیں باقی رہ گئیں ہیں جو خوشبو کی طرح ہمیشہ معطر رہیں گی اور اُن سے اُجالا پھوٹتا رہے گا، شاید یہی روشنی رہنما ہو اور راستے کی دشواریوں میں مددگار بھی۔

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

تاریخ دارالعلوم دیوبند کے مصنف

جناب سید محبوب رضویؒ

دارالعلوم دیوبند کے صدر دروازے سے گزر کر جب آپ اسی احاطے میں آگے بڑھیں گے تو بائیں طرف والی دیوار کے بالکل آخری کونے میں آپ کو ایک دروازہ نظر آئے گا، اس دروازے سے داخل ہو کر آپ چند سیڑھیاں اوپر چڑھیں گے تو دائیں طرف کے دروازے سے دفتر محاسبی میں پہنچ جائیں، اب دو تین سیڑھیاں اوپر چڑھ کر قبلہ رو ہو کر کھڑے ہوں تو ایک مختصر سی راہ داری آئے گی جس کا دایاں دروازہ دارالاہتمام میں کھُل رہا ہے، اور بائیں سمت کا دروازہ محافظ خانے میں جا رہا ہے، ہمیں اسی دروازے سے اندر جانا ہے، دارالعلو دیوبند کا تمام دفتری ریکارڈ اسی ادارے میں محفوظ رہتا ہے اور اس ریکارڈ کی حفاظت کرتے ہیں اور اسے سلیقے سے رکھتے ہیں شعبے کے ناظم جناب سید محبوب رضوی صاحب، خدا جانے ان کے ذمے یہ کام کیوں کیا گیا، شاید اس لئے کہ تاریخ پر ان کی گہری نظر ہے، ورنہ اس کام سے ان کو کئی مناسبت نہیں، اصلاً وہ پڑھنے لکھنے والے انسان ہیں، اور زبردست تحقیقی مزاج رکھتے ہیں، مجھے ان سے بڑی عقیدت ہے، دراصل ان کی باتوں میں لطف ہی بہت آتا ہے، آپ ان کے پاس چند لمحے گزارنے کے ارادے سے بیٹھ جائیں، یہ لمحے گھنٹوں میں کب تبدیل ہوئے آپ کو احساس بھی نہ ہوگا، بولتے اس طرح ہیں جیسے

ہونٹوں سے موتی لٹا رہے ہوں، ہنستے اس طرح ہیں گویا منھ سے پھول جھڑ رہے ہوں آپ ان کی صحبت میں بیٹھ کر کبھی بور نہیں ہوسکتے، ہر موضوع پر ان کے پاس معلومات کا بڑا ذخیرہ ہے، ہر مرتبہ کی ملاقات میں آپ ان سے کچھ ایسی باتیں ضرور سنیں گے جو پہلے کبھی نہیں سنی تھیں، دارالعلوم اور اکابر دارالعلوم کا تو مکمل انسائیکلوپیڈیا ہیں، اگر کوئی معاملہ تاریخ اور تحقیق کا ہو تو سب سے پہلے ان ہی کی طرف رجوع کیا جاتا ہے، راقم السطور ان سے ملنے کے لئے بے تاب رہتا ہے، جب بھی اسے وقت ملتا ہے محافظ خانے میں جا کر بیٹھ جاتا ہے، وہ بھی میرے ساتھ شفقت و محبت سے پیش آتے ہیں اور خوب خوب باتیں کرتے ہیں، باتیں تو ان کی خوب صورت ہیں ہی وہ خود بھی بے حد حسین و جمیل انسان ہیں، سرخ وسفید رنگت، کشادہ پیشانی، بہترین ناک نقشہ، سفید گھنی سی داڑھی، جسم تھوڑا بھاری، چال میں وقار اور متانت، قد و قامت میں توازن اور اعتدال، میں سچ کہتا ہوں کہ دارالعلوم میں دو ہی شخصیتیں حسین و جمیل ہیں ایک حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب مدظلہ العالی کی جو سراپا حسن و جمال ہیں، خوش وضع خوش اندام، خوش لباس، خوش اطوار، نورانیت میں ڈھلا ہوا ایک وجود، اور دوسرے محبوب رضوی صاحب، جس وقت وہ شیروانی زیب تن کر کے متانت و وقار کے ساتھ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا کر صدر دروازے سے اپنے دفتر کی طرف بڑھتے ہیں تو بہت سے نو وارد طلبہ اور مہمان بے ساختہ مصافحہ کرنے کے لئے ان کی طرف لپکنے لگتے ہیں۔

افسوس یہ سدا بہار، باوقار، سراپا اخلاق، متواضع اور ملنسار، شخصیت ۲۵ مارچ ۱۹۷۹ء کو ہم سے جدا ہوگئی، ان کی وفات کا حادثہ اچانک پیش آیا، بالکل اچھے بھلے تھے ظہر کی نماز کے بعد حسب معمول گھر سے دارالعلوم کی طرف روانہ ہوئے چھتے کی مسجد کے پاس ہی پہنچے تھے کہ دل کا دورہ پڑا، مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئے، اس سے پہلے کہ طبی امداد پہنچتی مالک حقیقی سے جا ملے، ان کی اس اچانک موت کی خبر جس نے بھی سنی

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

وہ ششدر رہ گیا، بہت دیر تک تو کسی کو یقین ہی نہیں آیا، مگر ان کے بے جان جسم نے ساری حیرانیاں دور کر دیں: کُلُّ نفس ذائقة الموت، ہر شخص کو مرنا ہے، کسی کو پہلے جانا ہے، کسی کو بعد میں جانا ہے، کسی کی موت دفعۃً آئے گی اور کوئی بستر پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرے گا، ہر شخص اسی طرح مرے گا جس طرح مرنا اس کی قسمت میں لکھا ہے۔ قحط الرجال کے اس دور میں محبوب رضوی صاحب کا وجود ہم جیسے نو آموز اور کم سواد لوگوں کے لئے بڑا غنیمت تھا، جب بھی ہم کہیں الجھتے یا اٹکتے، جب بھی ہمیں کچھ پوچھنا ہوتا ہم بلا تکلف ان کی خدمت میں حاضر ہوتے، اور پوری تسلّی تشفی کے ساتھ واپس آتے، وہ اصطلاحی معنی میں عالم دین نہیں تھے، نہ کسی دارالعلوم کی ڈگری ان کے پاس تھی، لیکن اپنی وسعت معلومات، تبحر علمی، قادر الکلامی اور صلاح وتقویٰ کے لحاظ سے کسی بزرگ عالم دین سے کم بھی نہیں تھے، جس محفل میں ہوتے اپنی خوش گفتاری سے مرکز نظر بنے رہتے اور اپنی بیش قیمت معلومات کے حوالے سے حاضرین پر چھائے رہتے۔

سید صاحب دیوبند کے خاندان سادات سے تعلق رکھتے تھے، اوپر جا کر ان کا اور سرسید علیہ الرحمہ کا سلسلۂ نسب ایک ہو جاتا ہے، ان کے والد سید ظہور الحسن نے دارالعلوم دیوبند میں تعلیم پائی، بچپن میں کچھ عرصے اپنے نانا حکیم سید غلام عباس کے یہاں بھوپال میں قیام رہا، محکمہ نہر میں ملازم تھے، اوراد وظائف میں مشغول رہتے تھے، طبِ یونانی سے بھی خاص مناسبت تھی، بہ طور خاص چھوٹے بچوں کا علاج کیا کرتے تھے، ۱۸۶۸ میں پیدا ہوئے اور ۱۹۵۱ء کو انتقال ہوا عیدگاہ دیوبند کے شمالی جانب قبرستان انوری میں آسودۂ خاک ہیں، سید محبوب رضوی کی پیدائش ۱۳؍ اگست ۱۹۱۱ء کو ہوئی، مدرسہ منبع العلوم گلاؤٹھی میں تعلیم حاصل کی، پھر دہلی اور دیوبند میں اپنے نانا مولانا محمد صدیق (متوفی ۱۹۴۲ء) تلمیذ حضرت مولانا احمد علی محدث سہارن پوری سے صرف ونحو ادب اور طب کی کتابیں پڑھیں، صحت کی خرابی اور نامساعد حالات کی

بنا پر علوم درسیہ کی تکمیل نہ کرسکے، لیکن مطالعہ کا بڑا ذوق تھا، دارالعلوم میں آنے کے بعد اس کمی کا بڑی حد تک ازالہ ہوا، اگر چہ وہ اصطلاحی معنی میں عالم نہیں تھے مگر کسی عالم سے کم بھی نہیں تھے۔

ان کا مزاج بڑا تحقیقی تھا، انھوں نے بے شمار مضامین لکھے جو ملک کے مشہور اور ممتاز رسائل وجرائد میں شائع ہوئے، برہان اور معارف جیسے تحقیقی اور علمی مجلوں میں بھی ان کے رشحات قلم شائع ہوتے تھے اور قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے، اہل علم جانتے ہیں کہ ان دو رسالوں میں چھپنے کا مطلب یہ تھا کہ لکھنے والا بڑا محقق ہے اور اس کا مضمون بڑا معیاری ہے، یہ حقیقت ہے کہ محبوب صاحب جو کچھ لکھتے مستند حوالوں کے ساتھ لکھتے، میں نے ان کا کوئی مضمون ایسا نہیں دیکھا جسے تحقیق کے معیار سے ہٹ کر لکھا گیا ہو، غالباً اسی وجہ سے جب دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ نے یہ طے کیا کہ اب دارالعلوم دیوبند کی سوسالہ تاریخ لکھی جائے تو قرعۂ فال محبوب صاحب کے نام نکلا، حالاں کہ ملک میں نامور اہل علم اور اصحاب قلم کی کمی نہیں تھی، خود مجلس شوریٰ میں ایک سے بڑھ کر ایک مصنف اور محقق موجود ہیں لیکن مجلس شوریٰ نے اتفاق رائے کے ساتھ ان کو اس اہم کام کے لئے منتخب کیا، واقعہ یہ ہے کہ محبوب رضوی صاحب نے مجلس شوریٰ کو مایوس نہیں کیا، اس کے دو رکن حضرت مولانا قاضی زین العابدین میرٹھی اور مولانا سعید احمد اکبرآبادی بڑی ژرف نگاہی اور دقت نظری سے ایک ایک لفظ پڑھتے تھے، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ نے بھی تاریخ دارالعلوم کے مسوّدے کا بہ غور مطالعہ کیا، اور اس پر یک بسیط مقدمہ بھی تحریر فرمایا اس مقدمے میں حضرت نے محبوب رضوی صاحب کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خود حضرت مہتمم صاحب مدظلہ بھی ان کی صلاحیتوں کے بڑے قدرداں اور معترف تھے فرماتے ہیں ''ہمارے محترم بھائی سید محبوب صاحب رضوی کو طبعی طور پر تاریخ سے لگاؤ اور

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

اس فن سے مناسبت ہے اور واقعہ نگاری کا فطری سلیقہ ہے، دار العلوم میں جب کبھی تاریخی سوالات آتے ہیں تو انہی سے اس بارے میں مدد لی جاتی ہے اور وہ باحسنِ اسلوب اس کام کو بڑے سلیقے سے انجام دیتے ہیں۔'' (مقدمہ دار العلوم دیو بند ۱/۵۵) حضرت مہتمم صاحب مدظلہ نے یہ بھی تحریر فرمایا کہ محبوب رضوی صاحب نے تاریخ دار العلوم کی تدوین میں بہترین حسن ترتیب، ضروری معلومات کی فراہمی اور اس کے ساتھ مؤرخانہ انداز سے مستند حوالہ جات بھی پیش کئے ہیں، جامع عنوانات کے تحت واقعات اور معاملات کا تجزیہ بھی کیا تفصیل کی جگہ تفصیل، اور اجمال کی جگہ جامع اجمال، عبارت سلیس اور شگفتہ ہے، حضرت مہتمم صاحب نے یہ اعتراف بھی فرمایا کہ اس سے بڑھ کر تاریخ لکھی نہیں جا سکتی تھی، تاریخ بیانی میں انھوں نے اس کی کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑی کہ کوئی دوسرا اس پر قلم اٹھائے میں اس تاریخ سے مستفید ہوا اسے پڑھا اور ماشاء اللہ کہتا رہا۔

محبوب رضوی صاحب کی تاریخ دانی، اور تاریخ دارلعلوم کی ترتیب وتدوین میں ان کی محنت کو اس سے بڑھ کر کیا خراج تحسین پیش کیا جا سکتا ہے (آج اس تاریخ کی تالیف اور اشاعت پر چھتیس سال کا عرصہ گزر چکا ہے، ابھی تک اس میں ترمیم وتنسیخ اور حذف واضافے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی، آج بھی یہ لگاتار چھپ رہی ہے، اور دار العلوم کے تعارف اور تاریخ کے سلسلے میں ایک مستند حیثیت رکھتی ہے)(۱) محبوب رضوی صاحب نے اپنے پیش لفظ میں پہلے تو مجلس شوریٰ کے انتخاب پر ازراہ تواضع یہ لکھا ہے کہ اس کے مؤقر ارکان نے ایک کم علم، بے سواد اور ہیچ مداں شخص کا انتخاب کیا اس کے بعد اس محنت طلب کام کو اس کوہِ بے ستون میں کوہ کنی سے تعبیر کرتے ہوئے ان مشکلات کا ذکر کیا ہے جو ترتیب وتدوین کے طویل مراحل میں پیش آتی ہیں، اس کے بعد یہ اعتراف کیا کہ کوئی انسانی کام نقائص، خامیوں، اور

(۱) بریکٹ میں دی گئی سطریں ابھی نظر ثانی کے وقت بڑھائی گئی ہیں۔

فروگزاشتوں سے پاک نہیں ہوسکتا اس لئے تاریخ دارالعلوم کے مکمل یا حرف آخر ہونے کا دعویٰ ہرگز نہیں کیا جاسکتا، اور پھر یہ تو نقش اوّل ہے، میں نے تو دارالعلوم کے منتشر اور بکھرے ہوئے حالات کو اپنی بساط کے مطابق ایک جگہ جمع کردیا ہے، یہ واقعات کسی کتاب کے بکھرے ہوئے واقعات کی طرح منتشر تھے مگر اب یہ ایک شیرازہ بند کتاب کی صورت میں آپ کے سامنے ہیں، محبوب صاحب نے بجا طور پر لکھا ہے کہ یہ عظیم کام درحقیقت مصنفین کے ایک بورڈ کے کرنے کا تھا جس کو ایک تنہا شخص کے حوالے کردیا گیا۔

تاریخ دارالعلوم دیوبند جو دو جلدوں کے لگ بھگ ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہے زبان و بیان کے اعتبار سے بھی بڑی دل چسپ ہے، محبوب رضوی صاحب مؤرخ اور محقق تھے، عموماً مؤرخ اور محققین کے یہاں خشک تحریریں پائی جاتی ہیں، جنھیں پڑھنے والا دل جمعی کے ساتھ زیادہ دیر تک پڑھ نہیں پاتا لیکن محبوب صاحب کے قلم میں شگفتگی بھی ہے اور روانی بھی، پڑھنے والا تاریخ جیسے خشک مضمون کو بھی دل چسپی اور انہماک کے ساتھ پڑھ لیتا ہے، یہ محبوب صاحب کے قلم کا کمال ہے، محبوب صاحب کا دوسرا کمال یہ ہے کہ انھوں نے کوئی بات بلا حوالہ نہیں لکھی، اور نہ تاریخ کو اپنے خیالات اور جذبات کا پلندہ بنایا، دارلعلوم دیوبند کی سوسالہ تاریخ میں بہت سے واقعات ایسے بھی پیش آئے ہیں جن کا ذکر ضروری بھی ہے اور جن سے بچ کر گزرنا بھی ضروری ہے، ایسے مواقع پر مصنف کی کوشش یہ رہی ہے کہ انصاف کے دامن کو حتی الامکان ہاتھ سے چھٹنے نہ دیا جائے، اس لئے نزاعی واقعات پر نہایت حزم واحتیاط کے ساتھ قلم اٹھایا گیا ہے، اور ایسے مقامات سے جلد از جلد گزرنے کی کوشش کی گئی ہے، اس احتیاط پسندی نے تاریخ دارالعلوم کو متنازعہ ہونے سے بچالیا، ضروری ہے کہ آئندہ اگر اس پر اضافہ ہو تو اسی نہج کو سامنے رکھا جائے، تاریخ کسی شخص کے ذاتی

خیالات کا مجموعہ نہیں ہوتی، بلکہ یہ ایک آئینے کی طرح ہے جس میں وہی منظر دکھائی دیتا ہے جس کی عکس بندی مقصود ہوتی ہے، نہ مؤرخ کو نتائج اخذ کرنے میں جلدی کرنی چاہئے اور نہ انصاف کا دامن ہاتھ سے چھوڑنا چاہئے، محبوب رضوی صاحب نے جو کچھ بھی لکھا اسی نظریئے کی بنیاد پر لکھا اور کامیاب رہے۔

سید صاحب ۱۹۳۳ء سے دارالعلوم میں تھے، ۱۹۷۹ء میں انتقال ہوا دارالعلوم میں ان کی مدت ملازمت چھیالیس سال ہے، اس عرصے میں انھوں نے متعدد کارہائے نمایاں انجام دئے، ۱۹۳۶ء میں انھیں کتب خانۂ دارالعلوم کی ترتیب نو کا کام سپرد کیا گیا، انھوں نے ایک ایک کتاب کی ورق گردانی کی، اور اس کتاب کا اس فن کے رجسٹر میں مصنف کے نام، صفحات کی تعداد اور سن اشاعت کے ساتھ اندراج کیا جس فن کی وہ کتاب تھی، سید صاحب کا یہ بڑا اہم کارنامہ ہے جو تن تنہا انھوں نے محض اپنے ذوق سے انجام دیا تھا، بعد میں ان کتابوں کا انڈکس بھی انھوں نے حروف تہجی کے اعتبار سے ترتیب دیا، اور ہر کتاب کا الگ کارڈ بنا کر حروف تہجی کے اعتبار سے مخصوص خانوں میں رکھا، اب کسی بھی کتاب کی تلاش مشکل نہیں ہے، کارڈ پر الماری نمبر، کتاب نمبر، فن، اور زبان وغیرہ ہر چیز کے اندراجات موجود ہیں۔

تاریخ دارالعلوم سے پہلے وہ "تاریخ دیوبند" کے نام سے ایک عظیم علمی اور تصنیفی وتحقیقی کارنامہ انجام دے چکے تھے، اہل دیوبند کو پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ یہ بستی دارالعلوم دیوبند کے قیام سے پہلے بھی تاریخی اہمیت کی حامل رہی ہے، محبوب رضوی صاحب نے بڑی محنت اور جاں کاہی کے بعد یہ تاریخ مرتب کی، انھیں معلوم ہوا کہ کسی ہندو محلے میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے کا کنواں موجود ہے اور اس پر ایک تاریخی کتبہ لگا ہوا ہے جس میں حضرت سلیمان کا نام تو سمجھ میں آتا ہے، لیکن باقی عبارت سمجھ میں نہیں آتی، محبوب رضوی صاحب نے ہفتوں اس کی تحقیق پر صرف

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

کردئے، اسی دوران انھیں ایک مکان میں لگا ہوا لکڑی کا قدیم در بھی ملا جو قدامت کے لحاظ سے حضرت سلیمان علیہ السلام ہی کے دور کا ہے، انھوں نے یہ تمام باتیں اپنی تاریخ میں تفصیل کے ساتھ لکھی ہیں اور تاریخ دیوبند کے ایسے ایسے گوشے نمایاں کئے ہیں جو اب تک مخفی تھے، دیوبند میں کئی مساجد تاریخی اہمیت کی حامل ہیں اور ان کی قدامت ان پر لگے ہوئے کتبوں سے واضح ہوتی ہے، محبوب رضوی صاحب نے ان کتبوں کو پڑھنے میں بڑی محنت کی، باقاعدہ پیڑ بندھوائی، خود اس کے اوپر چڑھے، راقم السطور نے ایک مرتبہ جامع مسجد کے صحن میں پیڑ بندھی ہوئی دیکھی، کچھ دیر کے بعد محبوب صاحب تشریف لائے اور وہ پیڑ پر چڑھے، اور دیر تک جامع مسجد کے صحن میں بیچ کے در کے اوپر لگا ہوا کتبہ اوپر بیٹھ کر نقل کرتے رہے، جس شخص کے کام کرنے کا یہ انداز ہو اور جس شخص کا اس قدر تحقیقی مزاج ہو وہ غلط بات لکھ بھی نہیں سکتا، تاریخ دارالعلوم کی طرح تاریخ دیوبند بھی نہایت مستند، تحقیقی اور دلچسپ کتاب ہے، افسوس اب یہ کتاب بازار میں دستیاب نہیں ہے، عرصہ ہوا ناپید ہوگئی، بہ ظاہر اس کی طباعت کا کوئی امکان بھی نہیں ہے، کاش کوئی صاحب قلم اور تحقیقی مزاج رکھنے والا شخص کمر ہمت کس کر میدان میں آئے اور اس میں اضافہ کر کے اسے زیو طبع سے آراستہ کرادے، محبوب رضوی صاحب کی زندگی کا افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ وہ اولاد کی نعمت سے محروم رہے، اگر کوئی لڑکا یا لڑکی ہی ہوتی تو وہ ان کے علمی اور تحریری اثاثے ہی سنبھال کر رکھ لیتی، ان کے بے شمار مضامین رسالوں کی فائلوں میں دبے پڑے ہیں، ضرورت ہے ان کو یک جا کردیا جائے، مگر یہ کام کون کرے، تجارتی اعتبار سے تو یہ کام نفع بخش نہیں ہے، یوں بھی اس کام کے لئے وقت اور سرمایہ دونوں درکار ہیں، اور دور حاضر میں یہ دونوں چیزیں ایسی قیمتی بن گئی ہیں کہ کوئی شخص انھیں کسی دوسرے کو دینے کے لئے تیار نہیں ہے، اہلیہ محترمہ حیات ہیں انھیں شوہر کے غم سے کب فرصت ہے کہ وہ ادھر توجہ

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

دیں گی۔(۲)

ان دو کتابوں کے علاوہ بھی کچھ اور چیزیں محبوب رضوی صاحب کے قلم سے منظر عام پر آئی ہیں، ان کا ایک چھوٹا سا رسالہ ہے، ''تاریخ آب زمزم'' اُن کی زندگی میں پہلے رسائل ومجلّات میں چھپا پھر کتابی شکل میں شائع ہوا، اسی طرح مکتوبات نبوی بھی ان کی بہت ہی خاص اور مقبول تالیف ہے، اس کتاب میں انھوں نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام مکتوبات وفرامین اردو ترجموں کے ساتھ جمع کر دیئے ہیں، یہ کتاب ہندوستان و پاکستان کے کئی ناشر لگاتار چھاپ رہے ہیں، غالباً ۱۹۷۰ء سے پہلے وہ اپنی اہلیہ محترمہ کے ساتھ پانی کے جہاز سے حج کرنے کے لئے گئے، اس سفر حج میں انھوں نے اپنے دوست مولانا سید ازہر شاہ قیصر ایڈیٹر رسالہ دارالعلوم کو خطوط لکھے، یہ تمام خطوط ''مکاتیب حجاز'' کے نام سے یک جا چھاپ دئے گئے ہیں، یہ خطوط عام سے خطوط نہیں ہیں بلکہ ان میں مقامات مقدسہ کی تاریخ بھی ہے اور یہ بھی بتلایا گیا ہے کہ ان تاریخی مقامات کی موجودہ پوزیشن کیا ہے، حرمین شریفین کی زیارت کے درمیان ان کے جو جذبات رہے، اور جو وارفتگیِ شوق ان کے قلب ودماغ کا احاطہ کئے رہی اس کتاب میں اس کی عاشقانہ اور والہانہ عکاسی بھی ہے، بعض خطوط بے پناہ جذبات سے مغلوب ہوکر لکھے ہیں، ان کو پڑھنے والا کسی طرح اپنے اشکوں پر قابو نہیں پا سکتا۔

بعض رسائل میں ان کے کئی مفصل مقالات چھپے ہیں، ان میں سے بعض مقالات کئی کئی قسطوں پر مشتمل ہیں، وہ بھی کتابی شکل میں لائے جاسکتے ہیں، انھوں نے ۱۹۳۳ء سے مضمون نگاری شروع کی، روز نامہ الجمعیۃ کے سنڈے ایڈیشنوں میں ان کا ایک طویل سلسلۂ مضامین چھپا تھا جس کا عنوان تھا ''ہندوستان میں سیرت نبوی کا تصنیفی جائزہ'' اس

(۲) افسوس دو سال پہلے اہلیہ محترمہ بھی اللہ کو پیاری ہو چکی ہیں، بڑی نیک دل خاتون تھیں، عمر بھر بچوں خاص طور پر لڑکیوں کو تعلیم دیتی رہیں، ان کے شاگردوں کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہے جو ان کے لئے صدقۂ جاریہ ہیں۔

میں انھوں نے ہندوپاک میں سیرت نبوی پر شائع ہونے والی کتابوں کا بڑی دقّت نظری سے جائزہ لیا ہے، رسالہ دارالعلوم میں قرآن مجید کے تراجم کے تعارف پر مشتمل ایک طویل مضمون بھی کئی قسطوں میں شائع ہوا جسے مجلس معارف القرآن دارالعلوم دیوبند نے کتابی شکل میں بھی شائع کیا تھا، ۱۹۳۶ء میں کتب خانہ دارالعلوم دیوبند کی ترتیب نو کے درمیان انھوں نے رسالہ برہان دہلی میں ایک طویل سلسلۂ مضامین کے ذریعے دارالعلوم دیوبند کے کتب خانے میں موجود نادر مخطوطات کا تفصیلی تعارف بھی کرایا، اس مضمون کے ذریعے پہلی بار علمی دنیا کو پتہ چلا کہ دارالعلوم دیوبند میں سینکڑوں نادر ونایاب مخطوطے موجود ہیں جن سے اہل علم فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

سید محبوب رضوی کو بچوں اور بچیوں کی تعلیم سے بڑی دلچسپی تھی، انھوں نے اپنے گھر کا نام ہی تعلیم منزل رکھا، جو آج بھی اسی نام سے مشہور ہے، تعلیم منزل میں بچیوں کی دینی تعلیم کا ادارہ تعلیم گاہ نسواں قائم تھا، ایک زمانے میں بڑی تعداد میں شرفا کی بچیاں اس ادارے میں تعلیم حاصل کیا کرتی تھی، جامعہ دینیات اُردو دیوبند کی تأسیس اور تشکیل میں سید محبوب رضوی کا نمایاں کردار رہا ہے۔

محبوب رضوی صاحب ہماری والدہ کے حقیقی خالو تھے، اس رشتے سے وہ ہمارے نانا لگتے تھے مگر ہم انھیں خالو جان ہی کہا کرتے تھے، اس بنا پر ان کے گھر ہمارا خوب آنا جانا تھا اور وہ بھی بہ کثرت ہمارے گھر آیا کرتے تھے، مگر میں ہمیشہ دارالعلوم میں ان کے دفتر کے اوقات میں ان سے ملنا زیادہ پسند کرتا تھا، حیرت انگیز بات یہ ہے کہ مدتوں تک میں ان کے پاس آتا جاتا رہا مگر میں نے کبھی ان پر یہ ظاہر نہیں کیا کہ مجھے مضامین لکھنے کا شوق ہے، اور میں الٹے سیدھے مضمون لکھ کر اخباروں کو بھیجتا رہتا ہوں، مضامین چھپتے بھی تھے یقیناً ان کی نظروں سے گزرتے بھی رہے ہوں گے، مگر میں نے اپنا قلمی نام ندیم الواجدی اختیار کرلیا تھا جو گھریلو نام سے مختلف ہے، ایک دن

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

وہ مسجد چھتہ کے قریب سے گزر رہے تھے، کسی جگہ ہدی ڈائجسٹ کا ایک صفحہ پڑا ہوا ملا جو پھٹا ہوا تھا مگر اس پر مضمون کا عنوان ''تدوین فقہ اور امام ابوحنیفہ'' اور مضمون نگار کا نام ندیم الواجدی دیوبند باقی تھا، انھوں نے وہ کاغذ حفاظت کی غرض سے دیوار میں لگانے کے لئے اٹھالیا، مگر اس میں دیوبند دیکھ کر اپنے بیگ میں رکھ لیا، اتفاق سے اسی دن شام کو احقر کی حاضری ہوگئی، بیگ سے کاغذ نکال کر پوچھنے لگے یہ کون شخص ہے؟ اب میں جھوٹ کیا بولتا، شرما کر جواب دیا جی میں ہوں، میں بتلا نہیں سکتا کہ انھیں یہ سن کر کس قدر خوشی ہوئی، کتنا انھوں نے سراہا، کتنی ہمت افزائی کی، فرمانے لگے مطالعہ کیا کرو اور مضمون لکھ کر کسی کو دکھلایا کرو، پھر کہنے لگے میرے خیال سے مفتی ظفیر الدین مفتاحی کو دکھلا دیا کرو ان سے کہہ دوں گا، اپنی کم ہمتی اور بے حوصلگی کی وجہ سے میں مضامین پر کسی کی اصلاح تو نہ لے سکا لیکن ان کے حوصلہ افزا کلمات سے حوصلہ خوب ملا، بعد میں رسالہ دارالعلوم کے ایڈیٹر مولانا سید ازہر شاہ قیصر کے سامنے میرا ذکر کیا، بس انھوں نے تو فوراً طلب فرمالیا، اس طرح شاہ صاحب سے تعارف ہوا انھوں نے لکھنے پڑھنے کا کام لیا، یہ جو کچھ ٹوٹے پھوٹے مضامین لکھ لیتا ہوں یہ سب انہی حضرات کی ہمت افزائیوں اور کرم فرمائیوں کے نتیجے میں ہے، اللہ تعالیٰ ان حضرات کی قبر کو نور سے بھر دے اور ان کی بال بال مغفرت فرمائے، محبوب رضوی صاحب کی وفات کا سانحہ اجلاس صد سالہ سے ٹھیک ایک سال پہلے پیش آیا، اجلاس صد سالہ میں علمی کاموں کی تیاری کے لئے ایسے افراد کی سخت ضرورت تھی، اس وقت اگر کسی کتاب کی طلب تھی تو وہ تاریخ دارالعلوم اور تاریخ دیوبند تھی، خاص طور پر پاکستان کے مہمان تو اس کتاب پر ٹوٹے پڑ رہے تھے، دُعا ہے اللہ تعالیٰ ان کی کتابوں کو اور ان کی علمی تحریروں کو محبوب صاحب کے لئے صدقۂ جاریہ بنادے۔ آمین

علوم اسلامیہ کے تاج دار، اسلاف کی آخری یادگار

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمیؒ

ہائے افسوس خاندان قاسمی کا لعل شب چراغ، علوم قاسمی کا امین، مسلک دیوبند کا ترجمان، کاروان علم کا آخری سپہ سالار رخصت ہوا، اہل دیوبند ماتم کناں ہیں کہ ان کے گھر کی رونق رخصت ہوگئی، دارالعلوم کے دیوار ودر اُداس ہیں کہ ان کی رفعتوں کا محافظ چلا گیا، دنیا بھر میں پھیلے ہزاروں لاکھوں فضلائے دارالعلوم اور علمائے دیوبند گریہ کناں ہیں کہ ان کا میر کارواں بچھڑ گیا، آج ایک ایسی شخصیت ہمارے درمیان سے اٹھ کر چلی گئی کہ مدتوں اس کی یاد میں اشک غم بہائے جائیں گے اور دیر تک اس کی جدائی کا دُکھ محسوس کیا جائے گا، ہم نے اسے دُکھ بھی بہت دئے، ستایا بھی بہت، رُلایا بھی بہت، اب ہماری باری ہے، اب ہم روئیں، سینہ کوبی کریں، ماتم کریں، وہ تو جا چکا، کبھی نہ آنے کے لئے، یہ اس کا آخری سفر ہے، ہر مرتبہ ہمیں امید ہی نہیں یقین رہتا تھا کہ وہ آئے گا، آنے کے لئے گیا ہے، مگر اس بار اس کی آمد کا انتظار انتظار ہی رہے گا، راہ تکتے تکتے ہماری آنکھیں پتھرا جائیں گی مگر وہ مسافر راہِ شوق کبھی ہماری محفل میں واپس نہیں آئے گا، صرف یادیں رہ جائیں گی جو کسک بن کر ہمارے دلوں کو بے چین رکھیں گی۔

ہر دن کی طرح آج بھی صبح روشن ہوئی، آفتاب کچھ بلند ہوا، فضا گرم مگر نم آلود

تھی، ماحول پر اداسی طاری تھی، ہر شخص ایک دوسرے سے کہہ رہا تھا آج کچھ عجیب سا لگ رہا ہے، فضا خاموش خاموش سی ہے، ماحول اداس اداس سا ہے، کوئی نہیں جانتا تھا کہ ابھی کیا ہونے والا ہے، ہم کئی بار آستانۂ قاسمی کے سامنے سے گزرے، سب کچھ پُرسکون تھا، اچانک فرشتۂ اَجل پہنچا وراس نے ہماری صبح کی اداسیوں کا راز فاش کردیا، بیمار تھے، لیکن ایسے بھی نہیں کہ یوں اچانک رخصت ہوجائیں، اپنے گھر کے بیرونی ہال کمرے میں ایک پلنگ پر لیٹے ہوئے باتیں کررہے تھے، دیوبند کے ایک مشہور حکیم قریب بیٹھے تھے، تسبیح ہاتھ میں تھی، زبان پر وِرد جاری تھا، اچانک دونوں ہاتھ فضا میں اس طرح بلند کئے جیسے نماز کے لئے نیت باندھ رہے ہوں، کلمۂ شہادت پڑھا اور روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی اور اس طرح حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند ۱۰؍شوال ۱۴۰۳ھ، مطابق ۱۷؍جولائی ۱۹۸۳ء بہ روز اتوار بہ وقت گیارہ بجے دن ہم سے رخصت ہوکر اپنے خالق حقیقی سے جاملے، شام ہوتے ہوتے آستانۂ قاسمی کے آس پاس کی سڑکیں، کوچہ وبازار سب آنے والوں کے ہجوم سے لبریز ہوگئے، جنازہ عشا کے وقت اٹھنا تھا، وقت ہوا، ہزاروں کی بھیڑ نے اپنے کاندھوں پر نہایت ادب واحترام کے ساتھ جنازہ اٹھایا، ہر چہرہ حزن وملال کی تصویر ہر آنکھ اشک غم سے نم آلود، ہر دل جدائی کے دکھ سے بے چین، اسی حال میں سوگواروں کا یہ ہجوم اس مُشتِ استخواں کو کاندھوں پر اٹھائے دارالاہتمام کے نیچے سے گزرا، ہر شخص کی چشم تصور میں ساٹھ سال کا طویل دورِ اہتمام سما گیا، دلوں میں دُکھ درد کا احساس بڑھا، آنکھوں سے کچھ اور اشک ٹپکے اور جنازہ احاطہ مولسری میں نماز کے لئے رکھ دیا گیا حضرت مولانا محمد سالم قاسمی نے نماز جنازہ پڑھائی، میت کو لے کر اسی طرح واپس ہوئے جس طرح آئے تھے، حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی روح یقیناً اپنے قابل فخر پوتے کی آمد کے انتظار میں ہوگی، ہزاروں کی بھیڑ کو قبرستان قاسمی پہنچتے

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

پہنچتے دیر تو بہت لگی، بالآخر پہنچ گئی اور قابل فخر پوتے کو اپنے عظیم دادا کے پہلو میں لٹا کر بوجھل دل اور بوجھل قدموں سے اس طرح واپس آئی جیسے کوئی قافلہ اپنا تمام مال و متاع لٹا کر واپس آتا ہے۔

علم کی دنیا میں خاندان قاسمی کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے، اس خاندان کے جد امجد حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کا امت پر یہ احسان کتنا عظیم ہے کہ انھوں نے ۱۸۵۷ء کی شکست و ریخت کے بعد دین کی حفاظت اور اشاعت کے لئے دیوبند میں دارالعلوم قائم کیا، آج برصغیر ہندو پاک بنگلہ دیش اور دوسرے ممالک میں درس نظامی کے جو مدرسے ہیں وہ سب اسی چشمۂ صافی سے نکلی ہوئی چھوٹی بڑی نہریں ہیں، جو اپنے اپنے علاقوں میں تشنگان علوم نبوت کو سیراب کر رہی ہیں۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ بھی اسی خاندان کے ایک لائق فخر فرزند تھے، انھوں نے دارالعلوم دیوبند کے مہتمم اور ریاست دکن کے قاضی القضاۃ حضرت مولانا حافظ محمد احمدؒ کے گھر آنکھیں کھولیں، خاندان قاسمی کی نسبت کی بنا پر اکابر علما امت کی آنکھوں کا تارا بن کر رہے، بسم اللہ ہوئی تو دیوبند کی نام ور ہستیاں اس تقریب سعید میں شامل ہوئیں، حضرت شیخ الہندؒ کے والد بزرگوار حضرت مولانا ذوالفقار دیوبندیؒ نے بسم اللہ کرائی، حفظ قرآن اور تجوید کے لئے مشہور ماہر فن قاری عبدالوحید صاحب کو الہ آباد سے دیوبند بلوایا گیا، ابتدائی کتابیں بھی ان لوگوں نے پڑھائیں جن کا شمار دارالعلوم دیوبند کے اونچے اساتذہ میں ہوا کرتا تھا، خود فرماتے ہیں "تعلیمی زندگی میں مجھے وقت کے یگانۂ روزگار علما اور فضلائے کرام سے استفادے کا موقع ملا، حفظ قرآن اور تجوید قرأت میں مولانا قاری عبدالوحید صاحب، فارسی میں مولانا یٰسین صاحبؒ (والد ماجد مفتی محمد شفیع صاحب) فنون میں ابوالاساتذہ حضرت مولانا غلام رسول ہزارویؒ اور علوم کتاب وسنت میں علامۂ دہر، یگانۂ روزگار، استاذ اکبر مولانا

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

سید محمد انور شاہ کشمیریؒ، شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، مفتی اعظم حضرت مولانا عزیز الرحمٰن عثمانیؒ، فخر الہند حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ، حضرت مولانا سید میاں اصغر حسینؒ مولانا اعزاز علی امروہیؒ مولانا رسول خاں ہزارویؒ اور مولانا ابراہیم صاحب بلیاویؒ میرے اساتذہ ہیں'' جس بچے کے اس قدر نام ور اور قابل اساتذہ ہوں اس کی نیک بختی میں کیا شبہ ہوسکتا ہے، مہتمم کے بیٹے تھے بگڑ بھی سکتے تھے، مگر جب ہم ان کی تعلیم وتربیت کی تفصیلات پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ انھیں تراش خراش کر ہیرا بنانے کی کوشش کی جارہی تھی، جو لوگ یہ کوشش کر رہے تھے انھیں کامیابی ملی، ۱۳۳۷ھ میں دار العلوم دیوبند سے فارغ ہوتے ہوتے وہ ایک جیّد الاستعداد اور وسیع النظر عالم بن چکے تھے۔

فراغت کے بعد حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کی زندگی کئی محوروں پر گردش کرتی نظر آتی ہے، درس وتدریس، اہتمام، رشد و ہدایت، تصنیف وتالیف خطابت، یہ حیرت انگیز بات ہے کہ حضرت قاری صاحب نے ان تمام ذمہ داریوں کے ساتھ یکساں طور پر انصاف کیا جو انھیں سپرد کی گئیں۔

دورۂ حدیث شریف سے فراغت کے بعد دار العلوم دیوبند میں درس وتدریس کا آغاز کیا، اور درس نظامی کی مختلف کتابیں پڑھائیں، ایک عرصے تک مشکوۃ شریف متعلق رہی، ابن ماجہ، اور شمائل ترمذی بھی پڑھائی، حجۃ اللہ البالغہ کا درس دیا، حضرت مولانا فخر الدین مراد آبادیؒ کے انتقال کے بعد کچھ دنوں تک بخاری کے ابتدائی ابواب بھی پڑھائے، راقم السطور بخاری شریف کے ان ابواب میں حضرت کا شاگرد ہے، جن لوگوں نے حضرت سے پڑھا ہے وہ یہ اعتراف کئے بغیر نہیں رہتے کہ درس وتدریس میں بھی ان کی شان انفرادیت نمایاں نظر آتی تھی، ایک طرف تبحر علمی وسعت مطالعہ، دقّت نظر، دوسری طرف استحضار اور قوت حفظ، تیسری جانب مرتب اور

جامع انداز بیان، ان تمام چیزوں نے مل کر حضرت کے درس کو ممتاز بنا دیا تھا، مگر درس وتدریس میں یہ انہماک بہت زیادہ دیر تک برقرار نہ رہ سکا، اہتمام کی مصروفیات اوراس سے بڑھ کر ملک اور بیرون ملک کے اسفار نے مجبور کیا کہ وہ اپنے ذمے کوئی کتاب نہ رکھیں، البتہ حجۃ اللہ البالغہ کا سلسلہ کافی دنوں تک چلتا رہا، ایک تو وہ دارالعلوم کی طرف سے متعلق نہیں تھا، دوسرے اس کے لئے کسی خاص وقت کی تعیین بھی نہیں تھی اور نہ اسے کسی متعین نصاب تک پہنچانا ضروری تھا، حجۃ اللہ کا درس حضرت کا اپنا ذوق اورشوق تھا، اس درس کے دوران حضرت کے جو ہر کچھ اور نکھر کر سامنے آتے اپنے مخصوص انداز میں شریعت کے اسرار وحکم بیان فرماتے، حضرت کو ولی اللّٰہی علوم سے گہری مناسبت تھی، اور یہ مناسبت حجۃ اللہ کے درس میں اس طرح نمایاں ہوتی کہ شریعت کے کسی حکم کی مخفی حکمتوں پر گھنٹوں بولتے چلے جاتے، اسی لئے انھیں حکیم الاسلام کا لقب دیا گیا اور صحیح دیا گیا، حقیقت یہ ہے کہ حضرت کے علاوہ کسی دوسری شخصیت کے لئے یہ لقب جچتا ہی نہیں ہے۔

دوسری طرف جب حضرت کو مسند اہتمام پر فائز کیا جاتا ہے تو اس کی عظیم اورنازک ذمہ داریوں کو بھی وہ خوش اسلوبی کے ساتھ نمٹاتے نظر آتے ہیں، حضرت کے والد ماجد کی وفات کے بعد حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کو قائم مقام مہتمم بنا دیا گیا تھا، حضرت حافظ احمد صاحبؒ کی زندگی میں اگرچہ مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی نائب مہتمم تھے مگر مہتمم صاحب کے حیدرآباد میں مستقل قیام کی وجہ سے وہ عملاً مہتمم ہی کی حیثیت رکھتے تھے، ابتدا میں حضرت کو نائب مہتمم مقرر کیا گیا اور ۱۳۴۸ھ میں جب حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی انتقال فرما گئے آپ کو مہتمم بنا دیا گیا، ۱۳۴۸ھ سے ۱۴۰۳ھ تک کل پچپن سال ہوتے ہیں، اوراگر نیابت اہتمام کی مدت کو بھی شامل کرلیا جائے تو یہ مدت ساٹھ سال سے بھی زائد ہو جاتی ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

حضرت میں وہ اوصاف بدرجۂ اتم موجود تھے جو کسی ادارے کے روحِ رواں اور قائد میں ہونے چاہئیں، ساٹھ سال کی اس مدت میں دارالعلوم دیوبند نے ظاہری اور معنوی دونوں حیثیتوں سے ترقی کی ہے، بڑی بڑی عمارتیں اسی دوران میں تعمیر ہوئیں مدرسین، ملازمین اور طلبہ کی تعداد بڑھی، کئی نئے شعبے قائم کئے گئے، طبیہ کالج وجود میں آیا، اس سے بڑھ کر یہ کہ دارالعلوم دیوبند کا تعارف ملک اور بیرون میں ہر جگہ ایک ایسے تعلیمی ادارے کی حیثیت سے سامنے آیا جو اسلاف کے منہاج پر دین کی حفاظت اور اشاعت کے لئے کوشاں ہو، یہ شہرت اس وقت اپنے بام عروج پر پہنچی جب مارچ ۱۹۸۰ء میں دارالعلوم دیوبند نے اپنا سو سالہ اجلاس منعقد کیا، دنیا کے گوشے گوشے سے دارالعلوم دیوبند کے عشاق دیوبند پہنچے، بس یہی مقبولیت اور عقیدت نظر میں آ گئی بلکہ کسی کی نظر کھا گئی اور دارالعلوم دیوبند کے مہتمم کے خلاف ہنگامہ برپا ہو گیا، ۱۳۴۳ھ میں بھی جب حضرت کو نائب مہتمم بنایا گیا تھا اس وقت بھی مخالفتوں کا طوفان برپا ہوا تھا، ۱۹۸۰ء کے بعد پھر یہ طوفان اٹھا، لیکن اس طرح کے طوفان خدمات کے اس طویل سلسلے پر خاک نہیں ڈال سکتے جس سے تاریخ دارالعلوم کا صفحہ صفحہ روشن ہے، جلد یا بہ دیر لوگوں کو حضرت کے زمانۂ اہتمام کی ترقیات کا اعتراف کرنا ہی پڑے گا۔

تصوف و سلوک کے میدان میں حضرت نے کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں آج دنیا بھر میں حضرت کے دستِ حق پر بیعت کرنے والوں کی تعداد لاکھوں سے متجاوز ہے، اس سلسلۂ بیعت سے جہاں سلسۂ چشتیہ تھانویہ کو فروغ ملا ہے وہاں دارالعلوم کا حلقۂ تعارف بھی بڑھا ہے، اور اس کے معاونین کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا ہے، ابتدا میں حضرت چاہتے تھے کہ حضرت شیخ الہندؒ سے بیعت ہوں، کیوں کہ حضرت کے بچپن میں یہی ایک شخصیت ایسی تھی جو مرجع علما بنی ہوئی تھی، حضرت نانوتویؒ کے بعد تمام بڑے اکابر اسی آستانے پر حاضری دیا کرتے تھے، خود حضرت کے والد

بزرگوار حافظ محمد احمد صاحب بھی عصر کے بعد والی مجلس میں پابندی کے ساتھ شرکت فرمایا تھا، ان مجلسوں میں حضرت بھی اپنے والد بزرگوار کے پہلو میں بیٹھے رہتے، اس مسلسل حاضری نے اور حضرت شیخ الہند کی بے پایاں شفقت ومحبت نے حضرت کے دل میں شیخ مجلس کے لئے محبت اور عقیدت کے جذبات پیدا کردئے تھے، دل چاہتا تھا کہ بیعت ہوجائیں کئی مرتبہ درخواست بھی پیش کی، حضرت شیخ الہند نے ہر مرتبہ ایک ہی جواب دیا ابھی بچے ہو، فارغ ہوجاؤ پھر کریں گے، اسی دوران حضرت شیخ الہند حج کے لئے تشریف لے گئے اور گرفتار کرکے مالٹا بھیجدئے گئے، واپس تشریف لائے تو اگرچہ بچے بڑے ہوچکے تھے اور حضرت فارغ بھی ہوگئے تھے بلکہ درس وتدریس کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا تھا مگر خود حضرت شیخ الہند کی مصروفیات بڑھ گئیں، تحریک خلافت اور تحریک آزادی کی مسلسل مصروفیتوں نے حضرت کو دوبارہ درخواست پیش کرنے کی مہلت ہی نہیں دی یا مہلت تو ملی مگر مصروفیات دیکھ کر ہمت نہیں ہوئی ایک مرتبہ حاضر تھے، کچھ فرصت محسوس ہوئی، حضرت شیخ الہند متوجہ بھی تھے موقع غنیمت سمجھ کر بیعت کرنے کی درخواست پیش کردی، حضرت نے بیعت فرمالیا اور چند تسبیحات تلقین کیں، اس واقعے کے بعد حضرت شیخ الہند صرف ڈیڑھ برس حیات رہے، اوراس دوران بھی زیادہ وقت دہلی میں مقیم رہے اور وہیں وفات بھی پائی۔

کیوں کہ دل میں تڑپ تھی، جستجو تھی، یہ تلاش اور جستجو تھانہ بھون لے گئی جہاں حضرت تھانویؒ باطنی تربیت اور کردار سازی کا سلسلہ قائم کئے ہوئے تھے، اس طرح حضرت اپنی جستجو کے سفر میں منزل تک پہنچ گئے، حضرت تھانویؒ نے خاندانی نسبت اور تعلق سے بڑی توجہ فرمائی، اور خصوصی تربیت کا سلسلہ شروع کیا جو ۱۳۵۰ھ میں اجازت بیعت اور خلافت پر منتہی ہوا، حضرت نے لکھا ہے کہ میری زندگی کی ساخت پرداخت میں حکیم الامت حضرت تھانویؒ کا بڑا حصہ ہے، ان کی محبت وبابرکت اور حکیمانہ

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

انداز تربیت نے بڑے سبق سکھلائے، اسی زمانۂ تربیت کا ایک واقعہ حضرت نے خود اپنے قلم سے تحریر فرمایا ہے کہ اہتمام دارالعلوم کے زمانے میں میرے دل میں انتہائی زیادہ تکبر پیدا ہوا، میں نے حضرت حکیم الامتؒ کی خدمت میں لکھا کہ میں تکبر میں مبتلا ہو چکا ہوں کوئی علاج تجویز فرمایا جائے، جواب آیا اہتمام کو چھوڑ کر ابھی تھانہ بھون آ جاؤ میں حاضر خدمت ہوا، فرمایا خانقاہ میں رہو اور آپ کے ذمے یہ کام ہے کہ خانقاہ کی مسجد کے نمازیوں کے جوتے سیدھے کرو، حضرت لکھتے ہیں کہ ”میں حضرت کے فرمانے سے نمازیوں کے جوتے تو سیدھے کرنے لگا لیکن جو اچھے جوتے ہوتے انھیں سیدھا کر دیتا، اور جو پرانے اور بوسیدہ ہوتے انھیں چھوڑ دیتا، حضرت نے ایک دن دیکھ لیا اور فرمایا تکبر اتنا بڑا مرض ہے کہ یہ اہل اللہ سے بھی بڑی مشکل سے جاتا ہے اور سب سے آخر میں جاتا ہے، اس نے کئی آدمیوں کو ذلیل کیا ہے اور شیطان کو بھی لعنت کے قید خانے میں گرفتار کیا ہے، حضرت کے یہ الفاظ سن کر میں مر مٹا یعنی ایسی فنائیت حاصل ہوئی کہ اپنی فنائیت سے بھی بے خبری ہوگئی۔“

جن لوگوں نے حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کو دیکھا ہے وہ گواہی دیں گے کہ حضرت کے مزاج میں اس قدر انکسار اور تواضع تھا کہ چھوٹے سے چھوٹے شخص کے لئے بھی بچھے جاتے تھے، کوئی کہیں بھی روک کر بات کر لیتا، بلا تکلف اہتمام میں پہنچ جاتا، گھر پر جا کر آواز دے لیتا، ایک طالب علم کی حیثیت سے ہم بھی بارہا اس تجربے سے گزرے ہیں، حضرت نے نہات حلیمی اور شفقت سے ہماری باتیں سنی ہیں، یقیناً ہمارا انداز تخاطب ناگوار بھی گزرتا ہوگا لیکن حضرت نے کبھی برا نہیں مانا، کبھی ناگواری کا اظہار نہیں فرمایا، کبھی حضرت کی پیشانی شکن آلود نہیں ہوئی۔

حضرت مجموعۂ صفات وکمالات تھے، ابھی تک کسی مدرسے کو ایسا مہتمم نصیب نہیں ہوسکا جو بہ یک وقت اتنے کمالات کا مجموعہ ہو، ان کمالات میں سب سے بڑا

کمال خطابت کا تھا اگر یہ کہا جائے کہ ماضی قریب میں بھی ان جیسا خطیب کوئی دوسرا پیدا نہیں ہوا تو غلط نہ ہوگا، ایک ہی موضوع پر گھنٹوں کلام فرماتے، پھر کلام بھی نہایت جامع اور مرتب، الفاظ بھی ناپ تول کر بولتے، پوری تقریر میں عالمانہ شان جھلکتی تھی، ایک مرتبہ سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر بولنا شروع کیا تو رات سے صبح ہوگئی، مؤذن نے اللہ اکبر کہا تو حضرت کو بھی وقت گزرنے کا احساس ہوا اور سننے والے بھی محویت اور استغراق سے باہر آئے، دیوبند میں رہنے کی برکت سے ہم نے حضرت کی بے شمار تقریریں سنی ہیں، اور کئی مرتبہ حضرت نے ہماری دعوت پر تشریف لاکر تقریریں بھی فرمائی ہیں، ایک ایسے ہی موقع پر ہم طلبہ نے حضرت کو جلسے میں شرکت فرما کر تقریر کی زحمت دینی چاہی، حضرت نے معذرت کی، اور سفر کا عذر فرمایا، ہم اصرار کرتے رہے، ہم نے عرض کیا حضرت پانچ منٹ تشریف لاکر عذر ہی بیان فرمادیں، مقصد مخالف طلبہ پر رعب جمانا اور جگ ہنسائی سے بچنا تھا، حضرت نے ہماری درخواست قبول فرمائی دارالحدیث میں تشریف لائے، اور عذر واعتذار پر مشتمل واقعات اس قدر بسیط تقریر فرمائی کہ ہمارا پروگرام بھی رل گیا، اس تقریر میں حضرت نے عذر قبول کرنے کے فضائل اور واقعات اور عذر پر مشتمل اشعار اتنی کثرت سے سنائے کہ حضرت کو احساس ہی نہ ہوا کہ وہ صرف پانچ منٹ کے لئے تشریف لائے تھے اور اب دو گھنٹے گزر چکے ہیں حضرت کو ہر موضوع پر برجستہ تقریر کرنے میں ید طولیٰ حاصل تھا، الفاظ تو الفاظ علوم اور معانی بھی ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے، ایک مرتبہ علی گڑھ تشریف لے گئے، طلبہ نے درخواست کی کہ سائنس اور اسلام پر خطاب فرمائیں، حضرت نے اس موضوع پر اس قدر طویل اور بصیرت افروز خطاب فرمایا کہ بڑے بڑے پروفیسر حضرات بھی انگشت بہ دنداں رہ گئے، یک مرتبہ دیوبند میں بجلی کا زبردست بحران پیدا ہوا، ہفتوں بجلی نہیں آئی، شہر کے ہندو مسلمانوں نے ریلوے اسٹیشن کے قریب بجلی کے دفتر کے

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

سامنے بھوک ہڑتال شروع کردی، حضرت سے اصرار کیا گیا کہ آپ بھی کچھ دیر کے لیے تشریف لے چلیں، حضرت تشریف لے گئے، بیان کی فرمائش ہوئی حضرت نے آیت کریمہ: يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ أَبْصَارَهُمْ (البقرة: ٢٠) پڑھ کر بجلی کے فوائد مضار، ضرورت وغیرہ پر اس قدر تفصیل سے روشنی ڈالی لگتا تھا ابھی اس موضوع پر مطالعہ کرکے آئے ہیں، اہم سے اہم موضوعات پر بلا تکلف کئی گھنٹے تقریر کرلینا حضرت کے لئے کوئی دشوار کام نہیں تھا، حیرت تو اس وقت ہوتی تھی جب اچانک ہی کسی موضوع پر خطاب کی درخواست کی جاتی اور حضرت اس موضوع کا بھی حق ادا فرماتے، افسوس حضرت کے تمام خطبات جمع نہیں کئے جاسکے ورنہ یہ علمی ذخیرہ بے شمار جلدوں پر مشتمل ہوتا۔

مسلسل اسفار، اسفار کے دوران جلسے اور جلسوں میں تقریریں یہ حضرت کی زندگی کا اہم مشغلہ تھا، لیکن اس مصروفیت کے باوجود تصنیفی کام بھی کیا، یہ بھی کچھ کم حیرت انگیز بات نہیں ہے، آج مختلف موضوعات پر حضرت کی کم وبیش سو تصانیف موجود ہیں ان کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہوسکتی تھی اگر حضرت کو اہتمام کے ہنگاموں سے دور رہ کر یک سوئی کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملتا، معلوم ہوا ہے کہ حضرت کے کچھ غیر مطبوعہ مسوّدات بھی ہیں انھیں بھی زیور طبع سے آراستہ ہونا چاہئے، اپنی زندگی کے آخری ایّام میں حضرت ایک بیش قیمت موضوع پر تصنیفی کام میں مشغول تھے، معلوم نہیں وہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچایا ہنوز ادھورا ہے۔(۱)

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا قیام بھی حضرت کے زریں کارناموں میں سے ایک ہے، حکومت ہند نے متبنّٰی بل کے ذریعے شریعت میں مداخلت کا سلسلہ شروع کیا

(۱) حضرت وفات سے پہلے یہ کام پورا فرماچکے تھے، مقامات مقدسہ کے نام سے حضرت کی آخری تصنیف منظر عام پر آچکی ہے۔

تھا، حضرت نے محسوس کیا کہ اگر اب کچھ نہ کیا گیا تو آئندہ حکومت کو مداخلت فی الدین سے روکنا مشکل ہو جائے گا، اس موضوع پر ابتدائی مشاورت کے بعد ۱۹۷۲ء میں ہر مکتب فکر اور مسلک کے مقتدر علما، زعما، ارباب سیاست بمبئی میں جمع ہوئے اور سب نے متحد ہو کر مسلم پرسنل لا بورڈ قائم کیا، جس کی صدارت کے لئے حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب کا اسم گرامی تجویز ہوا، جس کی ہر مکتب فکر کے لوگوں نے تائید کی، یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت کے کمالات کا اعتراف صرف اپنے ہی نہیں کرتے تھے بلکہ غیر بھی اس اعتراف پر مجبور تھے۔

افسوس ہم نے اس ہستی کی قدر نہیں کی، عمر کے آخری پڑاؤ پر اس بزرگ شخصیت کے ساتھ جو سلوک کیا گیا وہ انتہائی افسوس ناک اور تکلیف دہ ہے، کاش انہیں منصب اہتمام سے سبک دوش نہ کیا جاتا، ایک طرف تو بریلوی، شیعہ بہائی، اور دوسرے فرقے انھیں اپنا قائد تسلیم کر رہے ہیں دوسری طرف ہم ان سے قیادت چھین رہے ہیں، کس قدر عجیب بات ہے، لیکن داد دیجئے اس کوہ صبر و استقامت کو کہ اتنا بڑا واقعہ گزر گیا، ساٹھ سال کا اقتدار اور اختیار ہاتھ سے نکل گیا مگر زبان سے اف تک نہ کی، اگر زبان سے کوئی جملہ نکلا تو یہ نکلا دار العلوم اللہ کی امانت ہے، پہلے یہ امانت ہمارے پاس تھی اب کسی اور کے پاس چلی گئی ہے اس میں پریشانی کی کیا بات ہے، کوئی دوسرا ہوتا تو شاید اس مصیبت سے اس کا سینہ شق ہو جاتا، اور دل و جگر چھلنی چھلنی ہو جاتے لیکن اللہ والے ہر حال میں تسلیم و رضا کا پیکر بن کر رہتے ہیں اور صبر و شکر کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں، حضرت قاری صاحب اللہ والے تھے انھوں نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا کہ نالہ و شیون اہل اللہ کا طریقہ نہیں ہے، صبر و استقامت اللہ والوں کا شیوہ ہے، حضرت مولانا منظور نعمانیؒ کے ایک مکتوب کے جواب میں جو شاید انھوں نے معافی تلافی کے سلسلے میں لکھا تھا حضرت نے تحریر فرمایا تھا ’’ دار العلوم دیوبند صرف ایک مدرسہ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی امانت ہے

آج اس کا کیا حال ہے ہم اللہ کے سامنے مسئول ہیں، یہ ہے وہ سوز جس سے میرا جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا ہے، ڈاکٹر کہتے ہیں کہ کوئی مرض نہیں، اور حال یہ کہ دوسروں کے ہاتھوں میں ہوں، نہ اپنی ذات کا غم ہے نہ اپنے عزیزوں کا غم بلکہ غم دارالعلوم کا ہے، آں محترم نے معافی کے الفاظ لکھے ہیں آں محترم سے زیادہ کون جانتا ہے کہ میں نے اپنے چھوٹوں کو بھی خطا وار نہیں سمجھا کہ ان کی زبان پر معافی کی بات آئے، اس دن سے جس نے دارالعلوم اور جماعت دارالعلوم کو یہ دن دکھلائے میں نے تین الفاظ اختیار کر لئے ہیں: السکوت والصبر والغنیٰ ان ہی تینوں پر اب بھی قائم ہوں''

اس خط پر ۵/۷/۱۹۸۳ء کی تاریخ درج ہے گویا یہ خط انتقال سے بارہ دن قبل لکھا گیا ہے، انتقال کے بعد سب سے پہلا تعزیتی اجلاس انتقال کے دوسرے ہی دن دیوبند میں منعقد ہوا، کم از کم پچاس ہزار آدمی اس جلسے میں شریک تھے، احقر نے اس اجلاس کی نظامت کی، اس موقع پر راقم السطور نے حضرت کو جن الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا تھا ان کو مضمون کے تتمے کے طور پر یہاں نقل کرتا ہوں! کل قبرستان قاسمی میں مرقد قاسم نانوتویؒ کے برابر میں ہم نے جس شخصیت کو دفن کیا ہے ہماری سوسالہ تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی، وہ پیکر حسن و جمال، سراپا اخلاص وللّٰہیت، سرچشمۂ علم و معرفت منبع رشد و ہدایت، گنجینۂ انوار و تجلیات تھا، اس کی کشادہ پیشانی کی ننھی منی لکیروں میں دارالعلوم کی پوری تاریخ اور اس کی روایات محو خواب تھیں، آج ہم اس نورانی وجود کے ساتھ اس تاریخ کو بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زمین کے سپرد کر آئے ہیں۔''

اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے اور امت کو ان جیسی جامع کمالات شخصیت دوبارہ نصیب فرمائے۔

❁❁❁

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

دارالعلوم دیوبند کی تاریخ کا قیمتی اثاثہ

حکیم الاسلام قاری محمد طیب قاسمیؒ

آپ کسی ایک شخص کا تصور کیجئے جس نے اپنی زندگی کے قیمتی ماہ و سال کسی ادارے کی خدمت میں صرف کر دیئے ہوں، اس کو اپنے خونِ جگر سے سینچنے اور پروان چڑھانے میں جس شخص نے نہ اپنی جوانی کے خوب صورت لمحے بچا کر رکھے ہوں اور نہ بڑھاپے کے قیمتی اوقات کی پرواہ کی ہو، بلکہ ساٹھ برس کی طویل زندگی کا ایک ایک لمحہ اپنے محبوب ادارے کی زلفیں سنوارنے میں لگا دیا ہو اور جب اس نے اپنی زندگی کی اس منزل پر قدم رکھا ہو جہاں پہنچ کر جسم نحیف و ناتواں اور قویٰ مضمحل و کم زور ہو جاتے ہیں اور محبوب سے انسیت اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے اچانک کچھ لوگ اٹھتے ہیں اور اسے اس کے محبوب سے جدا کر دیتے ہیں، اس تصور کے بعد آپ اپنے ذہن کے کینوس پر جو پیکر دیکھیں گے وہ ایسے شخص کا ہوگا جسے لوگ حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب قاسمیؒ کے نام سے جانتے ہیں۔

میں پرانے لوگوں کی بات نہیں کرتا البتہ دارالعلوم دیوبند کے نوجوان علما اور طلبہ کے متعلق پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ کے صرف نام سے واقف ہیں خدمات سے واقف نہیں، ہوسکتا ہے وہ یہ جانتے ہوں کہ اس نام کی ایک شخصیت دارالعلوم دیوبند کے مسند اہتمام پر فائز رہی

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

ہے، لیکن وہ یہ نہیں جانتے کہ دارالعلوم بنانے میں اس شخصیت کی شبانہ رروز محنت اور جدوجہد کو کتنا دخل ہے؟ وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ اس شخص کی زندگی کے ساٹھ قیمتی سال اسی شجرۂ طوبیٰ کی آب یاری کرنے میں گزرے ہیں یہ مدت کچھ کم نہیں ہوتی، نصف صدی سے زیادہ کا طویل سفر، تھکا دینے والا اور مضمحل کردینے والا لیکن قاری محمد طیب صاحبؒ کے دل میں جذبۂ خدمت کا جو شعلہ اس وقت بھڑکا تھا جب آتش جوان تھا، بڑھاپے کی دہلیز پر پہنچ کر بھی وہ شعلہ سرد نہ ہوسکا ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ خواہ وہ سفر میں ہوں یا حضر میں دارالعلوم دیوبند کے لیے وقف تھا، آج ملک میں ہزاروں مدارس ہیں، ان میں بہت سے مدرسے اب ملک گیر سطح پر مشہور ہیں اور بعض کی شہرت ملک کی سرحدوں سے تجاوز کرچکی ہے لیکن شاید ہی کسی مدرسے کو ایسا مہتمم میسر آیا ہو جو ظاہر و باطن کی بے شمار خوبیوں سے مالا مال ہو، ظاہری وجاہت ایسی کہ دل خود بہ خود ان کی طرف مائل ہو، دیدار کے لیے آنکھیں سراپا شوق بن جائیں، باطنی خوبیوں کا دلکش مرقع، فراست، تدبر ہوش مندی خیر خواہی، اخلاص، دیانت، امانت، تقویٰ، علم، فضل کون سی خوبی ایسی ہے جو ان میں نہیں تھی، بے مثال مقرر، قادر الکلام شاعر، بہترین مصنف، اکابر کے علوم خاص طور پر حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے علوم و معارف کے شارح اور ترجمان۔

مدارس کی تاریخ میں بے شمار مہتممین کے حالات محفوظ کیے جاچکے ہیں، کیا دارالعلوم دیوبند کے علاوہ کوئی مدرسہ یہ دعویٰ کرسکتا ہے کہ اس کے پاس قاری محمد طیبؒ جیسی قدر آور شخصیت موجود رہی تھی یا اب موجود ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ لفظ ''مہتمم صاحب'' اپنے وسیع معنی و مفہوم کے ساتھ صرف اسی ایک شخصیت کے لیے اچھا لگتا ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے منصب اہتمام صرف قاری محمد طیب صاحبؒ کے لیے تخلیق کیا گیا ہو اور لفظ مہتمم صرف اسی شخصیت کی پہچان کے لیے وضع کیا گیا ہو، سچ

بات تو یہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند قاری محمد طیب صاحبؒ کی ذات میں اس طرح سما گیا تھا کہ ہم اسے علاحدہ کر کے دیکھ ہی نہیں سکتے تھے، دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم بن چکے تھے، دونوں ایک دوسرے کی شناخت تھے، یہ ممکن نہیں تھا کہ آپ کسی ایسے دارالعلوم کا تصور کریں جس کے مہتمم قاری محمد طیب صاحبؒ نہ ہوں اور نہ یہ ممکن تھا کہ کسی ایسے قاری محمد طیب صاحبؒ کا تصور کیا جائے جو دارالعلوم کے مہتمم نہ ہوں مگر یہ ناممکن ممکن ہوا، کس طرح ہوا؟ ہم فی الحال اس کے جواب سے پہلو تہی کرنا چاہتے ہیں، کسی دشمن نے انہیں ان کے منصب سے معزول نہیں کیا اپنے ہی لوگ تھے جنہوں نے نہ ان کی خدمات کی قدر کی، نہ وہ ان کے فضل وکمال سے متأثر ہوئے، نہ ان کی پیرانہ سالی اور ضعف نے ان کے دلوں کو نرم کیا، ہوسکتا ہے بہ حیثیت مہتمم ان کا کوئی فیصلہ غلط ہو رہا ہے، بہت ممکن ہے ان کے کسی اقدام سے کسی کی بالادستی متأثر ہوئی ہو مگر معزولی واحد حل نہیں تھا، کاش یہ ناگوار صورت حال پیش نہ آتی، وہ تمام زندگی اس ادارے کے سربراہ بن کر رہے، کاش وہ اسی حالت میں دنیا سے رخصت بھی ہوتے۔

دارالعلوم دیوبند کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس کے پہلو سے بے شمار شخصیتوں نے جنم لیا ہے، ڈیڑھ سو سال کے اس سفر میں ان گنت لوگ اس سرچشمۂ علم وعمل سے سیراب ہوئے اور آسمان رشد وہدایت پر آفتاب ماہتاب بن کر چمکے، آج دنیا میں جہاں کہیں بھی قرآن وسنت کی خوشبو پھیل رہی ہے اس میں دارالعلوم دیوبند کے خوب صورت پھولوں کی دل آویز مہک بھی شامل ہے، جن شخصیتوں نے دارالعلوم کی تاریخ بنائی ہے، اس کا قد اونچا کیا ہے، اس کو اعتبار اور وقار عطا کیا ہے، ان کی فہرست بڑی طویل ہے، حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ اسی سلسلے کی ایک سنہری کڑی تھے انہوں نے دارالعلوم دیوبند کی صرف انتظامی سطح پر ہی خدمت نہیں کی ہے بلکہ اس کا پیغام عام کرنے کی خاطر اپنی عمر کا بڑا حصہ زمین کے فاصلے طے کرنے میں بھی صرف کیا

ہے، ہندوستان کا شاید ہی کوئی شہر یا کوئی قصبہ ایسا ہو جہاں قاری صاحبؒ نے اللہ کے بندوں تک اللہ کا دین نہ پہنچایا ہو، ہندوستان سے باہر بھی بہت سے ملکوں میں ان کی آواز گونجی ہے، نہ جانے اللہ کے کتنے بندے یہ آواز سن کر غفلت کی نیند سے بیدار ہوئے، کتنے لوگوں نے ان کی کشادہ پیشانی کی گہری لکیروں میں حق مضمر پایا اور اسے اپنا کر سچے پکے مسلمان بن گئے، ان کی آواز کا سفر ساٹھ برس سے زیادہ عرصے تک جاری رہا، اس عرصے میں انہوں نے ہزاروں تقریریں کی ہوں گی، ہزاروں بار اپنی سحر طراز آواز سے سننے والوں کو مسحور کیا ہوگا، کیا ماضی قریب میں اس بے مثال خدمت کی نظیر ممکن ہے؟ اگر تمام تقریریں لکھ لی جاتیں یا انہیں مرتب کرلیا جاتا تو ان کی تعداد ہزاروں سے تجاوز کر جاتی اور بے شمار ضخیم جلدیں بھی اپنی تنگ دامانی کا گلہ کرتی نظر آتیں۔

اس طویل سلسلۂ سفر کے باوجود انہوں نے تصنیف وتالیف کے میدان میں بھی اپنا وجود منوایا ہے اور ان کے قلم سے کچھ ایسی کتابیں معرض وجود میں آئی ہیں جو اپنے موضوع پر حرف آخر سمجھی جاتی ہیں، جیسے التشبہ فی الاسلام، فطری حکومت، دارالعلوم دیوبند کا مسلکی مزاج اور آخری تصنیف جو انتقال کے بعد شائع ہوئی ”مقامات مقدسہ“ میرا تأثر یہ ہے کہ اگر وہ اس آخری کتاب کے علاوہ کچھ نہ لکھتے اور صرف یہی ایک شاہ کار تصنیف ان کی پہلی اور آخری تصنیف ہوتی تب بھی مصنفین کی فہرست میں ان کا نام نمایاں طور پر لکھا جاتا۔

بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ قاری محمد طیب صاحبؒ نے اپنے اہتمام کے ابتدائی دور میں درس وتدریس کی خدمت بھی انجام دی ہے، دارالعلوم دیوبند میں وہ مشکوٰۃ شریف کا درس دیا کرتے تھے اور یہ درس طلبہ میں بے حد مقبول تھا، علم اسرار شریعت سے طبعی مناسبت کی بنا پر انہوں نے برسہا برس تک حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی مشہور کتاب ”حجۃ اللہ البالغۃ“ کا درس بھی دیا ہے، دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

حضرت مولانا فخر الدینؒ کی وفات کے بعد مجلس شوریٰ نے بخاری شریف کے ابتدائی ابواب کی تدریس مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کے سپرد کی تھی، راقم السطور کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس نے دورۂ حدیث شریف کے ایک طالب علم کی حیثیت سے آپ کے درس بخاری میں شرکت کی ہے، افسوس! اہتمام کی گوناں گوں مصروفیات اور مسلسل اسفار کے باعث آپ درس وتدریس کی یہ ذمہ داری پوری دل جمعی کے ساتھ انجام نہ دے سکے اور حضرت مولانا شریف حسنؒ سابق شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند نے ان ابواب کی تکمیل فرمائی۔

حکیم الاسلام قاری محمد طیبؒ کے یہاں بیعت وارشاد اور باطنی تربیت کا بھی سلسلہ تھا، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی توجہات نے قاری محمد طیب صاحبؒ کے باطنی کمالات کو آئینہ بنادیا تھا، عرفان وسلوک کی پُر خار وادی میں ان کے قدم مسلسل آگے بڑھتے رہے، ہزاروں لوگوں نے ان کے دست حق پر بیعت کی، ان کے بہت سے خلفاء آج بھی ان کے اس سلسلۂ بیعت وارشاد کو دراز کرنے میں مصروف ہیں۔

قاری محمد طیب صاحبؒ نے بے شمار مواقع پر ملک وملت کی قیادت کے فرائض بھی انجام دیئے ہیں، ملک کی تقسیم کے بعد جب ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک مضبوط قیادت، مؤثر رہنمائی اور معتدل فکر کی ضرورت تھی اس وقت جمعیۃ علمائے ہند کے اسٹیج سے ان کے صدارتی خطبات ملی سیاست کا رخ موڑنے اور اس کا مزاج تبدیل کرنے میں بڑے مؤثر رہے ہیں، مسلم پرسنل لا بورڈ کی تاسیس اور اس کے ذریعے ہندوستان کے مختلف الفکر علما اور دانشوروں کی قیادت قاری محمد طیب صاحبؒ کی خدمات کا ایک روشن باب ہے، جسے ہماری ملی تاریخ کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔

یہ سوانحی مضمون نہیں ہے اس میں قاری محمد طیب صاحب کے حالات زندگی کا تعارف اور ان کے کارناموں کا تفصیلی ذکر ممکن نہیں، جو کچھ کم سے کم الفاظ میں لکھا گیا

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

ہے وہ محض اپنے نوجوان علما اور طلبہ کو یہ بتلانے کے لیے لکھا گیا ہے کہ آپ جس ادارے میں زیر تعلیم ہیں یا آپ نے جس ادارے میں اپنی زندگی کے قیمتی ماہ سال گزارے ہیں آج سے بیس سال پہلے یہاں ایک ایسی شخصیت مسند اہتمام پر جلوہ افروز تھی جسے ہم نے قصۂ پارینہ بنادیا ہے۔

شخصیتیں اداروں کی تاریخ کا قیمتی اثاثہ ہوتی ہیں، ان کی زندگی ایک روشن چراغ کی طرح ہوتی ہے جس کے اجالوں میں اداروں کا سفر جاری رہتا ہے، مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ دارالعلوم دیوبند کا ایک قیمتی اثاثہ تھے، اس قیمتی اثاثے کی حفاظت کرنا ہم سب کی ذمہ داری ہے، آج سے بیس سال پہلے وہ دارالعلوم دیوبند سے علیٰحدہ کردیئے گئے تھے وجہ کچھ بھی رہی ہو، لیکن کیا ان کی خدمات بھی ان کی جدوجہد اور قربانی بھی ان کے ساتھ رخصت ہوگئی تھی پھر کیا وجہ ہے کہ ہم انہیں بیس سال سے مسلسل نظرانداز کرتے چلے آرہے ہیں؟

ان کا انتقال ہوا، مدارس اسلامیہ میں قرآن خوانی، اردو رسائل میں چند مضامین اور تعزیتی پیغامات کی ترسیل سے زیادہ کچھ ہوا؟ دارالعلوم دیوبند کا فرض تھا کہ وہ ان کے حالات اور خدمات پر مشتمل اپنے عربی اور اردو رسالوں کے خصوصی نمبر شائع کرتا، ان کی یاد میں بڑے پیمانے پر سیمینار منعقد کیا جاتا، جس میں ملک کے اربابِ قلم اور اصحابِ فکرونظر سے مقالات لکھوا کر پیش کیے جاتے، ان کے حالاتِ زندگی پر، ان کے افکار پر کتابیں شائع کی جاتیں، ان کی تصانیف عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرکے زیورطبع سے آراستہ کی جاتیں، ان کے بے شمار خطوط جن میں سے بعض بڑے مفصل ہیں دارالعلوم دیوبند کے محافظ خانے میں موجود ہیں، یہ خطوط انہوں نے ملک کے مشاہیر علما اور نام ور شخصیات کو لکھے تھے، کتنا اچھا ہوتا دارالعلوم دیوبند یہ خطوط اپنے کسی صاحب قلم فاضل کے ذریعے مرتب کراتا اور ان کے مجموعے شائع

کرا کے اہل علم کی نذر کرتا۔

سب سے بڑی ذمہ داری دارالعلوم (وقف) کی تھی، جو قاری محمد طیب صاحبؒ کے نام پر وجود میں آیا، اس ادارے کے کسی دروازے کا نام ''باب طیب'' رکھ دینے سے، یا چند کمروں کے ایک مجموعے کو ''رواق طیب'' کا نام دینے سے آپ اس ذمہ داری سے سبک دوش نہیں ہوسکتے، ان کی شخصیت نہایت بلند قامت تھی، ان کے معیار کے مطابق کام کی ضرورت ہے، میرے خیال میں سب سے پہلے یہ ضرورت ہے کہ قاری محمد طیب صاحبؒ پر ملک کے کسی نام ور صاحبِ قلم سے جو فاضل دیوبند بھی ہو اور تقسیم دارالعلوم کے تناظر میں غیر جانب دار بھی ہو قاری صاحب کی مفصل سوانح لکھوائی جائے، ابھی حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی مدظلہ بہ قید حیات ہیں (اللہ انہیں سلامت رکھے) ان کی موجودگی اور سرپرستی میں یہ کام زیادہ بہتر انداز میں انجام پاسکتا ہے، سوانح حیات سے متعلق مواد کی فراہمی ایک بڑا مسئلہ ہے، جو ان کے تعاون اور رہنمائی کے بغیر حل نہیں ہوسکتا، ابھی وہ لوگ بھی حیات ہیں جنہوں نے حضرت قاری صاحبؒ کو قریب سے دیکھا ہے ان سے ملاقات کی ہے، ان کے ساتھ کچھ وقت گزارا ہے، ان سے استفادہ کیا ہے، ملک کے طول وعرض میں ان کے اسفار کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا ابھی وہ لوگ بڑی تعداد میں موجود ہوں گے جنہوں نے ان اسفار کے دوران عام جلسوں میں یا خاص مجلسوں میں ان سے کسب فیض کیا ہے، ملک سے باہر بھی ان کے مستفیدین اور مسترشدین کا ایک بڑا حلقہ تھا یہ تمام لوگ سوانح حیات کے لیے بہت کچھ معلومات فراہم کرسکتے ہیں، ابھی دارالعلوم دیوبند اور دارالعلوم وقف میں بہت سے مدرسین اور ملازمین ایسے موجود ہیں جنہوں نے حضرت قاری صاحبؒ کے زمانۂ اہتمام میں اندرونِ دارالعلوم خدمات انجام دی ہیں وہ لوگ اپنے سربراہ کے طرز عمل اور کارکردگی پر خاصی روشنی ڈال سکتے ہیں، وہ مضامین

اور ادارتی نوٹ شاید ایک جگہ مل جائیں جن میں حضرت قاری صاحبؒ کے سانحۂ ارتحال کے بعد ان کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا ہے، ابھی وہ تعزیتی خطوط بھی زمانے کے دست برد سے محفوظ ہوں گے جو وفات کے بعد پسِ ماندگان کے نام موصول ہوئے تھے، اس وقت کی مجلس شوریٰ کے بعض رکن بھی ابھی زندہ ہیں، اور وہ اس مجلس کے تئیں قاری صاحبؒ کے رویے کی وضاحت کر سکتے ہیں، اگر چہ کافی وقت گزر گیا ہے مگر اب مزید تاخیر مناسب نہیں ہے، میں بہت احتیاط کے ساتھ الفاظ استعمال کر رہا ہوں ورنہ مجھے کہنا چاہئے کہ اب ذرا سی تاخیر بھی ایک ایسے جرم کے مرادف ہوگی جسے دارالعلوم دیوبند کی تاریخ کبھی معاف نہیں کر سکتی۔

قاری طیب صاحبؒ کے حالاتِ زندگی اور خدمات پر کسی مستند اور وقیع کتاب کی ضرورت اس لیے بھی زیادہ ہے کہ زندگی کی آخری ساعتوں میں ان کی شخصیت کو جس طرح مجروح کرنے کی کوشش کی گئی، اس سے وہ ایک مظلوم انسان کی صورت اختیار کر گئے ہیں، اب وقت آ گیا ہے کہ ہم حقائق کا تجزیہ کریں اور اپنی تاریخ کی تطہیر کا فریضہ انجام دیں، ہماری آنے والی نسل کو معلوم ہونا چاہئے کہ آخر وہ کیا اسباب تھے جو ان کی سبک دوشی کا محرک بنے، دارالعلوم کے متعلقین اور منتسبین کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ دارالعلوم کے اس افسوس ناک نزاع کے ہر پہلو کو حقیقت کے زاویئے سے دیکھیں کیا دارالعلوم (وقف) کے ذمہ دار حضرات خاص طور پر جانشین حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد سالم قاسمی کسی غیر جانب دار صاحب قلم کو دارالعلوم دیوبند کے اس مایہ ناز فرزند تاریخ دیوبند کی اس مظلوم شخصیت پر لکھنے کی دعوت دے کر یہ قرض ادا کرنے کی کوشش کریں گے جو قاری طیب صاحبؒ کے حوالے سے ان پر واجب ہے؟

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

صاحب علم وفضل، حامل دین وشریعت

میرے دادا حضرت مولانا احمد حسن دیوبندیؒ

بعض لوگ اپنی صلاحیتوں کے باوجود گوشۂ گم نامی میں پڑے رہ جاتے ہیں انھیں کوئی جانتا بھی نہیں کہ وہ کتنی عظمتوں اور فضیلتوں کے حامل ہیں، نہ ان کے مقام و مرتبے سے کوئی واقف ہوتا ہے، اور نہ ان کی صلاحیتوں کا معترف، دیکھنے میں اتنے سادہ ہوتے ہیں کہ کوئی ان کی طرف نگاہ بھر کر بھی نہیں دیکھتا، اسی حالت میں وہ اللہ کو پیارے ہو جاتے ہیں، میرے دادا حضرت مولانا احمد حسن دیوبندی کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں کیا جاسکتا ہے، وہ دارالعلوم دیوبند کے ان ممتاز فضلا میں سے ایک تھے جن پر اس ادارے کو فخر ہو سکتا ہے، ساری زندگی درس وتدریس میں لگے رہے تقریباً پچاس سال کی طویل مدت تک چھوٹی بڑی تمام کتابیں پڑھائیں، ہزاروں شاگردوں نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا، ان میں سے بعض شہرت کی بلندیوں تک پہنچے، لیکن ہمارے دادا کی شہرت کا سفر مزاج کی یک سوئی کی بنا پر جلال آباد سے آگے نہ بڑھ سکا، آج لوگ جانتے بھی نہیں کہ دارالعلوم دیوبند کا ایک ممتاز فرزند جس نے بے شمار شاگرد پیدا کئے ہیں اور جس نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ درس نظامی کی خدمت میں صرف کیا ہے آج قبرستان قاسمی کی خاک میں آسودہ ہے، یہ بات تقریباً طے شدہ ہے کہ عموماً شہرت انھیں ملتی ہے جو اس کی تلاش اور جستجو میں رہتے ہیں اور مختلف

حیلوں ہتھکنڈوں سے خود کو نمایاں کرتے ہیں، پھر ان حیلوں میں بھی وہ کامیاب رہتے ہیں جن کو بڑے اداروں کی معیت نصیب ہوتی ہے جن کے شاگرد اپنے استاذ کے گن گاتے پھرتے ہیں، آدمی کتنا ہی قابل کیوں نہ ہو اگر اسے شہرت اور ناموری کے مناسب ذرائع اور شخصیت کے اظہار کے لئے مناسب اسٹیج میسر نہ ہو تو وہ گوشۂ گم نامی ہی میں پڑارہ جاتا ہے، دیوبند کے ایک صاحب نے اس شہر کے بعض علما کے حالات پر ایک کتاب شائع کی ہے، میں نے کتاب کی فہرست پر نظر ڈالی، اس میں بعض ایسے نام بھی تھے، جن کے نام کے ساتھ مولوی یا مولانا کا سابقہ ضرور ہے مگر علم کے میدان میں ان کی کارکردگی نہایت معمولی یا بالکل صفر ہے، مگر اس کتاب میں ہمارے دادا کا نام نہیں ہے، میں نے بہ طور شکوہ اس کوتاہی یا کمی کی طرف مصنف کی توجہ دلائی تو وہ بغلیں جھانکنے لگے، مجھے خیال ہوا کہ یہ کمی یا کوتاہی ان کی نہیں بلکہ خود ہماری ہے، آخر ہم نے اپنے دادا کے نام اور کام کو زندہ رکھنے کے لئے کیا ہی کیا ہے؟

میرے دادا کے والد یعنی میرے پردادا جناب سخاوت حسین شیر کوٹ ضلع بجنور سے دارالعلوم دیوبند میں بہ سلسلۂ ملازمت وارد ہوئے تھے، کس ماہ و سن میں یہاں آئے تحقیق سے یہ بات معلوم نہیں ہوسکی، لیکن اندازہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند میں اُن کی آمد اور تقرری ۱۹۰۶ء کے آس پاس بہ زمانۂ اہتمام حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی رہی ہوگی کیوں کہ ہمارے پردادا کی کی پیدائش ۱۹۱۳ء میں دیوبند میں ہوئی دارالعلوم دیوبند میں پردادا کی مدت ملازمت لگ بھگ تیس پینتیس برسوں کو محیط ہے جس وقت ۱۹۳۱ء میں دادا دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوئے تب بھی وہ حیات تھے حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب میرے دادا سے اچھی طرح واقف تھے، ایک مرتبہ میں زمانہ طالب علمی میں اپنے حقیقی ماموں حضرت مولانا شریف حسن صاحب دیوبندیؒ سابق شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند کے ہم راہ دارالاہتمام میں حاضر

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

ہوا حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ اس وقت اپنی نشست گاہ پر تشریف فرما تھے، میں ایک طرف کو خاموشی کے ساتھ بیٹھ گیا، یہ دونوں حضرات گفتگو کرنے لگے، اچانک حضرت کی نگاہ مجھ پر پڑی تو میرے ماموں سے پوچھا یہ مولوی صاحب کہاں کے ہیں؟ میرے ماموں نے فرمایا میرا بھانجہ ہے، اس سال دورۂ حدیث میں ہے، پوچھا کس کا بچہ ہے، میرے ماموں نے پہلے میرے والد کا نام لیا، پھر میرے دادا کا نام لیا، حضرت ذہن پر زور ڈالتے رہے بالآخر میرے ماموں نے فرمایا یہ شیخ جی کا پڑپوتا ہے، حضرت نے فرمایا اچھا یہ شیخ جی کے پڑپوتے ہیں، بعد میں معلوم ہوا کہ میرے پردادا کو دارالعلوم میں شیخ جی کہا جاتا تھا، ان کے اصل نام سے کوئی واقف بھی نہیں تھا، اس طرح میرے دادا کو اپنی پیدائش کے پہلے ہی روز سے دارالعلوم کے ساتھ نسبت حاصل رہی ہے، یہیں پیدا ہوئے یہیں پلے بڑھے اور اسی ادارے میں ابتدا سے انتہا تک تمام تعلیمی مراحل طے کئے۔

بچپن ہی سے محنتی تھے، پڑھنے لکھنے کا شوق تھا، مزاج میں یک سوئی تھی، زیادہ تر وقت پڑھنے لکھنے میں گزارا کرتے تھے، اِدھر اُدھر گھومنے پھرنے اور سیر سپاٹے میں وقت ضائع کرنے کی عادت نہ تھی، کہتے تھے کہ میں طالب علمی کے دور میں اپنے کسی ساتھی کے کمرے پر نہیں جاتا تھا اسی لئے کوئی میرے پاس بھی نہیں آتا تھا، مطالعے کے پابند تھے، اپنے ساتھی طلبہ کو تکرار کرایا کرتے تھے، درس کے بعد زیادہ تر وقت نودرے میں گزرتا تھا، عصر کے بعد بھی مطالعہ کیا کرتے تھے، قرآن کریم بہت ہی کم عمری میں پڑھ لیا تھا، حافظ نہیں تھے، مگر قرآن پاک حفاظ کی طرح پختہ تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ تلاوت کلام پاک کا بہت شوق تھا، ذرا وقت ملتا قرآن پاک کھول کر پڑھنے بیٹھ جاتے، مہینے میں کئی کئی کلام پاک ختم کرلیا کرتے تھے، ذکر واذکار کے بھی پابند تھے اشراق، چاشت اور اوابین بھی بچپن سے پڑھنے کے عادی تھے، نفلی روزے بھی کثرت

سے رکھتے تھے، رمضان کا مہینہ تو تلاوت اور نوافل ہی میں گزرتا، سحر میں وقت سحر کے اختتام سے کچھ پہلے مسجد سے گھر آتے اور افطار کے وقت عین اس وقت قرآن کریم کی تلاوت موقوف کرتے جب افطار کے لئے گھنٹہ بجتا، اور اس سے پہلے کہ اذان ختم ہوتی مسجد میں تشریف لے جاتے، بالکل آخر تک اسی معمول پر قائم رہے۔

دارالعلوم میں ابتدائی تعلیم کے دوران ہندی بھی سیکھ لی تھی، اور حساب میں بھی مہارت حاصل کرلی تھی، فارسی زبان پر بڑا عبور تھا، عربی صرف ونحو کی کتابیں تقریباً ازبر تھیں، لکھنے کا شوق بچپن سے تھا، ایام طالب علمی میں مختلف موضوعات پر چھوٹے چھوٹے مضامین لکھ کر اپنے اساتذہ کو دکھلایا کرتے تھے، یہ شوق آخر وقت تک برقرار رہا، جب بھی فرصت ملتی لکھنے بیٹھ جاتے، تیس چالیس صفحے روزآنہ لکھنے کا معمول تھا دل ہمدردی اور مدد کے جذبات سے معمور تھا، ہمارے دادا کے چھوٹے بھائی فدا حسین صاحب جو اپنے والد کے بعد دارالعلوم میں ملازم ہوگئے تھے اپنے بڑے بھائی یعنی ہمارے دادا کی ہمدردی کا ایک واقعہ سنایا کرتے تھے، کہ ان کا ایک ساتھی جو تکرار میں شریک رہا کرتا تھا نہایت غریب تھا اور اتفاق سے دارالعلوم کی طرف سے اس کا کھانا بھی نہیں تھا جب ہمارے دادا کو پتہ چلا تو اس کے لئے گھر سے اپنے حصّے کا نصف کھانا بچا کرلانے لگے، ان کی والدہ نے کچھ دنوں کے بعد محسوس کیا کہ ان کا بیٹا الگ بیٹھ کر کھانا چاہتا ہے، اور کچھ چھپا کر بھی لے جاتا ہے، نیز دن بہ دن کمزور بھی ہوتا جارہا ہے، والدنے سختی سے پوچھ گچھ کی تو یہ عقدہ کھُلا کہ صاحبزادے تھوڑا بہت کھاتے ہیں باقی اپنے غریب ساتھی کے لئے لے جاتے ہیں اس واقعے کے بعد ان کی والدہ نے غریب طالب علم کا کھانا بھی اپنے گھر سے طے کردیا۔

دارالعلوم میں درجہ دینیات سے لے کر دورۂ حدیث تک دادا نے بہت سے اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا ان میں سے کچھ مشاہیر اساتذہ کرام کے

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

اسمائے گرامی ہیں شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ، حضرت مولانا سید میاں اصغر حسین صاحبؒ، حضرت مولانا مبارک علی صاحبؒ، حضرت مولانا قاری محمد طاہر صاحبؒ، حضرت مولانا غلام رسول خاں صاحبؒ، شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ، حضرت مولانا علامہ ابراہیم صاحب بلیاویؒ، حضرت مولانا عبدالسمیع صاحب دیوبندیؒ، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندیؒ، حضرت مولانا ریاض الدین صاحبؒ، حضرت مولانا ظہور احمد صاحب دیوبندیؒ، حضرت مولانا سید میاں اختر حسین صاحبؒ، جناب حکیم محمد عمر صاحبؒ، یہ تمام حضرات دارالعلوم دیوبند کے آسمان علم پر درخشاں آفتاب و ماہتاب کی طرح تھے، اوران کے وسعت علمی، صلاح وتقوے کا دور دور تک شہرہ تھا، ہمارے دادا اپنے اساتذہ کے رسوخ فی العلم اورتقویٰ وطہارت کا عکس جمیل تھے، انھیں اپنے اساتذہ سے محبت بھی بہت تھی، تمام اساتذۂ کرام کی خدمت میں حاضری دینا معمول تھا، جب بھی جلال آباد سے دیوبند تشریف لاتے حضرت علامہ بلیاویؒ کی خدمت میں انتہائی پابندی کے ساتھ حاضری دیا کرتے تھے اسی طرح حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب کی مجلس میں بھی حاضری کا شرف حاصل کرتے تھے، اساتذہ کے لئے غایت درجے کا ادب اُن کے دل میں تھا، اور عملاً اس کا اظہار بھی کرتے تھے، ایک مرتبہ کسی مکتبے میں تشریف فرما تھے، راقم السطور بھی موجود تھا اسی اثناء میں حکیم محمد عمر صاحب مرحوم ادھر سے گزرے، ہمارے دادا انھیں دیکھ کر احتراماً کھڑے ہوگئے، اور بڑے ادب کے ساتھ مصافحہ کیا، اور حال احوال معلوم کئے، بعد میں پتہ چلا کہ دادا نے ایّام طالب علمی میں حکیم صاحب سے القانون فی الطب پڑھی تھی، یہ حسن ادب ہی تھا کہ ایام طالب علمی میں بھی اساتذہ کی توجہات کا مرکز بنے رہے، اور بعد میں بھی ان کے دلوں میں سمائے رہے، ہمیشہ اچھے نمبرات سے امتحان میں کامیابی حاصل کی، دورۂ حدیث شریف کے سال بھی امتحانِ سالانہ

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

میں امتیازی نمبروں سے کامیاب ہوئے، دورۂ حدیث میں جو حضرات آپ کے ساتھ شریک درس رہے ان میں سے بعض کے اسمائے گرامی یہ ہیں، حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحب گنگوہیؒ، مفسر قرآن مفتی محمد یوسف صاحب دہلویؒ، مولانا عبدالسلامؒ ہاپور مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ نگینہ، مولانا عبدالحق صاحبؒ آسام، مولانا عبدالجبار صاحبؒ حیدرآباد، مولانا احمد ایوب صاحبؒ گنگوہ۔

فراغت کے بعد دارالعلوم میں بہ حیثیت استاذ تقرر عمل میں آیا، اور دو سال تک یہاں خدمت انجام دی، بعد میں شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی امروہویؒ نے آپ کو بہٹ بھیج دیا، یہاں ایک مدرسہ زاہدیہ کے نام سے شاہ محمود کی کوٹھی کے سامنے قائم ہوا تھا، اور مدرسے والوں کو ایک اچھے استاذ اور بہترین منتظم کی ضرورت تھی، اس زمانے میں اساتذہ جہاں جی چاہتا اپنے شاگردوں کو بھیج دیا کرتے تھے، اور شاگردوں میں بھی حکم عدولی اور روگردانی کی تاب نہ تھی، جہاں حکم ملتا بوریہ بستر باندھ کر وہاں چل دیتے، دارالعلوم دیوبند کی ملازمت کو چھوڑ کر کون جانا پسند کرتا ہے، بلکہ اپنا شہر جب کہ ملازمت بھی اچھی ہو کون چھوڑ کر جاتا ہے، یہ علم دین کی برکت ہی تھی کہ لوگ خدمت کو سعادت سمجھ کر انجام دیا کرتے تھے، اور نفع ونقصان سے بے نیاز ہو کر کام میں لگا کرتے تھے، بہٹ کے قریب ایک گاؤں ہے ریڑھی تاجپورہ، وہاں بھی ایک مدرسہ ابتدائی حالت میں موجود تھا اور اس مدرسے کو بھی ایک لائق منتظم اور قابل استاذ کی ضرورت تھی، نظر انتخاب دادا پر پڑی، اور مدرسے والے انھیں اپنے یہاں لے گئے، ریڑھی تاجپورہ سہارن پور سے اچھے خاصے فاصلے پر جانب مشرق لب سڑک واقع ہے، اب تو یہ جگہ کافی پر رونق ہو چکی ہے، اس زمانے میں ایک جنگل تھا، جس میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر مسلمانوں کے چھوٹے چھوٹے گاؤں آباد تھے، ریڑھی تاجپورہ نسبتاً بڑا گاؤں تھا، ہمارے دادا اس گاؤں میں سولہ برس تک مقیم رہے، ان کی محنت اور

جدوجہد سے اس مدرسے کو بے مثال ترقی ملی، اوراس کے تدریسی معیار کا دور دور تک شہرہ ہوا، سولہ برس کے بعد مدرسے کی انتظامیہ کو محسوس ہوا کہ ان کی زیرنگرانی چلنے والے ایک مدرسے کو بھی اک اچھے منتظم اور ذی استعداد مدرس کی ضرورت ہے، قرعۂ فال دادا کے نام نکلا اور انھیں باغوں والی بھیج دیا گیا جو مظفرنگر ضلع میں رڑکی ہری دوار روڈ پر واقع ہے، ہمارے دادا بلا پس وپیش باغوں والی چلے آئے، انھیں اس کا بھی ملال نہ ہوا کہ انھوں نے اپنی زندگی کے بیش قیمت سولہ سال جس مدرسے کو بنانے سنوارنے میں لگا دئے ہیں اسے یک لخت چھوڑنا پڑ رہا ہے، یہ کوئی آسان کام نہیں تھا مگر ان کے لئے مشکل بھی نہیں تھا جن کی نظر شہرت اور نام وری کے بجائے یا عہدے اور منصب کے بجائے صرف کام پر ہوتی ہے، اور وہ جو کچھ کرتے ہیں محض رضائے الٰہی کے لئے کرتے ہیں، باغوں والی میں ہمارے دادا لگ بھگ پانچ سال مقیم رہے، اس دوران دو مرتبہ مہتمم بھی بنائے گئے، تدریسی اور انتظامی دونوں طرح کی صلاحیتیں تھیں، اور بہ یک وقت دونوں طرح کی ذمہ داریوں سے بہ حسن وخوبی عہد برآ ہونے پر قدرت رکھتے تھے، اس دور کی انتظامیہ کے لوگ اور بعد میں آنے والے بھی تاریخی ریکارڈ کی بنیاد باغوں والی کے اس پانچ سال کے حسن انتظام کو یاد کرتے ہیں جب ہمارے دادا کی تدریسی شہرت بلندیوں کو چھونے لگی تو مشہور ومعروف مدرسے مفتاح العلوم جلال آباد میں اُن کو دعوتِ تدریس دی گئی، اس طرح وہ لگ بھگ پچیس سال مختلف مدرسوں میں گزارنے کے بعد مفتاح العلوم جلال آباد پہنچے جو اس وقت اپنے تعلیمی معیار کے لحاظ سے کافی نیک نام خیال کیا جاتا تھا، یہ ۱۹۵۵ء کی بات ہے، یہاں بھی اٹھائیس برس کا طویل عرصہ گزارا اور آخر عمر تک اس ادارے کی خدمت میں مشغول رہے، جلال آباد میں آپ نے زیادہ تر اونچے درجات کی کتابوں کا درس دیا، سالہا سال تک ابوداؤد پڑھاتے رہے، پھر مسلم شریف پڑھانے کی سعادت حاصل کی، انتقال کے سال

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

بخاری شریف زیر درس تھی، اس طرح وہ اپنی محنت اور مستقل مزاجی کی بہ دولت ابتدائی درجات فارسی عربی کی تدریس سے ترقی کرتے کرتے شیخ الحدیث کے عظیم منصب پر فائز ہوئے، ذٰلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء ہمارے دادا کا تدریسی سفر تقریباً اکیاون برسوں کو محیط ہے، یہ سفر ۱۹۳۱ء میں فراغت کے ساتھ ساتھ شروع ہوا اور ۱۹۸۳ء میں زندگی کے آخری لمحات تک بغیر کسی انقطاع کے تسلسل کے ساتھ جاری رہا۔

اکیاون برسوں میں ہمارے دادا نے دارالعلوم دیوبند سمیت پانچ مدرسوں میں تدریسی خدمت انجام دی، اس دوران ان سے ہزاروں طلبہ نے استفادہ کیا، ان میں سے بہت سے شاگردوں نے علمی دنیا میں زبردست شہرت بھی حاصل کی، ان میں سے چند شاگردوں کے اسمائے گرامی یہ ہیں حضرت مولانا شریف حسن صاحبؒ سابق شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند ، حضرت مولانا محمد نعیم صاحبؒ سابق شیخ الحدیث دارالعلوم وقف دیوبند، مولانا محمد اسحاق صاحبؒ مالک کتب خانہ رحیمیہ دیوبند، مولانا اصغر صاحبؒ شیخ الحدیث ریڑھی تاج پورہ، مولانا صفی اللہ صاحبؒ صاحبزادہ حضرت مولانا مسیح اللہ خانؒ شیروانی، مولانا حشمت اللہ مہتمم مدرسہ خادم العلوم باغوں والی مولانا مفتی محمد فاروق صاحب مرتب فتاویٰ محمودیہ، مفتی عبدالرحمٰن صاحب سابق مفتی مدرسہ امینیہ دہلی، مولانا مفتی شعیب اللہ مفتاحی مہتمم مدرسہ مفتاح العلوم بنگلور، مولانا نعیم احمد صاحب مہتمم مدرسہ کاشف العلوم اورنگ آباد وغیرہ شاگردوں کی بڑی تعداد برطانیہ اور افریقہ وغیرہ ممالک میں بھی خدمت انجام دے رہی ہے۔

ہمارے دادا کا علم بہت پختہ تھا، تمام کتابوں پر گہری نظر تھی، شاید ہی کوئی فن ایسا ہو جس پر عبور نہ ہو، علمائے کرام علم ریاضی سے نا آشنا ہوتے ہیں، ہمارے دادا کو اس فن میں بھی بڑی بصیرت حاصل تھی، بڑے بڑے حسابی مسئلے چٹکیوں میں حل کر دیا کرتے تھے، علم العروض سے بھی مناسبت تھی اگر چہ شاعر نہیں تھے، معقولات کے تو

گویا امام تھے، منطق وفلسفے کی اکثر کتابیں پڑھا چکے تھے، ایک زمانے تک شرح جامی بھی پڑھائی، اس کا درس بے حد مشہور تھا، دور دور سے طلبہ شرح جامی پڑھنے کے لئے آیا کرتے تھے۔

معلومات میں وسعت تو بہت تھی لیکن زبان و بیان پر بہت زیادہ قدرت نہیں تھی، عموماً بے ربط کلام ہوتا تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ پڑھانے کے دوران مضامین کی آمد کا سلسلہ برابر جاری رہتا تھا، اور یکے بعد دیگرے نئے نئے مضامین کی آمد سے تسلسل منقطع ہوجاتا تھا، جو طلبہ ذہنی استحضار کے ساتھ شریک درس رہتے وہ خوب فائدہ اٹھاتے تھے، غائب دماغی سے شرکت کرنے والے طلبہ تہی دامن اٹھا کرتے تھے اوقات مدرسہ کے بڑے پابند تھے، آندھی ہو یا طوفان کبھی سبق کا ناغہ نہیں ہوتا تھا، گھنٹہ بجنے سے پہلے کمرے سے چل پڑتے، پورے گھنٹے پڑھایا کرتے تھے، گھنٹہ بجتے ہی کتاب بند کردیتے تھے تاکہ دوسرے استاذ کا وقت ضائع نہ ہو، ہر طالب علم پر نظر رہتی تھی، کسی نے ذرا غفلت کی فوراً اسے ٹوک دیا کرتے تھے، درس کے باہر بھی طلبہ کے ساتھ ہمارے دادا کا برتاؤ بڑا مربیانہ تھا، اگرچہ مدرسے کی طرف سے ان پر طلبہ کی تربیت کی کوئی ذمہ داری نہیں تھی لیکن دادا از خود طلبہ کے مشاغل پر نظر رکھتے، کبھی کبھی رات میں اچانک طلبہ کے کمروں میں پہنچ جاتے، ان کی حاضری چیک کرتے، صبح فجر کی نماز کے لئے بھی جگا دیا کرتے تھے، بالوں اور کپڑوں پر بھی نگاہ رکھتے، اور ایسے طلبہ کو بلا تکلف ٹوک دیا کرتے تھے جو غیر شرعی بال رکھتے ہوں یا غیر مولویانہ لباس زیب تن کئے ہوئے ہوں، بعض اوقات کسی طالب علم پر اس قدر غصہ آتا کہ اسے پیٹ بھی دیا کرتے تھے، طلبہ احترام بھی بہت کرتے تھے اور ڈرتے بھی بہت تھے، پٹنے والے طلبہ بھی گردن جھکائے کھڑے رہتے۔

حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب اگرچہ عمر میں دادا سے چھوٹے تھے، مگر

ہمارے دادا کا احترام بہت کرتے تھے، جب دادا دفتر اہتمام میں یا حضرت والا کے مکان پر پہنچتے تو حضرت غایت تواضع وادب سے اپنی جگہ سمٹ جاتے اور دادا کو اپنے قریب بٹھاتے، تمام طلبہ اور اساتذہ اور اہل جلال آباد ہمارے دادا کو دادا میاں کہتے تھے، خود حضرت بھی دادا میاں ہی کہا کرتے تھے، ایک طرح سے وہ اس نام سے مشہور ہوگئے تھے، اصل نام احمد حسن سے لوگ واقف ہی نہیں تھے، بہت سے معاملات میں حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب ہمارے دادا سے مشورہ کیا کرتے تھے، کبھی کسی طالب علم کا اخراج ہوجاتا اور وہ معافی کی درخواست کے ساتھ حاضر ہوتا تو حضرت اس سے فرماتے دادا میاں سے سفارش لکھوا کر لاؤ، گر وہ لکھدیں گے تو داخلہ ہوجائے گا ورنہ نہیں، خود ہمارے دادا کو مدرسے کا مفاد بہت زیادہ عزیز تھا اور وہ اس معاملے میں اپنی اولاد کی بھی پرواہ نہیں کرتے تھے، میرے والد حضرت مولانا واجد حسین صاحب شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل مدت دراز تک مفتاح العلوم جلال آباد میں استاد رہے ہیں، اگر کبھی والد صاحب ضرورت سے زائد غیر حاضری کرتے تو دادا ان پر بے حد ناراض ہوتے۔

ہمارے دادا مفتاح العلوم کے بڑے استاذ بھی تھے، ماشاء اللہ علم بھی تھا تقوے اور بزرگی میں بھی کم نہ تھے، عمر میں بھی سب سے بڑے تھے، مگر اس کے باوجود حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب کی مجلس میں تشریف لے جاتے، اور حضرت تھانوی کے ملفوظات میرِ مجلس کی تشریحات کے ساتھ سنا کرتے تھے، ہمارے دادا حضرت مولانا مسیح اللہ خاں صاحب سے بیعت وارادت کا تعلق بھی رکھتے تھے۔

عام روش کے برعکس ہمارے دادا کو طلبہ سے گھریلو کام لینا اور ذاتی خدمات کے لئے ان کو کمرے وغیرہ پر بلانا سخت ناپسند تھا، وہ اپنے کام خود کرتے تھے، خواہ وہ کام کتنے ہی معمولی کیوں نہ ہوں اور ان میں کتنی ہی مشقت کیوں نہ برداشت کرنی

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

پڑتی ہو، مثال کے طور پر نل چلا کر پانی بھرنا بھری ہوئی بالٹی اٹھا کر لے جانا، اپنے کمرے کی صفائی کرنا اپنے کپڑے دھونا، اپنی کتابیں لے کر خود چلنا، سفر میں آمدو رفت کے موقع پر اپنا سامان کندھوں پر یا سر پر اٹھا کر چل دینا یہ ان کے معمولات میں داخل تھا، بازار کے کام بھی خود ہی کر لیتے تھے، بلکہ اپنے ٹوٹے ہوئے چپل جوتے ہاتھ میں لے کر چمار کے پاس پہنچ جاتے اور صحیح کرا کر لے آتے، اس دوران اگر کوئی طالب علم خدمت کے لیے آگے بڑھتا یا سامان وغیرہ اٹھانا چاہتا تو اسے یہ کہہ کر منع کر دیتے میاں تم پڑھا کرو، لباس اور وضع قطع اس قدر سادہ تھی کہ اگر بتلایا نہ جائے کہ یہ فلاں صاحب ہیں تو دیکھنے والا نظر انداز کر کے گزر جائے، زیادہ تر پیدل چلنے کے عادی تھے، دیوبند بس اسٹینڈ سے اپنا سامان خود سر پر اٹھا کر گھر آجاتے اور اسی طرح واپس چلے جاتے۔

جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا ہمارے دادا کو لکھنے کا بہت شوق تھا، ہر وقت کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے تھے، کبھی کسی کتاب کا ترجمہ کر رہے ہیں کبھی کسی کتاب پر حواشی چڑھا رہے ہیں، کبھی کسی کتاب کی شرح لکھ رہے ہیں، کبھی کسی کتاب کی تلخیص تیار کر رہے ہیں، غرض یہ کہ صبح سے شام تک لکھنے میں مشغول رہتے، آرام بہت کم کرتے تھے، سالہا سال تک سنن أبی داوٗد کی اردو شرح لکھتے رہے، درس نظامی کی متعدد شروح لکھی ہیں، جیسے مصباح المعانی شرح شرح جامی، ایضاح المطالب شرح کافیہ ابن حاجب وغیرہ، لیکن نہ ان کتابوں پر کوئی معاوضہ لیا، اور نہ بہ حیثیت شارح اپنا نام شائع کرنے کی اجازت دی، شہرت اور نام وری سے دور رہنے کی اس سے بہتر مثال اور کیا ہوسکتی ہے، بہت سی شروحات ابھی غیر مطبوع پڑی ہوئی ہیں انہیں عصری اسلوب میں از سر نو مرتب کر کے شائع کرنے کی ضرورت ہے۔

میرے والد محترم بہترین منتظم انسان ہیں، اس لئے دادا کو گھریلو الجھنوں سے

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

کبھی کوئی واسطہ نہیں رہا، گھر میں کیا ہورہا ہے، کون آرہا ہے کون جارہا ہے اس سے انھیں کوئی مطلب نہیں تھا، زیادہ تر تو جلال آباد رہتے تھے، دیوبند تشریف لاتے تو گھر کے دالان کے ایک حصے کو اپنا ٹھکانہ بناتے اور لکھنے پڑھنے میں مشغول ہوجاتے، البتہ بچوں کی تعلیم وتربیت پر بہت زیادہ دھیان دیتے تھے، دیر سے سوکر اٹھنے والوں کو ڈانٹ ڈپٹ بھی کرتے تھے، نماز میں کوتاہی برداشت نہیں تھی، تعلیم میں دل چسپی نہ لینے والے بچے بھی ان کے غیض وغضب کا نشانہ بنتے تھے، مجھے اگر غیر درسی مصروفیات میں مبتلا دیکھتے تو بہت زیادہ خفگی کا اظہار کیا کرتے تھے، کبھی بہ راہ راست اور کبھی دادی اماں کو مخاطب بنا کر، ہمارے دادا پڑھنے پڑھانے والے انسان تھے گھریلو نظم ونسق سے دور ہی رہا کرتے تھے، حد یہ کہ اپنی تن خواہ بھی خود وصول نہ کرتے، بلکہ ان کی تن خواہ ہمارے والد صاحب وصول کیا کرتے تھے اور وہی خرچ بھی کرتے تھے، ضرورت ہوتی تو والد صاحب سے ایک دو روپئے مانگ لیا کرتے تھے کتابوں کی چھوٹی موٹی تجارت بھی تھی، اس کے نفع سے اپنی ضرورتیں پوری کرلیتے تھے، مثلاً مطالعے کی کتابیں خریدلیں، کاغذ قلم اور روشنائی وغیرہ پر جو مصارف آتے وہ بھی اسی طرح پورے ہوا کرتے تھے۔

راقم السطور کی نوعمری کا کچھ حصہ جلال آباد میں گزرا ہے، وہیں ناظرہ، حفظ اور ابتدائی فارسی کی تعلیم حاصل کی، دادا اور والد صاحب کی وجہ سے فارسی اور عربی کے ابتدائی دوسال کی تعلیم ایک ڈیڑھ سال میں مکمل ہوگئی اور میں ضد کرکے دیوبند چلا آیا جب میری اُردو فارسی کا آغاز ہوا تو دادا نے چوتھے گھنٹے میں مجھے پڑھانا شروع کردیا اردو کی کتابیں پڑھائیں، تختی لکھوائی، املا درست کرایا، پھر فارسی کی کتابیں نحوی ترکیب کے ساتھ پڑھائیں، حساب پڑھایا میں بہت چھوٹا تھا فرمایا کرتے تھے کہ میں نے تمہیں دارالعلوم کے ناظم محاسبی کے برابر حساب پڑھادیا ہے، حساب کی ایک بہت

موٹی سی کتاب تھی، اس کے اسباق مجھے ہر روز پابندی کے ساتھ پڑھنے پڑتے تھے، کتاب دیکھ کر میری روح کانپتی تھی، پٹتا بھی بہت تھا، دیوبند میں پڑھنے کی ضد بھی اسی لئے کی تھی کہ دادا کی خوف ناک نظروں اور ان کی پٹائی سے محفوظ ہو جاؤں، نحوی ترکیب کی مشق اور حساب کی تعلیم نے مجھے بے حد فائدہ پہنچایا ہے، اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دادا نے میرے علاوہ کسی دوسرے پوتے کے ساتھ اتنی محنت بھی نہیں کی، البتہ وہ اپنی دو بیٹیوں اور دو نواسیوں کو جو تقریباً ہم عمر تھیں دیوبند میں اپنی موجودگی کے دوران ترجمۂ کلام پاک ضرور پڑھایا کرتے تھے، کچھ اور کتابیں بھی پڑھاتے تھے جن کے نام مجھے یاد نہیں، غرض یہ کہ ہمارے دادا کی پوری زندگی پڑھنے پڑھانے اور لکھنے لکھانے میں گزری، وہ اتنے یک سو انسان تھے کہ دیوبند کے لوگ تو کیا محلّے کے بہت سے لوگ بھی ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔

حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب کے حادثۂ وفات کا ان پر گہرا اثر ہوا اتفاق سے جب حضرت کی وفات ہوئی تو ہمارے دادا دیوبند میں تھے، انتقال کے وقت سے لے کر تدفین کے وقت تک انھوں نے کئی مرتبہ آستانۂ قاسمی کے چکّر لگائے اس حادثے نے ان کی صحت پر خراب اثر ڈالا، اسی حالت میں جلال آباد پڑھانے کے لئے تشریف لے گئے، صحت دن بہ دن گرتی چلی گئی، ضعف بڑھنے لگا، غفلت رہنے لگی، اسی حالت میں دیوبند آگئے، بیماری کے دوران پاکی اور نماز کا بڑا اہتمام تھا آخری ایام میں بے ہوشی کی سی کیفیت رہتی تھی، جب بھی ذرا ہوش آتا فوراً پوچھتے نماز کا وقت ہوگیا ہے، لیٹے لیٹے وضو کرائی جاتی، اسی طرح اشاروں سے نماز ادا کرتے بعض اوقات نماز ہی میں غافل بھی ہو جاتے، جس رات انتقال ہوا بڑی بے چینی تھی رہ رہ کر غفلت طاری ہو رہی تھی، جب بھی ذرا ہوش آتا، زبان سے صرف ایک لفظ نکلتا نماز، قریب بیٹھے ہوئے لوگ عرض کرتے ابّا آپ نے نماز تو پڑھ لی ہے مگر وہ پھر

کانوں تک ہاتھ اٹھا کر نیت باندھ لیتے، پھر بے ہوش ہو جاتے، پھر ہاتھ اٹھاتے اور نیت باندھتے، اس رات جب تک روح قفسِ عنصری سے پرواز نہیں کر گئی ایسا بار بار ہوتا رہا، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے، اور وہاں کا راحت و آرام نصیب فرمائے، ایسی بے داغ زندگی جیسی ہمارے دادا کی گزری ہے بہت کم لوگ گزارتے ہیں، نہ کسی سے لینا نہ دینا، نہ کسی سے واسطہ نہ مطلب، گھر سے مسجد، مسجد سے گھر، یہی دو فاصلے ان کی زندگی کا حاصل تھے، نماز سے والہانہ شغف تھا، نماز پڑھتے پڑھتے انھوں نے اپنی جان؛ جانِ آفریں کے سپرد کردی، ہمارے دادا کا انتقال ۱۸/اکتوبر ۱۹۸۳ء کو رات کے آخری حصّے میں ہوا، اگلے دن ظہر کے وقت احاطۂ مولسری میں نماز جنازہ ادا کی گئی اور قبرستان قاسمی میں تدفین عمل میں آئی، إنَّا للّٰہ و انا الیہ راجعون۔

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

ملّی تاریخ کا روشن عنوان

مفکر ملت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ

بعض لوگ دنیا سے رخصت ہوتے ہیں تو ان کے ساتھ پورا ایک عہد رخصت ہو جاتا ہے، وہ عہد ہی رخصت نہیں ہوتا بلکہ اس عہد کی تمام خصوصیتیں اور روایتیں بھی رخصت ہو جاتی ہیں، بس آنے والی نسلیں ان روایتوں اور خصوصیتوں کو یاد کرتی رہ جاتی ہیں، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کی وفات بھی ایک ایسے ہی عہد کا خاتمہ ہے جس کے ساتھ اس عہد کی تمام خصوصیات اور روایات بھی دفن ہوگئیں، جن لوگوں نے حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی صاحب کو قریب سے دیکھا ہے وہ لوگ میری اس بات کی تائید کریں گے کہ ان جیسا وضع دار، مرنجاں رنج، متحمل مزاج، بردبار، فراخ حوصلہ، اور باہمت انسان کم ہی ملے گا، کم از کم نئے دور کے قائدین تو یہ دعویٰ کر ہی نہیں سکتے کہ وہ اپنے فکر و عمل میں اگلے وقتوں کے رہروان شوق کے عزمِ سفر اور جذبۂ سفر کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔

حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی جنھوں نے ۱۲ر مئی ۱۹۸۴ء کو دہلی میں وفات پائی صحیح معنی میں مفکر ملّت تھے، عام طور پر لقب دینے میں بڑی فراخ دلی کا ثبوت دیا جاتا ہے، اور بھاری بھرکم لقب ان لوگوں کے نام کے ساتھ جوڑ دئے جاتے ہیں جو کردار و عمل اور ذہن و فکر کے لحاظ سے ان القاب کے کسی طرح اہل نہیں ہوتے، لیکن مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کی شخصیت پر یہ لقب پوری طرح فٹ تھا، واقعی ان کی زندگی کا

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

ہر لمحہ ملت کی فلاح کے منصوبوں پر غور وفکر میں گزرتا تھا، ان کی کشادہ پیشانی میں فکر وتدبر کی گہری لکیریں ان کی پہچان بن گئیں تھیں ان لکیروں میں گزشتہ نصف صدی کے ملّی طوفان کی تاریخ درج تھی، کبھی کبھی یہ طوفان آنکھوں کی گہرائیوں میں اتر آتا اور ایک مستقل کرب کی صورت اختیار کرلیتا، ملت کے تیئں دائمی کرب آمیز فکر سے وہ واقعی مفکر ملّت بن گئے تھے، اور مفکر ملت کہلانے کے بجا طور پر مستحق تھے۔

مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کا تعلق دیوبند کے مشہور علمی اور روحانی خانوادے سے تھا، ان کے والد حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی صاحب فتاویٰ دارالعلوم دیوبند ایک ممتاز عالم، فقیہہ اور بزرگ انسان تھے، سلسلۂ نقش بندیہ سے تعلق رکھتے تھے، ان کے برادر کلاں حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی دارالعلوم دیوبند کے مہتمم تھے حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی، حضرت مولانا مطلوب الرحمٰن عثمانی، یہ سب حضرات آپ کے تائے چچا ہیں، حضرت مولانا فضل الرحمٰن عثمانی دیوبندی جو دارالعلوم دیوبند کے بانیوں میں شمار کئے جاتے ہیں مفتی صاحب کے دادا تھے، گویا پورا خاندان چندے آفتاب چندے ماہ تاب تھا، حضرت مفتی صاحب کی پیدائش ۱۹۰۱ء میں ہوئی، دیوبند جائے پیدائش ہے، یہیں پلے بڑھے ہیں، پروان چڑھے، ابتدا سے انتہا تک مکمل تعلیم دارالعلوم دیوبند میں ہوئی محدث عصر حضرت علامہ کشمیریؒ سے شرف تلمذ حاصل کیا، دل چسپی اور محنت سے پڑھا، امتیازی کامیابی حاصل کی، ۱۳۴۱ھ میں فراغت کے بعد ذمہ داران دارالعلوم نے افتا اور تدریس کے کام پر مامور کردیا، کچھ وقت تک یہ دونوں ذمہ داریاں نبھاتے رہے، اس کے بعد وہ حادثہ رونما ہوا جس کی بنا پر ۱۳۴۵ھ میں حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ جیسے جبال علم کو دارالعلوم دیوبند چھوڑنا پڑا، اوّل الذکر دونوں حضرات سورت گجرات کے گاؤں ڈابھیل چلے گئے اور وہاں درس وتدریس میں مشغول ہوگئے ان دونوں کے ساتھ بعض نوجوان

فضلا بھی دارالعلوم سے باہر آ گئے اور ان حضرات نے بھی اپنے اساتذہ کی طرح ڈابھیل کو اپنی علمی سرگرمیوں کا مرکز بنایا، ان نوجوان فضلا میں سرفہرست مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی تھے کچھ عرصے کے بعد آب وہوا کی عدم موافقت کی بناپر ڈابھیل سے مستعفی ہوکر کلکتہ چلے گئے اور وہاں جا کر ایک مرکزی مسجد میں درس قرآن اور امامت وخطابت کا سلسلہ شروع کیا کلکتہ ہی میں تصنیفی ادارے ندوۃ المصنفین کا تخیّل پیدا ہوا، اس کا پورا خاکہ تیار کیا، اور اپنے چند رفقا کی معاونت سے اس علمی ادارے کی بنیاد ڈالی، یہ ۱۹۳۷ء کی بات ہے، اس ادارے سے ایک ماہانہ رسالہ برہان بھی جاری کیا، جو ابھی تک جاری ہے۔(۱)

ندوۃ المصنفین کا قیام آپ کے تخیّل کی بلند پروازی، اور عزم واستقلال کی حیرت انگیز داستان ہے، اس ادارے کے ذریعے دین وادب کی ٹھوس خدمات انجام دی گئی ہیں، بہت سے اہم موضوعات پر محققین کی گراں مایہ تالیفات اسی ادارے کے ذریعے منظرِ عام پر آئیں، اس ادارے کی شائع کردہ کتابوں کو بہ نظر تحسین دیکھا جاتا ہے، ماہ نامہ ''برہان'' بھی علمی حلقوں میں بے حد مقبول ہے، قارئین اس کا بہ صد شوق انتظار کرتے ہیں، اس کے مضامین نہایت تحقیقی اور عالمانہ ہوتے ہیں، ۱۹۳۷ء میں اس ادارے کا قیام قرول باغ دہلی کی کسی عمارت میں ہوا تھا، ۱۹۴۷ء میں یہ عمارت اجاڑ دی گئی، کتابوں میں آگ لگا دی گئی، مفتی صاحب بڑی مشکل سے اپنی جان بچا کر بچے کھچے ذخیرے کے ساتھ جامع مسجد کے قریب اس عمارت میں فروکش ہوئے جو آج کل ندوۃ المصنفین اور برہان کا دفتر ہے، اس طرح مفتی صاحب کو دو مرتبہ یہ ادارہ قائم کرنا پڑا، ۱۹۴۷ء میں اچھے اچھوں کے قدم ڈگمگائے، لیکن مفتی صاحب مایوس کن حالات میں بھی صبر واستقامت کا کوہ گراں بن کر کھڑے رہے۔

(۱) افسوس اب یہ رسالہ بھی بند ہو چکا ہے، اور ندوۃ المصنفین بھی ختم ہو گیا ہے، اس علمی نقصان پر جتنا بھی افسوس کیا جائے۔

آزادی سے پہلے مفتی صاحب تحریک آزادی کے قافلہ سالاروں میں شامل تھے یا نہیں اس سلسلے میں میری معلومات صفر ہیں، البتہ ۱۹۴۷ء کے بعد کی صورت حال میں مفتی صاحب نے جس طرح دہلی کے مسلمانوں کے حوصلوں کو بلند کیا وہ اپنی مثال آپ ہیں، شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ اور مولانا ابوالکلام آزاد ملک میں گھوم گھوم کر مسلمانوں کو صبر وضبط کی تلقین کررہے تھے، اور دہلی میں حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ اور حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ ملّت کے لٹے پٹے قافلوں کی بازآبا کاری کے لئے سرگرم عمل تھے، ان دونوں حضرات نے دہلی کے مظلوم اور ستم رسیدہ مسلمانوں کو بڑا حوصلہ دیا، انھیں ہجرت کرنے سے روکا، ان کی غم گساری کی آج دہلی کے پرانے گلی کوچوں میں مسلمانوں کے جو گھر نظر آتے ہیں وہ ان ہی دونوں حضرات کی محنت کے نتیجے میں نظر آتے ہیں۔

حضرت مفتی صاحب نظریاتی طور پر جمعیۃ علما ہند سے وابستہ تھے، آزادی کے بعد اس میں پوری طرح شامل ہوگئے، اور اس کے اسٹیج سے ملّی اور سیاسی سرگرمیوں میں حصّہ لینے لگے، مجاہد ملّت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کے انتقال کے بعد جمعیۃ علما ہند کو سخت بحران کا سامنا کرنا پڑا، اجلاس عام میرٹھ میں صدر کے انتخاب کے معاملے پر جمعیۃ کے دو گروپ آمنے سامنے آگئے، ایک گروپ حضرت مولانا فخر الدین صاحب مرادآبادی کو صدر دیکھنا چاہتا تھا، اور دوسرے گروپ کی خواہش یہ تھی کہ مفتی عتیق الرحمٰن کو صدر بنایا جائے، مار پیٹ تک نوبت پہنچی، مفتی صاحب اور ان کے حامیوں کو راہ فرار اختیار کرنی پڑی، اول الذکر گروپ کامیاب رہا، کوئی اور ہوتا تو اس شکست سے مایوس ہوکر گھر بیٹھ جاتا، لیکن مفتی صاحب میں صبر وتحمل بہت تھا، خود بھی پر سکون رہے، اور ساتھیوں کی بھی ہمت بندھائی، نہ متوازی جمعیۃ قائم کی، اور نہ عدالت کا راستہ اختیار کیا، بس اتنا ہوا کہ جمعیۃ علما ہند سے مفتی صاحب کا دیرینہ تعلق ختم ہوگیا۔

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

حضرت مفتی صاحب میں ملک وملت کی خدمت کا بڑا جذبہ تھا، آزادی کے بعد ۱۹۶۴ء کا سال مسلمانوں کے لئے نہایت اذیت ناک رہا ہے، ۴۷ء کے ہنگاموں کے بعد مسلمان ابھی سکون کا سانس بھی لینے نہ پائے تھے کہ انھیں فرقہ وارانہ فسادات کے ذریعے تباہ وبرباد کرنے کی سازشیں کی جانے لگیں، ملک میں چاروں طرف دنگے فساد شروع ہوگئے، ہرجگہ فسادات میں مسلمان نشانہ بنائے گئے، انھیں جان ومال کا زبردست نقصان اٹھانا پڑا، ان حالات میں حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی میدان عمل میں آئے انھوں نے اپنے رفقا بالخصوص ڈاکٹر سید محمود مرحوم (سابق وزیر خارجہ حکومت ہند) حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی، مولانا ابواللیث اصلاحی ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی، اور پنڈت سندرلال وغیرہ کے ساتھ مل کر پہلے لکھنؤ میں پھر کلکتہ میں طویل غوروخوض کے بعد مسلم مجلس مشاورت کی بنیاد ڈالی، اس جماعت کا خاص نصب العین یہ تھا کہ ہندو مسلمانوں کے درمیان جو خلیج پیدا ہوگئی ہے وہ پاٹی جائے، جو غلط فہمیاں دونوں کے درمیان پروان چڑھ رہی ہیں ان کو دور کیا جائے، اور ملک میں رواداری کی فضا قائم کی جائے، مسلم مجلس مشاورت نے ۱۹۶۴ء کے بعد ملک بھر کے ماحول کو سدھارنے میں جو رول ادا کیا ہے اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، یہ تمام حضرات قربانی اور ایثار کا پیکر تھے، بہ طور خاص مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کے عزم وحوصلے کی داد دینی چاہئے ان پر قاتلانہ حملے تک کئے گئے مگر وہ اپنے نصب العین سے ایک انچ بھی پیچھے نہ ہٹے۔

مفتی صاحب اصطلاحی معنی میں مقرر نہ تھے، لیکن جب بھی تقریر کرتے سامعین کو مسحور کردیتے، الفاظ جچے تلے ہوتے، کم سے کم الفاظ میں بڑی سے بڑی بات کہنے کا ہنر جانتے تھے، چیخنے چلانے اور جوش وجذبات میں تلاطم پیدا کرنے کے عادی نہیں تھے، خطابت میں عالمانہ وقار اور سکون ہوتا تھا، اور بڑی سلجھی ہوئی باتیں کیا کرتے تھے، سیاسی تقریروں کے علاوہ انھوں نے سالہا سال تک آل انڈیا ریڈیو کی

اُردو سروس پر موقع ومناسبت کے لحاظ سے تقریریں بھی کی ہیں، یہ تمام تقریریں ”منارصدا“ کے نام سے چھپ چکی ہیں، تقریر سے زیادہ مفتی صاحب کی تحریر دل آویز ہوا کرتی تھی، بڑی شگفتہ نثر لکھتے تھے، افسوس ندوۃ المصنفین کی انتظامی سرگرمیوں کی وجہ سے اور بعد میں سیاسی مصروفیات کے باعث حضرت مفتی صاحب تصنیف وتالیف کی طرف متوجہ نہ ہوسکے، ورنہ اچھوتے موضوعات پر اعلیٰ معیار کی کئی کتابیں منظر عام پر آتیں، ایک جگہ خود بھی لکھا ہے کہ ۱۹۳۷ء کے اوائل میں جب ندوۃ المصنفین کا قیام عمل میں آیا، دوسرے رفقائے کار کے ساتھ میں بھی ایک بڑھیا قسم کی بلوریں دوات اور عمدہ قلم سنبھال کر بیٹھ گیا اور لکھنے پڑھنے کا کام شروع کردیا، علامہ ابن القیم کی الکلم الطیب تشریحی نوٹوں کے ساتھ اور علامہ ابن الجوزی کی صید الخاطر کا ترجمہ ان ہی دنوں کی یادگار ہے، لیکن جلد ہی یہ طے کرلیا کہ لکھنے پڑھنے والوں اور تصنیف کے شہہ سواروں کی کمی نہیں، کمی جس چیز کی ہے وہ یہ ہے کہ ادارے کا انتظام کون چلائے اور کس طرح چلائے اس فیصلے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک کوتاہ قلم اور کم سواد انتظامات کے خرخشوں میں پھنس پر رہ گیا گزرے ہوئے دن واپس نہیں آتے اور اب افسوس کے علاوہ کوئی چارۂ کار ہی نہیں ہے۔“

دارالعلوم دیوبند سے مفتی صاحب کا تعلق لگ بھگ ساٹھ برسوں کو محیط رہا ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ان کا تعلق پوری زندگی کو محیط تھا، آنکھ کھول کر انھوں نے دارالعلوم کو دیکھا، اسی ادارے میں پڑھ کر جوان ہوئے معین مدرس اور معین مفتی رہے، ۱۹۴۸ء میں رکن شوریٰ بنائے گئے، مفتی صاحب اس منصب کے یقینی طور پر اہل تھے، ان کی دوراندیشی اور معاملہ فہمی ہمارے حلقوں میں ضرب المثل رہی ہے مشورہ نہایت معقول اور صائب دیتے تھے، حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ان کے مخالفین تک ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور مشورہ طلب کرتے، دارالعلوم دیوبند کے رکن شوریٰ کی حیثیت سے بھی ان کا کردار بڑا فعال اور تعمیری رہا ہے، وہ جب بھی شوریٰ

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

کے اجلاس میں شرکت کے لئے دیو بند تشریف لاتے ملنے جلنے والوں میں گھرے رہتے یہ تین چار دن بڑی مصروفیت کے ہوا کرتے تھے،طلبۂ دارالعلوم سے خصوصی شفقت کا معاملہ فرماتے تھے،ہم لوگ شوریٰ کے دوران ملاقات کے لئے حاضری دیتے تو کچھ نہ کچھ معلوم ضرور کرتے تھے،ان کا تکیۂ کلام جی ہاں تھا، کچھ کہنے سے پہلے جی ہاں ضرور کہتے ،اور سائل کو اپنے جواب سے مطمئن کردیتے، دارالعلوم دیو بند کی مجلس شوریٰ نے ان کی وفات کے بعد جو تجویز تعزیت منظور کی ہے اس میں انھیں بجاطور پر برصغیر بلکہ عالم اسلام کا ممتاز عالم، صاحب نظر مفتی، بہترین سیاست داں اور غیر معمولی طور پر معاملہ فہم اور صاحب فہم وفراست قرار دیا گیا ہے، انتقال کے بعد جو مضامین اخبارات ورسائل میں چھپ رہے ہیں اور اور مشاہیر اہل علم جن تأثرات کا اظہار کررہے ہیں ان میں قدر مشترک کے طور پر یہ بات ضرور شامل ہے کہ ان کی طبیعت میں اعتدال تھا رائے میں توازن، فکر میں گہرائی، اور معاملات میں دور اندیشی آپ کا طرۂ امتیاز تھی دارالعلوم کے حالات سے بالکل ٹوٹ کر رہ گئے تھے، آخری دوسال پلنگ پر رہے، فالج بھی ہوگیا تھا،اور دماغی کینسر جیسے مرض میں بھی مبتلا تھے،اس حالت میں بھی دل کی دنیا دارالعلوم دیو بند کی یادوں سے آباد تھی، جب بھی کوئی مزاج پرسی کے لئے آتا اس سے دارالعلوم کے حالات ضرور معلوم کرتے، اس قضیے میں آخر تک حضرت مہتمم صاحبؒ کے ساتھ رہے اور ان کو حق پر سمجھتے رہے، مفتی صاحب کو اس کا قلق رہا کہ دارالعلوم دیو بند کے واقعے سے علما کا وقار مجروح ہوا ہے۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ بھی حضرت مفتی صاحب کی مساعی جمیلہ کا عکس جمیل ہے، آپ نے بورڈ کی تشکیل وتعمیر میں اپنا بھر پور کردار ادا کیا، اوّلین میٹنگ سے لے کر جو دارالعلوم دیو بند میں ہوئی عروس البلاد بمبئی کے اجلاس عام تک، بلکہ حیدرآباد کی انتخابی میٹنگ تک ہر موقع پر حضرت مفتی صاحب کی گہری بصیرت اور دانش مندی

سے بورڈ نے فائدہ اٹھایا ہے، وفات کے بعد بورڈ کی مجلس عاملہ نے اپنی تجویز تعزیت میں بالکل صحیح کہا ہے کہ وہ ''عالی دماغ مفکر، زبردست عالم دین، جنگ آزادی کے مجاہد، ملّت اسلامیہ کے عظیم قائداور رہ نما تھے، مسلم پرسنل لا کے تحفظ کے لئے شروع سے فکرمند رہے، اور مسلم پرسنل لا بورڈ کے قیام میں حضرت مرحوم نے قائدانہ حصہ لیا اور شروع سے بورڈ کے نائب صدر رہے اور بورڈ کی قیادت و رہ نمائی کرتے رہے۔''

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کی وفات کے بعد وہ بجا طور پر مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر بنائے جاتے لیکن افسوس علالت اور وفات نے اس کا موقع ہی نہیں دیا۔

راقم السطور کو حضرت مفتی صاحب سے گہری عقیدت تھی، طالب علمی کے زمانے میں احقر لازمی طور پر حضرت مفتی صاحب سے ملاقات کرنے کے لئے مہمان خانۂ دارالعلوم میں ان کے کمرے میں حاضر ہوتا، کبھی کبھی محض مصافحہ ہی ملانے کی نوبت آتی، اور کبھی کچھ کہنا سننا بھی ہوتا، حضرت مفتی صاحب گہری سوچ میں ڈوبے رہتے تھے، اور پیشانی پر تفکر کی سلوٹیں پڑی رہتی تھیں، حضرت مفتی صاحب کی یادداشت بڑی اچھی تھی، جس سے ایک بار ملاقات ہوگئی بھولتے نہیں تھے بلکہ اسے نام سے یاد رکھتے تھے، احقر کو بھی ملتے ہی پہچان لیتے، اور خیر وخیرت دریافت کرتے ایک مرتبہ راقم السطور دارالعلوم دیوبند کی طرف سے علمائے دیوبند کے عربی قصائد کی جمع وترتیب کے کام پر مامور کیا گیا، اس سلسلے میں ماہ نامہ برہان کی فائل دیکھنے کے لئے دہلی بھی گیا، حضرت مفتی صاحب سے نیاز حاصل ہوا، دارالعلوم کی طرف سے تحریر پیش کی جس میں لکھا تھا کہ یہ اس غرض کے لئے حاضر خدمت ہو رہے ہیں، مفتی صاحب نے اپنے آفس کے بالائی حصّے میں قیام کے لئے فرمایا، تین چار دن تک وہاں رہنا ہوا، میرے انکار کے باوجود حضرت خود اپنے دولت کدے سے دونوں وقت کھانا اور ناشتہ لے کر تشریف لایا کرتے تھے، میری نگاہوں میں آج بھی وہ منظر تازہ

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

ہے جب حضرت اپنے دونوں ہاتھوں میں ٹرے تھامے دفتر ندوۃ المصنفین کے دروازے میں داخل ہوتے، میں جلدی سے آگے بڑھ کر ندامت کے احساس کے ساتھ ٹرے تھام لیتا، دارالعلوم دیوبند کے رکن شوریٰ، اور اپنے وقت کے ممتاز حیثیت کے حامل کسی شخص کا ایک فرومایہ اور معمولی طالب علم کے ساتھ تواضع اور انکساری کا یہ معاملہ اپنے آپ میں ایک محیّر القول واقعہ ہے، سرینگر میں حضرت علامہ کشمیری پر ایک آل انڈیا سمینار منعقد ہوا، اس میں شرکت کے لئے بھی حضرت تشریف لے گئے، ایک نشست کی صدارت بھی فرمائی، میرا مقالہ اسی نشست میں تھا، پروگرام کے اختتام پر حضرت مفتی صاحب نے میرے مقالے کی بے حد تعریف کی حضرت کی تعریف سے بڑا حوصلہ ملا، ان تعریفی کلمات کی حلاوت آج تک محسوس ہوتی ہے۔

افسوس مفتی صاحب اب ہم میں نہیں ہیں، وہ اپنی خدمات کے روشن نقوش چھوڑ کر رخصت ہو گئے، ایک دن سب کو مرنا ہے، مفتی صاحب کو بھی جانا ہی تھا، عمر طبعی کو پہنچ کر رخصت ہو گئے افسوس اس کا ہے کہ مفتی صاحب کی علمی اور سیاسی وراثت کو آگے بڑھانے والا ان کی صلبی اولاد میں کوئی نہیں ہے، یہ عجیب بات ہے کہ اکثر علمائے دین کے بچے اپنے آبا واجداد کے راستے سے ہٹے ہوتے ہیں، مفتی صاحب کو اللہ تعالیٰ نے کئی لڑکے عطا کئے، لیکن ایک بھی ایسا نہیں جس کو ان کا سچّا جانشین قرار دیا جائے، اللہ تعالیٰ حضرت مفتی صاحب کو چین اور سکون نصیب فرمائے، ندوۃ المصنفین کی صورت میں جو پودا انھوں نے لگایا اور جسے اپنے لہو سے سینچ کر انھوں نے جوان کیا اسے اسی طرح سرسبز وشاداب رکھے، ان کی علمی یادگار رسالہ برہان بھی اسی طرح علم وادب کے افق پر آفتاب کی طرح روشن رہے۔

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

علم وتحقیق کی دنیا کے بے تاج بادشاہ

حضرت مولانا سعید احمد اکبرآبادیؒ

حضرت مولانا سعید احمد اکبرآبادی کا نام دیوبند کے ان علما میں شامل ہے جو اپنی بالغ نظری، کشادہ ذہنی، فکری بالیدگی، اور علم وعمل کی پختگی میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے افسوس مولانا اکبرآبادی ۲۴ر مئی ۱۹۸۵ء کو کراچی میں انتقال فرما گئے، وہ عرصۂ دراز سے کینسر کے موذی اور مہلک مرض میں مبتلا تھے، اسی حالت میں ایک بین الاقوامی کانفرنس میں جو پندرہویں صدی ہجری کی تقریبات کے سلسلے میں منعقد کی گئی تھی شرکت کے لئے پاکستان تشریف لے گئے، صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق نے انھیں پہچان لیا اور عرض کیا کہ آپ تو میرے استاذ ہیں، میں نے دہلی یونیورسٹی کے سینٹ اسٹیفن کالج میں آپ کے سامنے زانوئے ادب طے کیا تھا، صدر پاکستان نے قیام پاکستان کے دوران ان کی بڑی تکریم کی، علاج معالجے کے مصارف برداشت کئے اور انھیں بہ صد اصرار پاکستان میں قیام پر آمادہ کیا، کراچی میں مولانا اکبرآبادی کے بیٹے اور بیٹی بھی ہیں، اس طرح مولانا نے اپنی زندگی کے آخری ایّام پاکستان میں گزارے سندھ کے گورنر حکیم محمد سعید دہلوی ان کے معالج رہے، اعلیٰ سے اعلیٰ علاج ہوا، لیکن شفا نہ ہوسکی، وقت موعود آپہنچا، اور دیار غیر میں وفات پائی، کراچی ہی میں دفن ہوئے، اس طرح قرآن کریم کا یہ دعوی پھر برحق ثابت ہوا کہ کسی کو یہ معلوم نہیں کہ اس کی موت

کس سرزمین پر آئے گی۔

ہمیں یہ اعتراف کرنا چاہئے کہ مولانا اکبرآبادی کا انتقال کوئی معمولی حادثہ نہیں ہے، ان کی وفات سے علم وتحقیق کی دنیا میں زبردست خلا پیدا ہوا ہے، دارالعلوم دیوبند اپنی مجلس شوریٰ کے ایک مؤقّر رکن سے محروم ہوگیا، ندوۃ المصنفین اپنے ایک دیرینہ رفیق اور ماہ نامہ ''برہان'' نے اپنا لائق مدیر کھودیا، سب سے بڑھ کر یہ کہ ملت اسلامیہ ہند ایک ایسے عالم دین سے محروم ہوگئی جسے بجا طور پر اپنے اقران ومعاصرین پر کئی پہلوؤں سے امتیاز حاصل تھا، قدیم وجدید کے امتزاج سے ان کے مزاج کی تشکیل ہوئی، ایک طرف انہیں علوم دینیہ میں کامل دست گاہ اور مہارت حاصل تھی، دوسری طرف وہ علوم عصریہ میں بھی رسوخ رکھتے تھے، حافظے کی قوت، مطالعے کی وسعت اور بہ یک وقت کئی زبانوں میں مہارت نے ان کی شخصیت کو مجمع البحرین بنادیا تھا، اس طرح کی ہمہ جہت شخصیتیں ہمارے حلقوں میں اتنی کم ہیں کہ انگلیوں پر گنی جاسکتی ہیں۔

مولانا کا تعلق آگرہ کے ایک علم دوست، دین دار اور خوش حال گھرانے سے تھا، ان کے والد ماجد کا شمار نامی گرامی ڈاکٹروں میں ہوتا تھا، مال دولت اور جاہ حشمت کی فراوانی کے باوجود علمائے دین سے دلی تعلق رکھتے تھے، مشہور بزرگ قاضی محمد اسماعیل منگلوریؒ کے خلیفہ قاضی عبدالغنی منگلوریؒ سے بیعت تھے، نماز باجماعت، تہجد اور اورادوظائف کا اہتمام تھا، اکابرین دیوبند کی محبت رگ وپے میں بسی ہوئی تھی، ڈاکٹر صاحب عرصۂ دراز تک اولاد سے محروم رہے، مولانا سعید احمد اکبرآبادی کی پیدائش شادی کے ستائیس سال کے بعد مایوس کن حالات میں ہوئی، ان کے والد سمجھتے تھے کہ یہ سب ان کے پیر قاضی صاحب کی دعاؤں کا نتیجہ ہے، جو مستقل یہ کہہ کر تسلّی تشفی دیا کرتے تھے کہ فکر نہ کرو تمہارے یہاں ایک فرزند سعید پیدا ہوگا، پیدائش سے پہلے ایک رات خواب میں دیکھا کہ ان کے گھر حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ تشریف لائے ہوئے ہیں اور بیٹے کی پیدائش پر مبارک باد دے رہے ہیں، اس لئے جب نومبر ۱۹۰۸ء کی ایک مبارک و مسعود صبح بیٹا ہوا تو جیسے ان کے گھر میں عید ہوگئی، سعید نام رکھا اور اسی وقت طے کرلیا کہ ان کو عالم بنایا جائے گا حالاں کہ وہ اپنے پیشے کی مناسبت سے انھیں ڈاکٹر بھی بنا سکتے تھے، یا اپنے پیسے کی بنیاد پر انھیں اعلی سے اعلیٰ تعلیم بھی دلا سکتے تھے، جس لڑکے نے ایسے ماحول میں آنکھ کھولی ہو اور جس نے گھر میں خوش حالی کے ساتھ ساتھ دین داری بھی دیکھی ہو اس کی سعادت اور خوش بختی کا کیا ٹھکانہ، ابتدائی تعلیم کافیہ قدوری تک گھر پر ہوئی، انگریزی حساب جغرافیہ وغیرہ عصری علوم بھی گھر ہی پر رہ کر پڑھے، مزید تعلیم کے لئے ان کو مدرسہ امدادیہ مراد آباد میں داخل کیا گیا، وہاں اس وقت مولانا مرتضی حسن چاند پوریؒ استاذ تھے شرح جامی تک اسی مدرسے میں پڑھا، جب مولانا مرتضی حسن چاند پوریؒ دارالعلوم تشریف لائے تو ان کا یہ شاگرد بھی دیوبند آگیا، دیوبند کے علمی اور روحانی ماحول نے ان کے دل و دماغ کی دنیا میں انقلاب برپا کیا، اور انھوں نے بال و پر نکالنے شروع کیا، ابتدا میں وہ شرمیلے قسم کے گوشہ نشین نوجوان تھے، دیوبند پہنچ کر ان کے تعلقات کا دائرہ وسیع ہوا، درسی اور غیر درسی مصروفیتیں بڑھیں، انجمنوں میں شرکت کا آغاز ہوا یہ دور دارالعلوم کا بہترین دور تھا، علامہ انور شاہ کشمیریؒ مسند حدیث پر متمکن تھے، مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی جیسا علم دوست اور مربی و مشفق شخص عہدۂ اہتمام پر فائز تھا حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ ، حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰنؒ عثمانی، علامہ ابراہیم بلیاویؒ، حضرت مولانا سراج احمد رشیدیؒ، حضرت مولانا اعزاز علی امروہویؒ جیسی نابغۂ روزگار ہستیاں مسند تدریس کو رونق بخش رہی تھیں، اس علمی فضا نے مولانا سعید احمد اکبرآبادی کی ذہنی تشکیل میں بھرپور کردار ادا کیا، انھوں نے ماہ نامہ برہان کے کسی شمارے میں خود بھی لکھا ہے کہ میری تعمیر و تشکیل جو کچھ بھی ہوئی اسی دور میں ہوئی، ۱۹۲۵ء

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

میں از ہرالہند سے فراغت کے بعد گریجویشن کیا، پھر عربی میں ایم اے کیا۔

یہ بھی عجیب بات ہے کہ مولانا اکبر آبادی نے دینی اور عصری دونوں طرح کے مدارس میں تدریسی فرائض انجام دیئے ۱۹۲۸ء میں جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل میں بہ حیثیت استاذ تقرر رہوا اور تین سال تک درس و تدریس کے مشغلے سے وابستہ رہے ۱۹۳۱ء میں مدرسہ عالیہ فتح پوری دہلی تشریف لائے اور وہاں بہ حیثیت استاذ کام کیا اسی دوران ایم اے کا امتحان دیا، ۱۹۴۳ء میں سینٹ اسٹیفسن کالج دہلی میں تقرر ہوا ۱۹۴۷ء میں پرنسپل کی حیثیت سے مدرسہ عالیہ کلکتہ تشریف لے گئے، ۱۹۵۹ء میں مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ دینیات کی صدارت تفویض ہوئی اور ۱۹۷۲ء میں اس باوقار منصب سے سبک دوش ہوئے، اسی سال ہمدرد کے شعبۂ اسلامیات سے وابستہ ہوگئے، کالی کٹ یونی ورسٹی میں وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے بھی کام کیا، آخیر میں دارالعلوم دیوبند کی شیخ الہند اکیڈمی کے ڈائرکٹر بنے اور اس منصب پر ۲۵/دسمبر ۱۹۸۲ء سے وفات کے وقت تک فائز رہے، گویا زندگی کا علمی سفر دارالعلوم سے شروع ہوا اور دارالعلوم پر ہی ختم ہوا، جس ادارے نے ان کی ذہنی اور علمی پرداخت کی تھی اسی ادارے کی تحقیقی اور علمی خدمات انجام دے کر رخصت ہوئے، انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا اکبر آبادی قدیم طرز کے عالم نہ تھے جن کی نظر صرف متون وحواشی پر ہوتی ہے اور جس کا دائرۂ کار صرف مدرسہ کی چہار دیواری ہوتی ہے، انھوں نے قدیم وجدید کے امتزاج سے اپنے لئے الگ راستہ چنا تھا، ان کا مزاج علمی بھی تھا اور تحقیقی بھی تھا، جس طرح وہ علوم اسلامیہ کے قدیم مآخذ سے بہ راہ راست استفادہ کرسکتے تھے اسی طرح انگریزی علوم کے مآخذ پر بہ طور خاص مستشرقین کی کتابوں پر بھی ان کی گہری نظر تھی شعبۂ دینیات مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے تیرہ سالہ قیام نے ان کے ذہن وفکر کو جلا بخشی ان کے دور میں اس شعبے نے بیش قیمت تحقیقی کام انجام دئے، دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ

کے رکن کی حیثیت سے ان کو مدارس کی دنیا میں احترام کی نظروں سے دیکھا جاتا رہا شعبۂ دینیات کے صدر کی حیثیت سے وہ یونی ورسٹیوں کے ماحول پر چھائے رہے ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ کوئی شخص دو متضاد راستوں پر چل کر منزل پر پہنچتا ہو، مولانا نے ان ہونی کر کے دکھلائی، آج صدر جنرل ضیاء الحق جیسا جدید تعلیم یافتہ شخص حرف شناسی کے احسان سے دبا جاتا ہے تو دوسری طرف مدارس کے پروردہ بھی ان کی خدمات کو سلام پیش کرتے ہیں۔

مولانا اکبر آبادی کو بچپن ہی سے دیو بند کے ایک معزز گھرانے کے فرد مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کی معیت اور رفاقت حاصل رہی، اس رفاقت نے ان کی علمی ترقی اور شہرت میں کلیدی رول ادا کیا، ڈابھیل وہ مفتی صاحب کے ساتھ تشریف لے گئے کلکتہ بھی ان ہی کی تحریک پر جانا ہوا، وہاں بھی یہ دونوں حضرات ساتھ رہے، اس سے پہلے دہلی کے قیام میں بھی دونوں ایک دوسرے کے رفیق بنے رہے، ۱۹۳۷ء میں جب کلکتے کے ایک مخیّر تاجر کے عطیات سے ندوۃ المصنفین کا قیام عمل میں آیا تو مولانا اکبر آبادی کی تحقیق وتصنیف کا دور شروع ہوا، انھیں مفتی صاحب نے ندوۃ المصنفین کے ماہانہ علمی ترجمان ''برہان'' کا ایڈیٹر بھی مقرر کیا، کچھ دن با قاعدہ ایڈیٹر رہے، بعد میں انتظامی ذمہ داریوں سے الگ ہو گئے، لیکن مرتب کی حیثیت سے ان کا نام برہان کے ٹائٹل پر ہمیشہ جگمگاتا رہا، اور نام سے زیادہ ان کا کام برہان کے وقار میں اضافہ کرتا رہا یہ سلسلہ وفات تک جاری رہا، اس طرح ندوۃ المصنفین کے ایک محقق اور مصنف رفیق کی حیثیت سے اور ماہ نامہ برہان کے لائق مدیر اور مرتب کی حیثیت سے انھوں نے علمی دنیا میں بڑا نام کمایا اور ان کی شہرت کا سفر کبھی ختم نہ ہونے والا سفر بن گیا۔

ندوۃ المصنفین سے ان کی پہلی کتاب الرق فی الاسلام (اسلام میں غلامی کی حقیقت) ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئی، ۱۹۴۰ء میں دوسری کتاب موالی (غلامان اسلام)

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

کے نام سے چھپی، اسی سال فہم قرآن کی اشاعت عمل میں آئی، دو سال بعد ''مسلمانوں کا عروج وزوال'' شائع ہوئی، اس طرح ان کی پے در پے کئی تحقیقی کتابیں منظر عام پر آئیں اور ان کے قلم نے علم وتحقیق کی دنیا میں تہلکہ برپا کردیا، ان کتابوں کے علاوہ جن کا ابھی ذکر ہوا مولانا کے گوہر بار قلم سے کچھ اور کتابیں بھی نکلیں جن میں سے چند یہ ہیں وحی الٰہی، صدیق اکبر، عثمان ذوالنورین، تدوین حدیث، فتنہ وضع حدیث اور اس کا مکمل انسداد، حضرت عبداللہ ابن مبارک، پہلی صدی میں مسلمانوں کے رجحانات، خواتین اسلام، عہد نبوی کے غزوات وسرایا اور ان کے ماخذ پر ایک نظر مولانا عبیداللہ سندھی اور ان کے ناقد وغیرہ زیادہ تر کتابیں قسط وار مضامین کی شکل میں لکھی گئیں، اور مجموعی شکل اختیار کرنے سے پہلے رسالہ برہان میں چھپیں، اب بھی بے شمار مضامین ایسے ہیں جو برہان کے صفحات پر موجود ہیں اور وہ کسی کتاب کا حصّہ نہیں بنے ہیں، ضرورت ہے ان مضامین کو مقالات سعید اکبر آبادی یا کسی اور عنوان سے شائع کر کے محفوظ کر دیا جائے۔

آخری کتاب غالبًا ان کی حضرت عثمان ذوالنورین ہے، جسے وہ کئی سال تک لکھتے رہے، مراجع کی تلاش میں ان کو کافی مشقت بھی برداشت کرنی پڑی، موضوع نازک تھا اور متضاد روایتوں سے کتابیں بھری ہوئی تھیں، مولانا مودودی کی خلافت وملوکیت نے حضرت عثمانؓ کی پاکیزہ شخصیت کو کسی حد تک متہم کر دیا تھا، اور ان کے خون ناحق کی ذمہ داری خود ان ہی کے اقدامات پر ڈالی جارہی تھی، ایسے حالات میں انھوں نے عثمان ذوالنورین جیسی بلند پایہ اور تحقیقی کتاب کی تالیف کا فیصلہ کیا، کتاب قدیم اور مستند حوالوں کی بنیاد پر لکھی گئی ہے، اور ان سے نتائج اخذ کئے گئے ہیں، اس طرح یہ کتاب حضرت عثمان ذوالنورینؓ کے حالات وخدمات کا ایک مرقع ہی نہیں بلکہ اسلام کے ابتدائی دور کے اختلافات ونزاعات کی ایک مکمل تاریخ بھی ہے، مولانا اکبر آبادی

کی تمام کتابوں میں تحقیق کا یہی رنگ جھلکتا ہے۔

برہان کے صفحات پر مولانا اکبرآبادی کے بلند پایہ اور قیمتی مضامین ومقالات بھی شائع ہوتے رہے، اور ساتھ ہی وہ ہر ماہ نظرات بھی لکھتے رہے، نظرات ادارتی تحریروں کا سلسلہ تھا جن میں مولانا بحیثیت مدیر گردوپیش کے حالات وواقعات پر اپنے مشاہدات پیش کرتے رہے، یہ برہان کی قیمتی تحریریں تھیں، ان سے جہاں ایک طرف چالیس سال کے ملکی اور بین الاقوامی حالات سامنے آتے ہیں وہاں دوسری طرف یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ایک عالم اور محقق جس کا سیاست سے کوئی ادنیٰ تعلق بھی نہیں ہے وہ ان حالات کے متعلق کیا رائے رکھتا ہے اور ان حالات کو کس زاویۂ نگاہ سے دیکھتا ہے، نظرات کا یہ سلسلہ بڑا طویل ہے اور ان کی جمع وترتیب کے لئے کئی ضخیم جلدیں بھی ناکافی ہوں گی۔

نظرات میں انھوں نے ہمیشہ ایسے مسائل پر گفتگو کی ہے جن کا تعلق مسلمانوں کے حال اور مستقبل سے ہو، ان کا قلم بے باک اور جری تھا، جو بات جس طرح انھوں نے محسوس کی اسی طرح لکھدی، دارالعلوم دیوبند کے ایک ذمہ دار رکن شوریٰ ہونے کے باوجود انھوں نے اپنے کئی مضامین میں مدارس عربیہ پر زور دیا کہ وہ حالات زمانہ کی رعایت کرتے ہوئے اپنے نصاب تعلیم میں ضروری تغیرات کریں، دوسری طرف وہ جدید تعلیم کے اداروں کو بھی ضرورت کے مطابق دینی تعلیم اختیار کرنے کا مشورہ دیا کرتے تھے۔

مولانا کا اسلوب نگارش سادہ وشگفتہ تھا، کبھی کبھی وہ شبلی اور ابوالکلام آزاد کے رنگ میں بھی لکھتے نظر آتے ہیں، مثال کے طور پر انھوں نے حکیم الاسلام قاری محمد طیبؒ کی وفات پر اپنی تحریر کا آغاز ان جملوں سے کیا! ”وادریغا! دودمان قاسمی کا لعل شب چراغ گم ہوگیا، چمن زار دارالعلوم دیوبند کا گل سرسبد مرگ کی باد صرصر سے نذر خزاں ہوگیا

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

مرکز علم وعرفاں کی شمع فروزاں بجھ گئی، حسن بیان وخطابت کے ایوان میں زلزلہ آگیا مسند وعظ ومصطبۂ ارشاد وہدایت بے رونق ہوگئے'' وہ یہ بات مانتے تھے کہ ان کا اسلوب نگارش منت کش شبلی وداغ ہے، تحقیقی کتابوں میں وہ سادہ وپُرکار نثر استعمال کرتے ہیں لیکن ادبی چاشنی ہر حال میں برقرار رہتی ہے۔

راقم الحروف کو ان کی تحریریں پڑھنے کا موقع تو خوب ملا لیکن ان کی تقریریں سننے کی سعادت کبھی حاصل نہ ہوسکی، جن لوگوں نے ان کو سنا ہے وہ یہ اعتراف کرتے ہیں، کہ ان کی تقریر بھی نہایت مرصّع، مرتب اور جامع ہوا کرتی تھی، ایام طالب علمی میں انھوں نے تقریر کی مشق کی تھی، شروع میں مولانا ابوالکلام آزاد کے لہجے کی نقل کیا کرتے تھے مگر حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی کی اس نصیحت پر کہ ''نامور مقررین کی نقل کرنا برا نہیں ہے لیکن اس کو اپنی عادت نہ بنانا چاہئے'' انھوں نے اپنا راستہ الگ بنایا، تاہم میدان خطابت ان کا اصل میدان کبھی نہیں رہا، درس وتدریس کا سلسلہ بھی ان کے مزاج سے میل نہیں کھاتا تھا، بنیادی طور پر وہ لکھنے لکھانے کے آدمی تھے، اسی حوالے سے انھوں نے نام کمایا اور اسی حوالے سے وہ شہرت دوام حاصل کر گئے۔

راقم السطور نے مولانا اکبرآبادی کو ان دنوں بار بار دیکھا ہے جب وہ دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ میں شرکت کے لئے دیوبند تشریف لایا کرتے تھے، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی اور وہ دونوں ایک ہی ٹرین سے دیوبند پہنچتے، مہمان خانے کے ایک ہی کمرے میں ان دونوں حضرات کا قیام ہوتا، ان دونوں حضرات کی دوستی ضرب المثل تھی جو بچپن سے شروع ہوئی اور عہد شباب سے گزرتے ہوئے بڑھاپے تک پہنچی، اگرچہ زندگی کے سفر میں کئی پیچ وخم اور نشیب وفراز بھی آئے لیکن دونوں کی دوستی اپنی جگہ برقرار رہی، دارالعلوم کے قضیۂ نامرضیہ میں مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کھُل کر حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب کے ساتھ تھے، جب کہ مولانا سعید اکبرآبادی نے نئی انتظامیہ

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

کے ساتھ اپنے رشتے استوار کئے بلکہ شیخ الہند اکیڈمی کی ملازمت بھی قبول کی، اس معاملے میں ان دونوں کے راستے دیوبند میں جدا ضرور ہوئے لیکن دہلی کے اُردو بازار میں واقع ندوۃ المصنفین کی عمارت اور اس سے ملحق مفتی صاحب کے مکان پر ان کی راہیں پھر مل جاتی تھیں، دونوں بزرگوں کی اس وضع داری نے اس وقتتک دونوں کو ایک ساتھ باندھ کر رکھا جب تک ایک نے دوسرے کا مستقل ساتھ نہیں چھوڑا۔

بات دیوبند کی چل رہی تھی، مولانا سعید اکبر آبادی دراز قامت شخص تھے، لیکن چہرے کے نقوش سادہ اور رنگ وروپ دبتا ہوا تھا، تاہم سراپا پُر وقار تھا، علی گڑھی کرتا پاجامے پر شیروانی زیب تن کئے رہتے، میں نے انھیں جب بھی دیکھا شیروانی میں دیکھا، ہم طلبہ اکثر وبیشتر شوریٰ کے موقع پر اراکین شوریٰ سے ملنے کے لئے ان کے کمروں میں جایا کرتے تھے، کبھی کسی مسئلے کو لے کر اور کبھی صرف زیارت وملاقات کے لئے، ان دونوں حضرات سے ایک ہی کمرے میں ملاقات ہوا کرتی تھی، بات صرف حضرت مفتی صاحب سے ہوتی، وہی حال احوال پوچھتے، مولانا اکبر آبادی یا تو لیٹے ہوئے کوئی کتاب یا اخبار پڑھتے رہتے یا اپنے بیڈ پر پاؤں لٹکائے ہوئے بیٹھے رہتے اور کسی گہری سوچ میں مستغرق رہتے۔

۱۹۷۹ء میں احقر کسی کام سے علی گڑھ گیا اور وہاں اپنے دوست ڈاکٹر نعمان دانش کے پاس ان کے ہوسٹل میں ٹھہرا جوان دنوں علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے طبیہ کالج سے بی یو ایم ایس کر رہے تھے، ایک دن خیال آیا کہ مولانا اکبر آبادی سے بھی ملاقات کرنی چاہئے، مولانا انہی دنوں اپنے نوتعمیر مکان میں منتقل ہوئے تھے، عصر کا وقت تھا، اندر سے تشریف لائے، پوچھا کیا کر رہے ہو میں نے عرض کیا کہ احیاء العلوم کا اردو ترجمہ کر رہا ہوں، فرمانے لگے بھئی دیوبند کے مولوی ترجمے اور شرحیں ہی کرتے رہتے ہیں، تحقیق اور تصنیف وتالیف کی دنیا میں قدم کیوں نہیں رکھتے، دیر تک اسی

موضوع پر گفتگو کرتے رہے، اپنے اکابر کا ذکر خیر کرتے رہے، جس وقت وہ شیخ الہندؒ اکیڈمی کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے دیوبند تشریف لائے تب بھی ان سے گاہ بہ گاہ ملاقات ہوتی رہی مگر وہ اس وقت بجھتے ہوئے شعلے کی طرح ہو گئے تھے، اداس اور خاموش رہتے، اس کی وجہ شاید یہ بھی ہو کہ دیوبند اب وہ دیوبند نہیں رہا تھا، دارالعلوم کے درودیوار میں وہ انسیت انھیں محسوس نہیں ہوتی تھی جس کے وہ ایک عرصے تک عادی رہے تھے، شوریٰ کے معزز رکن کی حیثیت سے ان کی شان ہی نرالی تھی، کیا مدرس کیا ملازم کیا طالب علم سب ہی ان کے لئے دیدۂ و دل فرش راہ کئے رہتے تھے، ان کی بات سنی جاتی تھی، آج وہ اپنے علم و فضل کے باوجود اس ادارے کے ایک شعبے کے سربراہ کی حیثیت سے مقیم تھے، ڈائرکٹر کتنا ہی اعلیٰ و ارفع لفظ کیوں نہ ہو، اور یہ عہدہ کتنا ہی اونچا کیوں نہ ہو تھے تو وہ ماتحت ہی، آخر میں انھیں جان لیوا بیماری لاحق ہو گئی تھی، اس نے انھیں بہت زیادہ مضمحل اور مایوس کر دیا تھا، اسی حالت میں وہ پاکستان گئے اور اسی سرزمین کی خاک کا پیوند بن گئے، صدر پاکستان نے اپنے ایک تعزیتی خط میں جو انھوں نے ان کی صاحبزادی بیگم مسعودہ سعید کے نام لکھا تھا ان الفاظ میں مولانا مرحوم کو خراج عقیدت پیش کیا ہے ”مولانا مرحوم ایک جیّد عالم، بلند پایہ محقق اور مشہور مصنف تھے، وہ ذہنی فکری اور عملی لحاظ سے پکّے مسلمان تھے، اور عجیب اتفاق ہے کہ وہ ایک مسلمان ملک کی سرزمین پر اللہ تعالیٰ کو پیارے ہوئے اور اسی کی خاک کو اپنی ابدی آرام گاہ کے طور پر اپنایا“ دعا ہے اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کو اپنی رحمتوں کے سائے میں جگہ دے اور ان کو آخرت میں راحت و آرام سے نوازے۔

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

مشفق، مربی، محسن، کرم فرما

رئیس القلم حضرت مولانا سید ازہر شاہ قیصرؒ

بڑے شاہ جی بھی رخصت ہوگئے، بڑے شاہ جی سے میری مراد رئیس القلم مولانا سید ازہر شاہ قیصر سے ہے، حضرت علامہ انور شاہ کشمیری کے بڑے صاحبزادے ہیں، ان کے جانے سے دیوبند کے ادبی حلقوں میں زبردست خلاء پیدا ہوگیا ہے، وہ بہترین ادیب تھے، نامور صحافی اور مصنف تھے، قادرالکلام شاعر تھے انھوں نے بہت سے اخبارات رسائل کی ادارت کی، سینکڑوں مضامین لکھے، خوب کام کیا، بڑا نام کمایا، دارالعلوم دیوبند جیسے عظیم الشان ادارے کے اُردو ترجمان ماہ نامہ ''دارالعلوم'' دیوبند کی ادارت کے منصب پر ۱۹۵۱ء سے ۱۹۸۲ء تک تقریباً تیس سال تک فائز رہے، جانا سب کو ہے، شاہ جی کو بھی جانا تھا، چلے گئے، لیکن اپنے پیچھے ایک ایسا خلاء چھوڑ گئے ہیں جو بہت جلد پُر ہونے والا نہیں ہے، رسالہ دارالعلوم کو دوسرا مدیر مل جائے گا، لیکن مجھ جیسے لوگوں کو ان جیسا مشفق و مربی و محسن اور کرم فرما نہیں ملے گا جب ان کا خیال آتا ہے قلب ونگاہ میں ان کی شفقتوں اور محبتوں کے ہزاروں مناظر رقص کرنے لگتے ہیں جنھیں میں چاہوں بھی تو قلم کے ذریعے مجسم نہیں کرسکتا، مضمون لکھنے بیٹھا ہوں تو بہت کچھ یاد آرہا ہے، اتنا کچھ یاد آرہا ہے کہ چھوٹی موٹی کتاب بن جائے، دل چاہتا ہے کہ کچھ لکھ کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرلوں۔

میں دورۂ حدیث شریف کا طالب علم تھا اور دارالعلوم دیوبند میں دفتر اہتمام کے نیچے ایک کمرہ میری رہائش گاہ تھا، اس کمرے کا راستہ احاطہ مولسری میں کنویں کے برابر سے ہوکر اوپر جاتا تھا، ایک دن میں اپنے کمرے میں جارہا تھا کہ دفتر رسالہ ''دارالعلوم'' کے ایک کارکن نے آواز دی اور کہا کہ تمھیں شاہ صاحب بلارہے ہیں، مجھے خیال ہوا کہ شاید حضرت مولانا انظر شاہ کشمیریؒ نے دفتر تعلیمات میں طلب کیا ہے، وہ ان دنوں نائب ناظم تعلیمات تھے، لیکن جب انھوں نے بڑے شاہ صاحب کہا تو معلوم ہوا کہ یہ طلبی رسالہ دارالعلوم کے ایڈیٹر جناب سید ازہر شاہ قیصر کی طرف سے ہوئی ہے، میں قاصد کے ساتھ ساتھ چل دیا، یہ شاید چوتھے گھنٹے کی بات تھی، وہاں پہنچا تو حضرت شاہ صاحب اپنی نشست گاہ پر گاؤ تکیئے کے سہارے اس طرح لیٹے ہوئے تھے کہ آدھے جسم پر رضائی پڑی ہوئی تھی اور اوپر کا حصہ رضائی سے باہر تھا، قریب میں مٹی کی تغاری میں کوئلے سُلگ رہے تھے، میں سلام کرکے بیٹھ گیا، حضرت شاہ جی نے فرمایا میں نے سنا ہے تم لکھتے ہو، میں خاموش رہا، فرمایا کیا لکھتے ہو، میں نے کہا دینی مضامین کہنے لگے کسی کو دکھلاتے بھی ہو، میں نے عرض کیا نہیں، فرمایا مفتی ظفیر الدین کو دکھلا لیا کرو، پھر فرمایا مطالعہ وتالا بھی کرتے ہو، میں چپ رہا کہنے لگے پڑھا کرو تب ہی تو لکھنا آئے گا، اب جاؤ پھر آنا، یہ تھی پہلی ملاقات، اس کے بعد تو میں تقریباً روز جانے لگا، جب بھی کوئی گھنٹہ خالی ہوتا میں شاہ صاحب کے پاس جاکر بیٹھ جاتا یا کتب خانہ دارالعلوم میں چلا جاتا، ان کی مجلس میں بیٹھ کر بڑی معلومات حاصل ہوتی تھیں چوتھے گھنٹے میں تو ان کی مجلس بڑی پر رونق ہوا کرتی تھی، سید محبوب رضوی، مفتی ظفیر الدین مفتاحی، قاری عبداللہ سلیم، مولانا محمد اسلم قاسمی، مولانا عبداللہ جاوید، مولانا بدرالحسن دربھنگوی، حکیم عزیز الرحمٰن اعظمی اور دوسرے حضرات اس مجلس میں پابندی کے ساتھ شریک ہوا کرتے تھے، یامین چائے والے کے یہاں سے چائے آتی شاہ صاحب

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

چائے کے ساتھ پاپے ضرور کھاتے تھے، کبھی کبھی اس مجلس میں مولانا انظر شاہ کشمیری بھی تشریف لایا کرتے تھے، کبھی مولانا حامد الانصاری غازی اور پیش کار عبدالحق صاحب بھی آ کر بیٹھ جاتے تھے، بڑی باغ و بہار مجلس ہوا کرتی تھی، قصّے، لطیفے، قہقہے، پتہ ہی نہیں چلتا تھا کب مجلس شروع ہوئی اور کب ختم ہوگئی، بعض اوقات شاہ صاحب پر خاموشی کا دورہ پڑتا تھا، بالکل چپ پڑے رہتے، یا بیٹھے رہتے اور کبھی طبیعت اس قدر کھُلی ہوتی تھی کہ بس وہ ہی وہ بولا کرتے تھے، ہزاروں اشعار نوک زبان تھے، ظفر علی خاں مرحوم کے اشعار تو اس قدر یاد تھے، کہ گھنٹوں سناتے رہتے، جو لوگ ظفر علی خان مرحوم کی شاعری سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ ان کی شاعری کس قدر مشکل ہے، ایسے ایسے قافیے نکال کر لاتے ہیں کہ اچھوں اچھوں کو پسینے آ جاتے، مجھے اس کا اعتراف کرنا چاہئے کہ اس مجلس شعر و ادب سے مجھے بڑا فائدہ ہوا ہے، اگر میں یہ کہوں کہ لکھنے پڑھنے کے شوق میں اضافہ اسی مجلس سے ہوا تو غلط نہ ہوگا۔

حضرت شاہ صاحب اپنے چھوٹوں کی ذہنی اور علمی تربیت میں بڑی دل چسپی لیتے تھے، ان سے مضامین لکھواتے، پھر انھیں رسالہ دارالعلوم میں چھاپتے، یا کسی اور جگہ چھپنے کے لئے بھیج دیتے، ایک مرتبہ دارالعلوم کے دفتر اہتمام میں ماہ نامہ نقوش لاہور کے مدیر طفیل احمد صاحب کا خط آیا کہ وہ سیرت نمبر نکال رہے ہیں، اپنے علما سے مضامین لکھوایئے، شاہ صاحب نے مجھ سے فرمایا تم بھی لکھو، میں نے ایک تفصیلی مضمون لکھا جس کا عنوان تھا ''سیرت نگاری کے کچھ اہم پہلو'' یہ میرا پہلا تحقیقی مضمون تھا، مجھے بڑی محنت کرنی پڑی تھی، لکھ کر شاہ صاحب کو دیا، اس زمانے میں فوٹو اسٹیٹ مشین تو تھی نہیں، خود ہی اس مضمون کی دو نقلیں بھی تیار کیں، شاہ صاحب نے میرا مضمون اپنے خرچ پر نقوش کو روانہ کر دیا، مجھے چھپنے کی امید بھی نہیں تھی، لیکن چند ماہ کے بعد اچانک نقوش سیرت نمبر کی پہلی جلد کے کچھ نسخے دارالاہتمام میں آئے، دیکھ

کر شادیٔ مرگ سی طاری ہوگئی، جلد اوّل کا پہلا مضمون حضرت مولانا ابوالحسن ندویؒ کا تھا، دوسرا مضمون حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کا تھا، اور تیسرا مضمون میرا تھا اتنے بڑے بڑے بزرگوں کے ساتھ اپنا مضمون دیکھ کر راقم خوشی سے پھولا نہ سمایا مجھے آج تک یہ فخر ہے کہ یہ مضمون اس خاص نمبر کی زینت بنا، اور اساطین علم وادب اور مشاہیر فکروفن کے مضامین کے پہلو بہ پہلو شائع ہوا، یہ سب شاہ صاحب کی برکت سے ہوا بعد میں یہ مضمون رسالہ برہان دہلی میں بھی چھپا اور رسالہ دارالعلوم میں بھی شائع ہوا، ایک مرتبہ مظفرنگر میں قادیانیوں نے اپنا دفتر قائم کرلیا اور دفتر پر احمدی مشن کا بورڈ بھی لگادیا، مسلمانوں میں بڑی تشویش پھیلی، جلسے جلوس ہوئے، اخبارات میں منفی مثبت خبریں اور بیانات چھپے، ہندی اخبارات نے کافی لے دے کی، اس موقع پر شاہ صاحب نے مجھ سے فرمائش کی کہ میں قادیانیت پر ایک تفصیلی مضمون لکھوں چنانچہ میں نے ایک لمبا چوڑا مضمون لکھا ''قادیانی فتنہ-تکفیر کی بنیاد'' شاہ صاحب نے خود ہی اس کی نقلیں تیار کرائیں اور ہندوپاک کے کم وبیش بیس اخبارات وجرائد کو یہ مضمون روانہ کیا، روز نامہ ''الجمعیۃ'' نے یہ مضمون کئی قسطوں میں شائع کیا، خود شاہ صاحب نے بھی میرا یہ مضمون رسالہ دارالعلوم میں دو قسطوں میں چھاپا اور اس پر یہ نوٹ لکھا ''میری فرمائش پر دارالعلوم دیوبند کے ایک نوجوان فاضل مولانا ندیم الواجدی نے ذیل کے مضمون میں قادیانی فرقے کی زمینی حقیقت اوراس کے سیاسی پس منظر پر بصیرت افروز روشنی ڈالی ہے، اس پرانی بحث کو از سر نو زندہ کرنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ ہمارے ملک کے بعض اخبارات جو کسی بھی مسئلے کی بنیادوں تک پہنچ کر اس کی حقیقت کا سراغ لگانے کے بجائے ہر مسئلے اور ہر بحث کو فرقہ وارانہ ذہن سے سوچنے اور دیکھنے کے عادی ہیں قادیانیت پر بڑے گمراہ کن مضامین شائع کررہے ہیں، امید ہے کہ عزیز موصوف کا یہ مضمون عوام کو بہت سے تاریخی اور مذہبی حقائق سے

روشناس کرائے گا اور مسئلے کی وہ گہرائیاں سامنے آجائیں گی جن کی بنا پر قادیانیوں کو دائرہ اسلام سے خارج قرار دیا گیا ہے'' از ہر شاہ قیصر (رسالہ دارالعلوم ستمبر ۱۹۷۴ء)

شاہ جی مجھ سے مختلف موضوعات پر مضامین لکھواتے رہے اور خود ہی اخبارات و رسائل کو بھیجتے رہے، اس طرح میرا شوق بھی بڑھ رہا تھا، رہ نمائی بھی مل رہی تھی، اور تعارف بھی ہو رہا تھا، پاکستانی اخبارات و رسائل یہ سمجھتے تھے کہ شاید لکھنے والا دارالعلوم کا کوئی استاذ ہے، چنانچہ میرے پاس ماہ نامہ الرشید لاہور دارالعلوم کے پتے پر آیا کرتا تھا اس پتہ پر میرے نام کے ساتھ لکھا ہوتا تھا استاذ دارالعلوم دیوبند، اس طرح کی چیزیں دیکھ دیکھ کر ڈھیروں خون بڑھتا تھا، ایک مرتبہ مولانا وجدی الحسینی بھوپالی نے اپنی نعتیہ شاعری کا مجموعہ برائے تبصرہ شاہ جی کی خدمت میں پیش کیا، فوراً آدمی بھیج کر کمرے سے مجھے بلایا، میں حاضر ہوا، مولانا وجدی الحسینی سے میرا تعارف کرایا، پھر فرمایا تمہیں اس پر تبصرہ لکھنا ہے، تم نعتیہ شاعری پر ایک مکمل مضمون لکھو اور اس کا عنوان ہونا چاہئے ''عربی، فارسی اور اُردو میں نعتیہ شاعری'' میں نے یہ مضمون لکھا اور غالباً اس کی دو قسطیں رسالہ دارالعلوم میں شائع ہوئیں، ایک دفعہ کہنے لگے کہ ہمارے علما بڑی اچھی نثر لکھتے ہیں، مذہبی کتابوں میں تمہیں اعلیٰ درجے کی نثر مل جائے گی تم اگر حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ سے لے کر موجودہ دور کے مفتی شفیع عثمانی اور قاری محمد طیب صاحب تک کی کتابوں سے معیاری ادب کے نمونے جمع کر کے ایک مضمون لکھ دو تو بڑا اہم کام ہو جائے گا، میں نے یہ کام شروع کیا، کافی نمونے کاپی میں لکھ بھی لئے، لیکن میں بہ سلسلۂ ملازمت حیدر آباد چلا گیا شاہ جی صاحب کو بڑا افسوس رہتا تھا، میرے حیدر آباد جانے کا بھی اور یہ موضوع تشنہ رہ جانے کا بھی اجلاس صد سالہ کے موقع پر الرشید لاہور والے دارالعلوم دیوبند نمبر لانا چاہتے تھے دارالاہتمام میں مضامین کی فرمائش آئی، شاہ صاحب نے مجھے موضوع دیا ''دارالعلوم

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

دیوبند- ماضی حال اور مستقبل'' چنانچہ میں نے مضمون لکھا، شاہ جی نے حسب معمول میرا مضمون اپنے مصارف پر لاہور بھیج دیا۔

شاہ جی کی توجہ سے نہ تو موضوع تلاش کرنا پڑتا تھا، اور نہ مواد کے لئے بھٹکنا پڑتا تھا، ہر طرح کی رہ نمائی شاہ جی خود کردیا کرتے تھے، پھر کسی کو بلا کر اس مضمون کی نقل بھی خود ہی کرالیا کرتے تھے اور اسے خود ہی اخبارات ورسائل کو بھیج بھی دیا کرتے تھے، جب تک میں دارالعلوم میں رہا، شاہ جی کی یہ نوازشات لگاتار جاری رہیں، ایک مرتبہ حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین مفتاحی دارالعلوم سے باہر تھے، ہر ماہ اداریہ وہ لکھا کرتے تھے ان کی عدم موجودگی میں شاہ جی نے مجھ سے فرمایا اس مرتبہ اداریہ تم لکھو میں نے ولی اللہی فکر اور مدارس کا نصاب کے موضوع پر اداریہ لکھا، پاکستان کے کئی رسالوں نے وہ تحریر نقل کی، اور مولانا زاہد الراشدی نے تو اس پر زبردست تبصرہ بھی لکھا۔

شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ وزیراعلیٰ جموں وکشمیر نے سری نگر میں حضرت علامہ سید انور شاہ کشمیری کی حیات وخدمات پر ایک کل ہند سمینار کے انعقاد کا پروگرام بنایا، اس پروگرام میں قلمی اور علمی تعاون کی ذمہ داری شاہ جی کی تھی، انھوں نے ہی سب سے رابطے کئے، خطوط لکھے جاکر ملے، مضامین کے لئے تقاضے کئے، از راہ عنایت ومحبت لکھنے والوں میں میرا نام بھی شامل کیا، میں کیا میری بساط کیا، عمر بھی بہت کم تھی، اور سمینار کے شرکاء میں حضرت علامہ کشمیری کے باکمال شاگردوں کے علاوہ ملک کے نام وَرْ اصحاب قلم بھی تھے، مگر جیسا کہ میں نے عرض کیا شاہ جی میں خورد نوازی بہت تھی، اور وہ جم کر حوصلہ افزائی کیا کرتے تھے، چنانچہ انھوں نے فرمایا سرینگر سمینار میں چلنا ہے حسب معمول میرے مضمون کے موضوع کا انتخاب انھوں نے خود کیا'' دارالعلوم دیوبند کا علمی مسلک علامہ کشمیری کے نقطۂ نظر سے'' موضوع بڑا وقیع اور محنت طلب تھا، مگر سری نگر جانے کے شوق نے تمام مشکلات آسان کردیں، مضمون لکھنے میں دس بارہ دن

لگے، اس دوران شاہ جی نے دس بارہ ہی پرچیاں تقاضے کی مجھے بھیجی ہوں گی، مضمون کتنا ہوا ہے آج کیا لکھا ہے، کب تک پورا ہوگا، ہوسکتا ہے شاہ جی یہ سمجھ رہے ہوں یہ لڑکا اس موضوع پر لکھ بھی سکے گا یا نہیں، بہ ہر حال شاہ جی کی حسن توجہ سے میں نے مضمون لکھا، شاہ جی کے ساتھ سرینگر گیا، سمینار میں شرکت کی، مضمون پڑھا اور سرخ رو واپس آیا، سرخ رو اس لئے کہ مضمون سن کر حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی نے اپنے صدارتی خطبے میں میرے مضمون کے متعلق بڑے حوصلہ افزا کلمات ارشاد فرمائے، ایک صاحب نے جو پروگرام کی نظامت کر رہے تھے فرمایا کہ ہمیں جتنے بھی مضامین ملے ان سب میں یہ مضمون نہایت جامع اور باحوالہ تھا، حضرت مولانا مولانا حامد الانصاری غازی نے مضمون پڑھنے سے پہلے اسٹیج پر تشریف لا کر دل کھول کر راقم کی تعریف کی۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کی وفات کے بعد ان کی سوانح عمری لکھنے کا معاملہ تھا، کچھ حضرات مشورے کے لئے بیٹھے، سوال ہوا یہ کام کون کرے گا، شاہ جی نے بلا تکلف میرا نام لیا، اور مجھے بلا کر کہا بھی کہ تمہیں بھائی جیؒ (شاہ جی حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کو بھائی جی کہا کرتے تھے) سوانح لکھنی ہے اس طرح لکھنی ہے، ایسی لکھنی ہے، ویسی لکھنی ہے، مجھے حضرت مولانا محمد سالم قاسمی اور حضرت علامہ رفیق احمدؒ وغیرہ حضرات نے طلب بھی کیا، اگر چہ بعض وجوہات کی وجہ سے یہ کام نہ ہوسکا جس کا شاہ جی کو بڑا املال تھا اور اُن سے زیادہ مجھے رنج تھا، بہ ہر حال یہ کام ابھی بھی ایک قرض کی صورت باقی ہے، دیکھئے کب اور کون یہ قرض ادا کرتا ہے۔

بہ ہر حال شاہ جی کی توجہات سے بڑا حوصلہ ملا کرتا تھا، ان کی مجلس میں بیٹھ کر معلومات بھی ہوا کرتی تھی، دارالعلوم دیوبند کے تمام لکھنے اور پڑھنے والے ان کے دفتر میں جمع ہو جایا کرتے تھے اور وہ ایک گھنٹہ بڑا اچھا گزرتا تھا، ہمیں نہ بولنے کا سلیقہ

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

تھا اور نہ ہمت وحوصلہ بس سب کی باتیں سنا کرتے تھے۔

شاہ جی کو مجھ پر بڑا اعتماد تھا اور بے حد تعلق بھی، کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ شاہ جی دہلی وغیرہ گئے اور رات کو وہاں رکنے کا پروگرام ہوا تو مجھے رات میں گھر پر رہنے کے لئے فرما گئے، چنانچہ میں راحت شاہ اور نسیم شاہ وغیرہ کے ہمراہ اوپر کے کمرے میں لیٹا دراصل شاہ جی کا مکان تھا تو پُر رونق جگہ پر دارالعلوم کے پڑوس میں، مگر آس پاس کی آبادی چورا چکوں پر مشتمل تھی، شاہ صاحب چاہتے تھے کہ ان کی عدم موجودگی میں بچوں کے ساتھ کوئی رہے، حالاں کہ میں خود بھی بچہ ہی تھا، اور ان کے بڑے لڑکے راحت شاہ کے ہم عمر ہی تھا، مگر شاہ جی کو یہ ڈھارس رہتی تھی کہ گھر پر کوئی ہے، ایمرجنسی کے دوران جب اخبارات ورسائل پر پابندی لگ گئی تو ایل آئی یو کا محکمہ ہر اخبار اور رسالے پر نظر رکھتا تھا، اور اس کو دکھلا کر ہی مضامین وخبریں وغیرہ چھپتی تھیں رسالہ دارالعلوم اُردو میں تھا، اور ایل آئی یو کے افسران اُردو نہیں جانتے تھے میں دفتر رسالہ کا رکن بھائی نسیم پر ویز کے ساتھ جا کر افسران کو پورا رسالہ پڑھ کر سنا تا تھا، جہاں ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا اس کی تشریح بھی کیا کرتا تھا اور ہم دونوں گھنٹوں لگا کر، دماغ کھپا کر یہ کام کرتے تھے، اور منظوری لے کر واپس آتے تھے۔

دارالعلوم دیوبند میں جو حالات رونما ہوئے ان سے دل برداشتہ ہو کر شاہ جی گوشہ نشین ہو گئے تھے، اقتصادی طور پر بھی پریشان رہا کرتے تھے، اور ذہنی طور پر بھی تکلیف میں مبتلا تھے، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ سے والہانہ عقیدت اور محبت تھی، دارالعلوم کے اہتمام سے ان کی علیحدگی کا شاہ جی کو بڑا غم تھا حضرت مہتمم صاحبؒ کے انتقال کے بعد تو گویا ان کا دل ٹوٹ گیا تھا بہت زیادہ مغموم وافسردہ رہنے لگے تھے، اپریل ۱۹۸۵ء کے آغاز میں رات کے وقت شاہ جی کو سخت بخار ہوا، اور یہ بخار کئی دوسرے امراض کا سبب بن گیا، اسی اثناء میں قلبی دورہ پڑا، مظفر نگر

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

میں علاج سے جاں بر تو ہو گئے لیکن پوری طرح صحت یاب نہ ہو سکے، اور بستر کو لگ گئے، یہ کیفیت مسلسل نو دس مہینے تک رہی بیماری کے دوران کئی مرتبہ دولت کدے پر حاضری ہوئی، پوچھا کیسی طبیعت ہے، فرمایا بہتر ہے، اچھی ہے، آخر میں بالکل مفلوج ہو گئے تھے، ہاتھ بھی نہیں اٹھتے تھے، خود سے کھانا پینا بھی مشکل تھا، اسی حالت میں ۲۷/نومبر ۱۹۸۵ء کی دوپہر شاہ جی نے آخری سانس لی، اور اس طرح قلم کا یہ شہنشاہ ہم سب سے رخصت ہو کر اپنے والد کے قدموں میں جا سویا۔

شاہ جی حافظ قرآن تھے، ساری زندگی اہل علم کی صحبت میسّر رہی، عمر کے آخری نو دس مہینے جس بے کسی اور معذوری کے گزرے اس نے انھیں بے حد حسّاس بنا دیا تھا، انھوں نے ایسی حالت میں جب کہ ہاتھوں سے بالکل معذور ہو گئے تھے اور زبان سے بھی الفاظ بہ مشکل ادا کر پاتے تھے اپنے کسی بیٹے کو یہ مضمون املا کرایا کہ ”مجھ سے اپنی صحافتی زندگی میں بڑے بڑے عجیب گناہ سرزد ہوئے ہیں، میں نے ہمیشہ خلوص سے لکھا لیکن خود اس کا استعمال بھی ہر جگہ یکساں نہیں ہونا چاہئے، میں ان لوگوں سے جن کو دانستہ یا نادانستہ میرے قلم سے تکلیف پہنچی ہے معافی مانگتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ وہ میری موجودہ بے چینی، بے بسی اور بے کسی کو سامنے رکھ کر اپنی محبت اور کرم فرمائی سے مجھے معاف فرمائیں گے، جو حضرات اس دنیا سے گزر چکے ہیں مگر ان کی اولاد باقی ہے ان کی اولاد سے میری درخواست ہے کہ وہ اپنے بڑوں کی طرف سے مجھے معاف فرمائیں“ یہ احساس ندامت ہی مومن کی معراج ہے، اور شاہ جی اس معراج تک پہنچنے میں کامیاب رہے ہیں، میری دُعا ہے اللہ تعالیٰ انھیں اعلیٰ علیین میں جگہ دے، ان کی لغزشوں اور خطاؤں پر اپنے عفو و کرم کا پردہ ڈال دے، ان کے پسِ ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

ملت کے عظیم رہ نما

امیر شریعت حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ

۳؍رمضان المبارک ۱۴۱۱ھ ۲۰؍مارچ ۱۹۹۱ء کی شب دارالعلوم دیوبند کی مسجد قدیم میں تراویح کی نماز ختم چکی تھی، ابھی ہم لوگ مسجد سے باہر نکلنے بھی نہیں پائے تھے کہ لاؤڈ اسپیکر پر یہ اعلان نشر ہوا کہ دارالعلوم دیوبند کے رکن شوریٰ امیر شریعت حضرت مولانا منت اللہ رحمانی وفات پاگئے، صبح کچھ تفصیلات معلوم ہوئیں کہ رات تراویح کی نماز پڑھ رہے تھے عین حالت سجدہ میں دل کا دورہ پڑا اور انتقال فرما گئے بڑی ہی قابل رشک موت ہے، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے، بڑی بیش قیمت شخصیت تھے حضرت مولانا منت اللہ رحمانی، خاص طور پر ان حالات میں جو آج کل ہمارے ملک میں ہیں ان کا وجود بڑا غنیمت تھا، ان کی اس ناگہانی جدائی سے ملّت جو پہلے ہی مصائب میں مبتلا ہے ایک اور تازہ مصیبت میں گرفتار ہوگئی، اللہ تعالیٰ مدد فرمائے اور ملّت کو پھر کوئی دوسرا جری بے باک، دور اندیش، معاملہ فہم اور صائب الرائے قائد نصیب فرمائے، سب سے بڑا نقصان مسلم پرسنل لا بورڈ کو ہوا ہے جو مسلمانوں کی واحد متاع گراں مایہ ہے، اور جس کے وجود سے مسلمانوں کو بڑی امیدیں وابستہ ہیں، ابھی چند سال پہلے اس بورڈ کے بانی صدر حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رخصت ہوگئے تھے اور اب بانی جنرل سکریٹری بھی اللہ کو پیارے ہوگئے، آہستہ آہستہ بڑے لوگ رخصت

ہو رہے ہیں، اور جو رخصت ہو رہے ہیں ان کی جگہ لینے والا کوئی دوسرا نظر نہیں آتا۔

حضرت مولانا منت اللہ رحمانی، بانی دارالعلوم ندوۃ العلما حضرت مولانا محمد علی مونگیری کے چھوٹے صاحبزادے تھے، خانقاہ رحمانی مونگیر میں ۱۳۳۲ھ مطابق ۱۹۱۳ء کو پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد سے حاصل کی، کچھ وقت حضرت مولانا عبدالصمد رحمانیؒ کی خدمت میں رہے اور ان سے صرف ونحو کی ابتدائی کتابیں پڑھیں حیدر آباد میں ان کے والد بزرگوار کے ایک دیرینہ رفیق تھے ان سے معقولات کی کتابیں پڑھیں، چار سال دارالعلوم ندوۃ العلما میں رہے، ابھی زیر تعلیم ہی تھے کہ والد محترم وفات پا گئے،۱۹۳۰ء میں دارالعلوم دیوبند تشریف لائے اور مسلسل چار سال رہ کر یہاں مختلف علوم وفنون کی تکمیل کی،۱۹۳۴ء میں شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ سے بخاری پڑھی اور سند فراغت حاصل کی، ابتدا ہی سے ذہین تھے، پڑھنے لکھنے کا شوق تھا طالب علمی ہی کے دور سے مضامین لکھنے شروع کر دئے تھے،ابھی مدرسہ کی تعلیم فارغ بھی نہیں ہوئے تھے کہ جامعہ رحمانی مونگیر سے نکلنے والے ماہانہ رسالے الجامعہ کے ایڈیٹر بنادئے گئے اس سے علمی اور تحقیقی ذوق پیدا ہوا، ندوہ کے قیام نے بھی اس ذوق کو جلا بخشی اپنی صلاحیتوں کی بنا پر مولانا بہت جلد دارالعلوم کے ماحول پر چھا گئے، اسی دوران انھوں نے غیر درسی سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، بہاری طلبہ کی ایک انجمن بھی قائم کی جو آج بھی بزم سجاد کے نام سے موجود ہے، حضرت مدنیؒ کی قربت نے مولانا کے دل ودماغ میں آزادی کی چنگاری پیدا کی، جو بڑھتے بڑھتے بھڑکتے ہوئے شعلے کی شکل اختیار کر گئی، ابھی دارالعلوم دیوبند کے طالب علم ہی تھے کہ حضرت مدنی کی قیادت میں دہلی پہنچے انگریزوں کے خلاف نعرے لگاتے ہوئے گرفتار کر لئے گئے، ایک ہفتہ جیل میں رہ کر واپس دیوبند آ گئے، تحریک آزادی کے ایک نوجوان مجاہد کی حیثیت سے ان کی یہ پہلی گرفتاری کی تھی، بعد میں انھوں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا، واپس آکر سہارن پور میں

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

تحریک آزادی کی جدوجہد کو منظّم کرنے میں مشغول ہوگئے، اس زمانے میں مولانا منت اللہ رحمانی جامع مسجد سہارن پور میں انگریزوں کے خلاف سخت تقریریں کیا کرتے تھے، اس جرم میں پھر گرفتار کئے گئے، اس مرتبہ چار ماہ جیل میں رہے اور سخت تکلیفیں برداشت کیں، قید و بند کے دوران کم عمری کے باوجود اور اس کے باوجود کہ ناز و نعم میں پلے بڑھے تھے پائے استقامت میں لغزش محسوس نہیں کی گئی بلکہ چار مہینے کی یہ طویل مدت انھوں نے صبر و رضا کا پیکر بن کر گزاری، جیل سے باہر آئے تو وہ ایک مرد مجاہد بن چکے تھے، اور ان کی شخصیت میں جرأت و استقامت کے وہ عناصر رچ بس گئے تھے جو زندگی کی آخری سانس تک ان کے ساتھ رہے۔

حضرت مولانا منت اللہ رحمانی نے اپنی سماجی اور سیاسی زندگی کا آغاز بہار سے کیا دارالعلوم دیوبند کے چار سالہ قیام نے ان میں خدمت اور قیادت کا جذبہ پیدا کر دیا تھا، یہاں سے فراغت کے بعد جب وہ اپنے وطن واپس پہنچے تو انھوں نے اپنے لئے اسی جذبے کی تکمیل کا راستہ منتخب کیا، اتفاق سے انہی دنوں بہار کی تاریخ کا سب سے زیادہ ہیبت ناک زلزلہ آیا جس سے مونگیر سمیت متعدد اضلاع میں جان و مال کا شدید نقصان ہوا مولانا رحمانی نے مصیبت زدگان کی راحت رسانی کے لئے رات دن ایک کر دیئے اور سال بھر تک ان لوگوں کی باز آباد کاری میں لگے رہے جو اپنے مکانات سے محروم ہو چکے تھے، اور جن کے کاروبار تباہ و برباد ہو گئے تھے، اس فقید المثال خدمت نے مولانا رحمانی کو نہ صرف عوام کی نظروں میں وقار و اعتماد عطا کیا بلکہ بہار کی سرکردہ شخصیتوں نے بھی محسوس کیا کہ اس نوجوان میں جو ہر قابل بننے کی تمام صلاحیتیں موجود ہیں حضرت مولانا ابوالمحاسن سجادؒ کی نگاہ انتخاب اس نوجوان پر پڑی اور انھوں نے جمعیۃ علما صوبہ بہار کی نظامت اعلیٰ کا بارگراں اس کے دوشِ ناتواں پر ڈال دیا، اس نوجوان نے بہت جلد خود کو اس ذمہ داری کا اہل ثابت کیا جس کا ثبوت وہ وقیع خدمات ہیں جو مولانا نے

جمعیۃ علما کے پلیٹ فارم سے انجام دیں۔

آج کے دور میں سماجی خدمت گزار نامزدگی کے ذریعے قانون ساز اداروں میں پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں، مولانا منت اللہ رحمانی الیکشن اور ووٹنگ کے ذریعے منتخب ہوکر ۱۹۳۶ء میں بہار اسمبلی میں پہنچے، اس الیکشن میں مولانا نے اتنی زبردست کامیابی حاصل کی کہ تمام اہم حریفوں کی ضمانتیں ضبط ہوگئیں، اس شاندار کامیابی نے مولانا کے حوصلوں کو کچھ اور بلندی عطا کی، مولانا کی جرأت مندانہ تقریروں سے اسمبلی کا ایوان گونجتا رہتا تھا، کئی معاملات میں مسلم مسائل پر مولانا کی مدلل اور پرجوش تقریروں سے مجبور ہوکر حکومت کو اپنے فیصلے واپس لینے پڑے۔

مولانا منت اللہ رحمانی کی خاص بات یہ ہے کہ انھوں نے سیاست کو خدمت کا ذریعہ بنایا، اس کو ذریعۂ معاش نہیں بنایا، اور نہ اس کے ذریعے انھوں نے بھاری بھرکم حکومتی عہدے حاصل کئے، ممبر اسمبلی بننے کے بعد بھی ان کی روحانیت اور علمیت کا سفر جاری رہا، ۱۹۴۲ء میں مولانا کو خانقاہ رحمانی مونگیر کا سجادہ نشین مقرر کیا گیا عوامی لحاظ سے یہ ایک باوقار منصب تھا اور اس منصب پر فائز ہونے کے لئے جس صلاحیت کی ضرورت تھی حضرت مولانا محمد علی مونگیری کے خلفاء نے ان کے اس چھوٹی عمر میں اسی صلاحیت کا ادراک کیا اور اس کے خاندان کی امانت اس کے سپرد کردی، سجادہ نشین کا لفظ ہندوستان میں صدیوں سے رائج پیری مریدی کے پس منظر میں قبر پرستی کے جس تصور کو نمایاں کرتا ہے خانقاہ رحمانی اس سے کوسوں دور ہے، خانقاہ رحمانی کے سجادہ نشین اور اپنے والد کے روحانی جانشین کی حیثیت سے مولانا منت اللہ رحمانی نے اپنی انتہائی مصروف زندگی کا آغاز کیا اور بہت جلد لاکھوں دلوں پر حکومت کرنے لگے، آپ کے دور میں خانقاہ رحمانی کو ظاہری ترقی بھی خوب ملی، اور کئی عمارتوں کا اضافہ ہوا، جامعہ رحمانیہ مونگیر ۱۹۳۴ء کے زلزلے کے بعد بند ہوگیا تھا مولانا منت

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

اللہ رحمانی نے ۱۹۴۳ء میں اس ادارے کا احیا کیا، اسے ترقی دی، اس میں تعلیم کا سلسلہ شروع کیا اور اسے دورہ حدحدیث تک پہنچایا، آج مونگیر میں شریعت اورطریقت کے امتزاج سے تشکیل پانے والے یہ دونوں ادارے بہار کی اسلامی زندگی کی روح سمجھے جاتے ہیں، نہ صرف بہار میں ان کا فیض جاری ہے بلکہ ہندوستان کے طول وعرض میں بھی اس چشمۂ صفا کے آب رواں کا فیض صاف محسوس کیا جاسکتا ہے، دورحاضر میں جامعہ رحمانی درس نظامی کی ایک ایسی عظیم الشان درس گاہ بن چکی ہے جس کے فیض یافتہ نہ صرف ہندوستان میں بلکہ ہندوستان کے باہر بھی سرگرم عمل ہیں۔

ہندوستان میں امارت شرعیہ کے قیام کی جد وجہد کا آغاز ابوالمحاسن حضرت مولانا سجاد صاحبؒ نے کیا، آج اس ادارے کی زرّیں خدمات کا دائرہ کئی صوبوں تک وسیع ہوچکا ہے، اورملک بھر میں جہاں جہاں بھی نظام امارت قائم ہے یااس کے قیام کی کوشش چل رہی ہے اس کا بہ راہ راست یابالواسطہ تعلق بہار کی امارت شرعیہ سے ہے حضرت مولانا سجاد نے جو پودا لگایا تھا امیر شریعت رابع بن کر مولانا نے اس پودے کو پروان چڑھانے میں اپنے جسم کی تمام طاقت خرچ کردی، ۱۹۵۷ء میں مولانا چوتھے امیرشریعت منتخب ہوئے،حضرت مولانا نے یہ ذمہ داری اپنے کاندھوں پر اٹھائی تو اس کے تمام تقاضے بھی پورے کئے، نظام امارت شرعیہ کو مضبوط و مستحکم بنانے میں انھوں نے اپنی پوری قوت لگادی، جگہ جگہ اس کی شاخیں قائم کیں اوراس کا دائرہ دونوں صوبوں کے ہرعلاقے میں گاؤں گاؤں تک وسیع کردیا، مبلغین کے ذریعے مسلمانوں میں بیداری پیدا کی گئی، اورانھیں آمادہ کیا گیا کہ وہ اپنے تمام مسائل میں امارت شرعیہ کے نظام افتا وقضا کی طرف رجوع کریں، حضرت مولانا نے اس نظام کو ملک گیر سطح پر متعارف کرانے میں بھی کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا،حضرت مولانا نے امارت شرعیہ کو مسلمانوں کے خاندانی نزاعات میں فیصلے کرنے کی ذمہ داری تک ہی محدود نہیں رکھا

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

بلکہ اس کے تحت بیت المال بھی قائم کیا، سجاد ہسپتال کی بنیاد ڈالی، ٹیکنیکل کی تعلیم کا شعبہ کھولا، آج یہ ادارہ مسلمانوں کی ہمہ گیر جد و جہد کا روشن عنوان بن چکا ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ بہار واڑیسہ کے مسلمان امارت شرعیہ کے مضبوط نظام سے اس طرح وابستہ ہیں کہ اس کے بغیر ان کی زندگی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تو یہ بات قطعاً غلط نہ ہوگی، دکھ سکھ کی ہر گھڑی میں امارت شرعیہ کے ذمہ دار بہ طور خاص اس کے امیر ہر وقت مسلمانوں کی خدمت پر کمر بستہ نظر آتے ہیں، بہار کے عوام سالہا سال سے قدرتی آفتوں کی زد میں رہتے ہیں کبھی زلزلہ ہے، کبھی سیلاب ہے کبھی قحط سالی ہے، مصائب کا ختم نہ ہونے والا ایک طویل سلسلہ ہے، ایسے تمام مواقع پر حضرت مولانا منت اللہ رحمانی نے ریلیف اور امداد کی حصول یابی سے لے کر تقسیم تک کے تمام مراحل میں جس طرح کام کیا ہے اس نے ملک بھر کی تنظیموں کے لئے قابل تقلید نمونہ چھوڑا ہے۔

دارالعلوم دیوبند سے ان کا تعلق اوّلاً اس طرح قائم ہوا کہ وہ ندوے کی تعلیم سے فراغ ہوکر درسیات کی اعلیٰ تعلیم کے لئے دیوبند پہنچے، اور چار سال تک یہاں مقیم رہے، عملی زندگی میں وہ جمعیۃ علما ہند سے وابستہ تھے، جو دارالعلوم دیوبند کے بزرگوں کی ایک جماعت رہی ہے، اس طرح مولانا کا تعلق ہر دور میں دارالعلوم دیوبند سے برقرار رہا، بلکہ ہر نئے دن اس تعلق میں اضافہ ہوتا رہا، یہاں تک کہ شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ کی زندگی بالکل آخری دور میں آپ کو دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کا رکن بنا دیا گیا یہ ۱۹۵۵ء کی بات ہے اسی طرح حضرت مولانا کی عملی سرگرمیاں صوبہ بہار واڑیسہ کے محدود دستوں سے لے کر ملک کی لا محدود وسعتوں کی طرف بڑھنی شروع ہوئیں دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن کی حیثیت سے مولانا کا دارالعلوم کے انتظام وانصرام میں کافی عمل دخل رہا ہے، وہ ہر مسئلے میں مستقل رائے رکھتے تھے، شوریٰ کی مجلسوں میں ان کی رائے بڑی وقیع سمجھی جاتی تھی، ان کی آمد کا انتظار رہا کرتا تھا، راقم

نے حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب کو مجلس شوریٰ کے دنوں میں مشورے کے لئے حضرت مولانا سے تنہائی میں ملتے ہوئے اور بات چیت کرتے ہوئے بار بار دیکھا ہے، جن دنوں دارالعلوم دیو بند میں شوریٰ کا اجلاس ہوا کرتا تھا ان دنوں یہاں کی رونق دیکھنے کے قابل ہوتی تھی، مہمان خانہ دارالعلوم واردین وصادرین سے ہر وقت بھرا رہتا، اساتذہ وملازمین کی آمدورفت بھی جاری رہتی، طلبہ بھی کسی نہ کسی بہانے پہنچ ہی جاتے تھے، عام طور سے ملاقات کرنے والے حضرت مولانا منت اللہ رحمانی سے ضرور ملتے تھے، خاص طور پر وہ لوگ ضرور ملاقات کیا کرتے تھے جن کا کوئی معاملہ شوریٰ کے اجلاس میں زیرِ غور ہوتا، ہم بھی کسی نہ کسی مسئلے کو لے کر شوریٰ کے ممبران سے ملتے رہا کرتے تھے، حضرت مولانا کی بارعب شخصیت سے بڑا ڈر محسوس ہوتا تھا لیکن وہ طلبہ کے مسائل بڑی توجہ کے ساتھ سنا کرتے تھے، حضرت مولانا کیوں کہ عملی انسان تھے، مدارس کی دنیا سے براہ راست تعلق رکھتے تھے اس لئے شوریٰ میں ان کی دل چسپی اس بات پر مرکوز رہتی تھی کہ دارالعلوم کا معیارِ تعلیم کس طرح اونچا کیا جائے اس زمانے میں نصاب تعلیم میں کچھ مفید اصطلاحات بھی زیرِ غور آئیں، اور ان کو نافذ بھی کیا گیا، اس تمام مرحلے میں حضرت مولانا کی ذاتی دلچسپیوں اور تجربوں کو بڑا دخل رہا۔

تکمیل ادب کے سال جب راقم السطور طلبہ کی عربی انجمن النادی الادبی کا معتمد تھا حضرت مولانا وحید الزماں صاحب مدظلہ کے حکم واشارے پر ہم نے حضرت مولانا منت اللہ رحمانی سے بذریعہ خط درخواست کی کہ وہ النادی کے سالانہ اختتامی اجلاس کی صدارت فرمائیں، حضرت مولانا نے ہماری یہ درخواست منظور کرلی، کیوں کہ حضرت مولانا کی حیثیت بہت اونچی تھی، اور اندرون دارالعلوم ان کا دبدبہ بھی بہت تھا، اس لئے ان کے شایان شان تیاری کا مرحلہ درپیش تھا، اس بات پر سب کو حیرت تھی کہ آخر مولانا وحید الزماں کیرانوی نے مخالف گروپ کے کسی شخص کو النادی کے لئے کیسے مدعو

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

کرلیا، یاد رہے حضرت مولانا منت اللہ رحمانی جمعیۃ علما ہند سے الگ ہو چکے تھے اور مخالف گروپ میں ان کا شمار ہونے لگا تھا، جب کہ حضرت مولانا وحید الزماں جمعیۃ علما میں پوری طرح سرگرم ہوگئے تھے، ہمارے استاذ حضرت مولانا وحید الزماں کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر معاملے کو اس کے صحیح تناظر میں دیکھنے کے عادی ہیں دارالعلوم دیوبند میں حضرت مولانا منت اللہ کی شخصیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا اندرون دارالعلوم النادی الادبی کے مقاصد کو بہ روئے کار لانے کے لئے ضروری تھا کہ حضرت مولانا جیسی بھاری بھرکم شخصیتوں کا اعتماد حاصل کیا جائے، بہ ہر حال ان کی صدارت کی منظوری مل گئی، تیاری کا سلسلہ شروع ہوا، حضرت مولانا پروگرام کو علمی اور انتظامی ہر سطح سے کامیاب بنانے کے لئے خود بھی رات رات بھر جاگے اور ہمیں بھی جگایا، پروگرام میں شرکت کرنے والوں کی تعداد اس قدر بڑھی کہ پروگرام کو ایک رات میں سمیٹنا مشکل ہوگیا، مجبوراً اسے دو دنوں میں تقسیم کرنا پڑا، بہ ہر حال وہ دن بھی آیا جس دن جلسہ ہونا تھا، ادھر شوریٰ جاری تھی، دوسری طرف النادی کا دفتر اور تکمیل ادب کی درس گاہ تقریروں اور مکالموں سے گونج رہی تھی، عشا کی نماز کے بعد النادی کے راکین نے جن کی تعداد چار سو کے آس پاس تھی اسٹیج سے دورویہ صف بندی کی اور نودرہ، احاطہ مولسری، صحن اہتمام اور بیرون صدر گیٹ سے گزرتے ہوئے یہ دورویہ صفیں مہمان خانۂ دارالعلوم میں حضرت مولانا منت اللہ رحمانی کے کمرے پر پہنچ کر ختم ہوگئیں راقم السطور اپنے استاذ حضرت مولانا وحید الزماں کی معیت میں حضرت مولانا کو جلسہ گاہ میں لے جانے کے لئے حاضر ہوا، حضرت باہر تشریف لائے اور منت اللہ یعیش، اور دارالعلوم تدوم کے نعروں سے درودیوار لرز گئے، یہ نعرے اس وقت تک لگتے رہے جب تک حضرت مولانا اسٹیج پر جلوہ افروز نہ ہوگئے، اس اجلاس کا بڑا زبردست اثر ہوا، حضرت مولانا نے دل کھول کر حسن انتظام کی تعریف کی، عربی

زبان وادب کے میدان میں حضرت مولانا کیرانوی مدظلہ کی خدمات کو سراہا، اس طرح یہ واقعہ ہماری زندگی کا یادگار واقعہ بن گیا۔

غالبًا ۱۹۷۲ء کی بات ہے، راقم اس وقت مشکوۃ شریف کا طالب علم تھا، یہ بات سنی گئی کہ دارالعلوم دیوبند کی لائبریری میں ایک میٹنگ ہونے والی ہے، اس میں مجلس شوریٰ کے اراکین بھی ہیں، اور کچھ دوسرے زعما اور وکلا بھی تشریف لائے ہیں، موضوع ہے مسلمانوں کے عائلی قوانین میں حکومت کی مداخلت، معلوم ہوا حکومت نے متبنیٰ کے مسئلے پر پارلیمنٹ میں کوئی بل پیش کیا ہے، اس بل کے ذریعے حکومت مسلمانوں کی شریعت میں مداخلت کا راستہ ہموار کررہی ہے، بس اسی موضوع پر غوروخوض ہونا ہے، میٹنگ ہوئی، اوراس نتیجے پر پہنچ کر ختم ہوئی کہ بلا تفریق مسلک مسلمانوں کی تمام جماعتوں کو ساتھ لے کر حکومت کے اس اقدام اور ارادے کی مخالفت کی جائے، بہ ہر حال احتجاج ہوا اور اتنا زبردست ہوا کہ حکومت ہل کر رہ گئی عروس البلاد بمبئی میں مسلمانوں کا ایسا عدیم النظیر اور فقید المثال اجلاس منعقد ہوا کہ حکومت متبنّٰی بل واپس لینے پر مجبور ہوگئی اس اجلاس میں مسلم پرسنل لا بورڈ کا قیام عمل میں آیا، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب بورڈ کے اوّلین صدر قرار پائے، اور امیر شریعت حضرت مولانا منت اللہ رحمانی اس کے پہلے جنرل سکریٹری بنائے گئے، اس میں شک نہیں کہ حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ نے مسلم پرسنل لا بورڈ کو مسلمانانِ ہند کی امنگوں کا صحیح ترجمان بنایا اور اسے ایک تحریک کی شکل دے کر مسلمانوں کے تمام فرقوں کو اس سے وابستہ رکھنے میں زبردست کامیابی حاصل کی محرّک اول اور بانی صدر کی حیثیت سے اگر ہم اس کامیابی کے لئے حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کو محبتوں اور عقیدتوں کا خراج پیش کریں تو ہمارا یہ فرض بھی بنتا ہے کہ بورڈ کے اولین جنرل سکریٹری کی حیثیت سے حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ

نے جو جد وجہد کی ہے اسے بھی خراج تحسین پیش کیا جائے۔

حضرت مولانا منت اللہ رحمانی کی متعدد خصوصیات میں سے ایک اہم ترین خصوصیت ان کی جرأت اور بے باکی ہے، مسلم پرسنل لا بورڈ کے ایک ذمہ دار کی حیثیت سے انھوں نے جو بیان بھی دیا، جو تقریر بھی کی، جو تحریر بھی لکھی وہ اسی جرأت اور بے باکی کی آئینہ دار ہے، وقت کے بڑے بڑے ناخداؤں سے انھوں نے ہمیشہ آنکھ میں آنکھ ڈال کر بات کی ہے، اللہ تعالیٰ نے بے خوفی کے ساتھ اپنی بات کہنے کی جو صلاحیت حضرت مولانا کو عطا کی تھی وہ صلاحیت ان کے معاصرین میں بہت کم دیکھی گئی۔

اس وقت ملّت اپنی تاریخ کے نازک دور سے گزر رہی ہے، بابری مسجد کے حوالے سے ان دنوں ملک میں فرقہ پرستوں کی جو سرگرمیاں جاری ہیں ان سے مسلمان خود کو غیر محفوظ سمجھ رہے ہیں، ابھی کل ہی کی بات ہے کہ ۳ دسمبر ۱۹۹۰ء میں مسلم پرسنل لا بورڈ کی مجلس عاملہ کے فیصلوں اور تجویزوں کی روشنی میں آپ نے یہ اعلان کیا تھا کہ مسجد ہر حال میں مسجد ہے، اور آئندہ بھی مسجد رہے گی، کسی فرد یا حکومت کو وقف جائداد میں تصرف کرنے کا حق حاصل نہیں ہے، آپ نے یہ اعلان بھی کیا تھا کہ مسلمان پرسکون رہیں لیکن اگر کوئی ان پر حملہ کرے تو اپنی جان مال اور عزت آبرو کی حفاظت کے لئے میدان میں آجائیں، ڈرنے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے، ان دونوں اعلانات کا مسودہ خود مولانا نے اپنے قلم سے لکھا، اور پریس کو جاری کیا، بلکہ ان تجویزوں کو لے کر اس وقت کے وزیر اعظم چندر شیکھر سے ملے، یہ بے مثال جرأت ایمانی اب کہاں ملے گی، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے، آخرت کی نعمتوں سے نوازے اور امت کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

ایک دل آویز شخصیّت کے مالک

حضرت مولانا حامد الانصاری غازیؒ

دارالعلوم دیوبند کی عمر رسیدہ نسل کا قافلہ اپنے پیچھے یادوں کا گہرا غبار چھوڑتا ہوا بڑی تیزی کے ساتھ اپنی آخری منزل کی طرف رواں دواں ہے، پچھلے چند سالوں میں اس قافلے کے متعدد اہم افراد نگاہوں سے اوجھل ہوگئے ہیں، اور صرف چند شخصیتیں ایسی باقی رہ گئی ہیں جنہوں نے نئی نسل کی رہنمائی کے لیے ماضی کی قندیلیں روشن کر رکھی ہیں۔

حضرت مولانا حامد الانصاری غازی جنہوں نے ۱۶/اکتوبر ۱۹۹۲ء کو بمبئی میں داعی اجل کو لبیک کہا اسی پرانی نسل کے نمائندہ فرد تھے، اگرچہ دارالعلوم کے مدّ وجزر نے انہیں گوشۂ تنہائی اختیار کرنے پر مجبور کردیا تھا اور وہ ہر طرح کی سرگرم زندگی سے تقریباً کنارہ کش ہو چکے تھے، اس کے باوجود ان کے رخصت ہوجانے سے ایسا محسوس ہوا کہ ابھی ابھی کوئی محفل سے اٹھ کر گیا ہے اور اپنے ساتھ تمام رونقیں سمیٹ کر لے گیا ہے۔

مولانا کا تعلق اتر پردیش کے اس مشہور علاقے سے تھا جسے مردم خیز کہا جاتا ہے، مظفر نگر اور سہارنپور کے وہ قصبات جنہوں نے ملک وملت کے افق کو بے شمار آفتاب وماہتاب بخشے اسی علاقے میں واقع ہیں، آج ہندوستان ہی میں نہیں ہندوستان سے باہر بھی ہر جگہ یہی چاند سورج روشنی پھیلا رہے ہیں۔

مولانا حامد الانصاری غازی ۱۳۲۷ھ مطابق ۱۹۰۹ء میں انبہٹہ ضلع سہارنپور میں پیدا ہوئے، آپ کے والد حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند کے نواسے حضرت مولانا محمد میاں منصور الانصاریؒ اور دادا حضرت مولانا عبداللہ الانصاری ہیں، یہ خاندان ہمیشہ سے علم دین کے ساتھ وابستہ رہا ہے، مولانا عبداللہ الانصاریؒ دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل، شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے خلیفۂ مجاز اور درسِ نظامی کے مشہور مدرس رہے ہیں، سرسید احمد خاں نے جب علی گڑھ میں ایم۔اے۔او کالج قائم کیا تو انھوں نے مولانا عبداللہ الانصاریؒ کو اس کے شعبۂ دینیات کا پہلا ناظم مقرر کیا، مولانا اخیر عمر تک اس منصب پر فائز رہے، مولانا محمد میاں منصور انصاریؒ بھی دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل تھے، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کو ان کے علم پر بڑا اعتماد تھا، یہی وجہ ہے کہ حضرت شیخ الہند نے انہیں اجمیر سے جہاں وہ ایک مدرسے میں مدرس تھے، اپنے پاس بلا کر رکھا اور ان سے اپنے مشہور زمانہ ترجمہ قرآن پاک کے کام میں مدد لی، انہوں نے مشہور مجاہد آزادی مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے نائب کی حیثیت سے تاریخی انجمن جمعیۃ الانصار میں بھی کام کیا، حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک ریشمی رومال کے اہم اور فعال افراد میں ان کا شمار کیا جاتا ہے، یہ تحریک کسی وجہ سے حکومت پر آشکارا ہوگئی اور شیخ الہندؒ کو حجاز مقدس سے جہاں رہ کر وہ ہندوستان اور آزاد قبائل کے لوگوں کو ترغیبی خطوط لکھ رہے تھے گرفتار کرلیا گیا، مولانا الانصاریؒ اس وقت خطوط پہنچانے کے مشن پر تھے، اس لیے گرفتار ہونے سے بچ گئے تھے، حضرت شیخ الہند کی اسارت کے دوران مولانا افغانستان چلے گئے، اور مستقل طور پر وہیں رہنے لگے، افغان حکومت پر ان کے علم و فضل کا اچھا اثر ہوا اور انہیں وزیر مختار کا عہدہ دے کر ترکی کے سفارتی مشن پر روانہ کیا گیا، اسی طرح انہیں ماسکو بھی بھیجا گیا، مولانا الانصاریؒ بہت سی کتابوں کے مصنف بھی تھے، افغانستان میں متعدد اعلا عہدوں پر فائز رہ کر انھوں نے وہیں آزادئ

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

ہند سے ایک سال پہلے ۱۹۴۶ء میں وفات پائی اور جلال آباد میں مدفون ہوئے۔

مولانا حامد الانصاری غازی کا تعلق اسی علمی اور سیاسی گھرانے سے تھا، فطری طور پر وہ بھی اپنے والد اور دادا کے نقش قدم پر چلے، انہوں نے ابتدائی تعلیم اپنے نانا حضرت مولانا صدیق احمد انبہٹویؒ سے حاصل کی جو اپنے وقت کے ماہر اساتذہ میں شمار ہوتے تھے، اعلیٰ تعلیم کے لیے دار العلوم میں آئے، غازی صاحب کا شمار حضرت علامہ انورشاہ کشمیریؒ کے ممتاز تلامذہ میں ہوتا ہے، دار العلوم کے اس مشہور ہنگامے سے مولانا حامد الانصاری کا قریبی تعلق رہا ہے جو ۱۳۴۶ھ میں واقع ہوا اور جس نے اس حد تک ناگوار صورت اختیار کی کہ اس سے متاثر ہو کر دار العلوم کے مایۂ ناز استاذ حدیث حضرت مولانا انورشاہ کشمیریؒ کو دار العلوم دیوبند چھوڑ کر گجرات کے ایک دور افتادہ گاؤں ڈابھیل جانا پڑا حضرت کشمیریؒ کے بہت سے تلامذہ کے ساتھ آپ نے بھی دار العلوم دیوبند کو خیر آباد کہا اور حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ سے خاندانی اور نسبی قرابت کے باوجود اپنے استاذ کی اتباع میں ڈابھیل پہنچے، فراغت کے بعد آپ نے اردو صحافت کو بہ طور پیشہ اختیار کیا الجمعیۃ دہلی، مدینہ بجنور، اور انقلاب بمبئی جیسے انقلابی روزناموں سے ایڈیٹر کی حیثیت سے وابستہ رہے، لکھنے پر بڑی اچھی قدرت تھی، شگفتہ اور سلیس نثر لکھتے تھے، مقرر بھی بہت اچھے تھے، خوب صورت تراکیب اور دل نشیں جملوں سے سامعین کے دل موہ لیا کرتے تھے، تصنیفی کام کچھ زیادہ نہیں ہے صرف ایک ضخیم کتاب ''اسلام کا نظام حکومت'' ہے جو انہوں نے ندوۃ المصنفین کے رفیق کی حیثیت سے لکھی اور اسی ادارے سے چھپی حق تو یہ ہے کہ اس موضوع پر اردو زبان میں اس سے اچھی کتاب شائع نہیں ہوئی۔

صحافت اور سیاست کا تعلق چولی دامن کا تعلق ہے، ایک صحافی ہونے کی حیثیت سے سیاسیات عالم پر ان کی گہری نظر تھی، مسلمانوں کے تعلق سے روئے زمین پر جو واقعہ بھی رونما ہوتا اس کے بارے میں خاص طور پر واقفیت حاصل کرتے تھے اور اپنی محفلوں

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

میں اس واقعے کا بہ طور خاص تجزیہ کیا کرتے تھے، سیاسی اعتبار سے ان کا تعلق جمعیۃ علما ہند سے تھا، جمعیۃ علما مہاراشٹر کے صدر بھی رہ چکے تھے، بعد میں جب حضرت مولانا اسعد مدنیؒ کا دور آیا تو دوسرے بہت سے علما کی طرح وہ بھی جمعیۃ سے کنارہ کش ہو گئے۔

وہ دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے اہم رکن تھے اور دارالعلوم کے حالیہ انقلاب سے پہلے تک وہ اس کے ہر اجلاس میں باقاعدگی کے ساتھ شرکت کیا کرتے تھے، اور کیوں کہ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کے داماد بھی تھے اس لیے اجلاس کے بعد بھی کچھ روز رشتہ داری کے ناطے دیوبند میں ٹھہرا کرتے تھے راقم السطور سے مولانا کا تعلق کسی ایسے ہی موقع پر ہوا جب وہ شوریٰ کے اجلاس میں شرکت کے لیے دیوبند تشریف لائے، ان دنوں دیوبند میں ہندوؤں کا مشہور دیوی کنڈ میلہ چل رہا تھا، اس میلے میں ہر سال مشاعرے کی روایت رہی ہے اور اس میں دارالعلوم کے طلبہ بڑی تعداد میں شرکت کرتے ہیں، اس سال انتظامیہ نے طلبہ سے اپیل کی کہ وہ مشاعرے میں شرکت نہ کریں، اس طرح کی اپیلیں ہر سال کی جاتی تھیں لیکن اس سال کسی متوقع خطرے کے پیش نظر کچھ زیادہ ہی سختی کی گئی، اس سلسلے میں دارالعلوم کے درالحدیث میں ایک اجتماع بھی ہوا جس میں حضرت مہتمم صاحبؒ کے علاوہ غازی صاحب نے بھی تقریر کی، یہ پہلا موقع تھا جب ہم طلبہ نے مولانا کی تقریر سنی، اس تقریر میں غازی صاحب نے اعلان کیا کہ اگر طلبہ مشاعرے میں نہ گئے تو ہم دارالعلوم میں مشاعرے منعقد کریں گے، شعر و سخن کا دل دادہ ہونے کے باعث دوسرے طلبہ کی طرح قدرتی طور پر مجھے بھی مسرت ہوئی، اتفاق کی بات اس مشاعرے میں شرکت کے لیے مشہور ترقی پسند شاعر علی سردار جعفری بھی دیوبند میں آئے ہوئے تھے، اور وہ مشاعرے کے بعد ٹھہرے رہے، بس موقع غنیمت سمجھ کر ہم نے غازی صاحب کے مشورے اور رائے سے پہلے حضرت مہتمم صاحب سے اجازت

حاصل کی، پھر جعفری صاحب کو اپنے مشاعرے میں شرکت کی دعوت دے ڈالی، اس وقت میں عربی کی ابتدائی جماعتوں کا طالب علم تھا، شعور بھی کچھ زیادہ نہیں تھا، شاعری کا شوق تھا اور ٹوٹے پھوٹے شعر کہا کرتے تھے اور کچھ الٹے سیدھے مضامین اخبارات میں لکھ کر بھیجا کرتا تھا، اس وقت شعر سننے سے زیادہ شعر سنانے کا شوق تھا، اس چھوٹے سے مشاعرے میں مہمان شاعر کے علاوہ محرک اول مولانا غازی صاحب چھائے رہے، دیوبند کے مشہور شاعر اور ادیب مولانا عامر عثمانی مرحوم، ممتاز صحافی جمیل مہدی مرحوم، ان کے چھوٹے بھائی محزوں نیازی ماہنامہ دارالعلوم کے سابق ایڈیٹر مولانا ازہر شاہ قیصر اور کئی طالب علم شعراء شریک ہوئے، سامعین کی تعداد بھی اچھی خاصی تھی، دیر تک محفل جمی، اس محفل کی خاص بات یہ تھی کہ محض غازی صاحب کی دل جوئی کی خاطر حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ بہ نفس نفیس تشریف لائے اور کچھ دیر تشریف فرما رہے، اسی محفل میں عامر عثمانی نے اپنی وہ مشہور نظم سنائی جس میں ترقی پسندی پر چوٹ کی گئی ہے، سردار جعفری نے خوش دلی کے ساتھ وہ نظم سنی، عامر عثمانی نظم سنانے کے دوران کچھ اس قدر جوشیلے ہوگئے کہ سینے میں تکلیف محسوس کرنے لگے، یہ ان پر پہلا قلبی حملہ تھا بعد میں پونہ کے مشاعرے میں بھی انہوں نے اسی جوش وخروش کے ساتھ یہ نظم سنائی، اور اسی نظم کے دوران دوسرے اٹیک پر وہ جاں بحق ہوگئے غازی صاحب نے اس محفل شعر وسخن میں بہت سے خوب صورت شعر سنائے اور اس وقت ظاہر ہوا کہ وہ ایک اچھے شاعر بھی ہیں۔

یہ پہلا تعلق تھا اور ہم طلبہ پر اس تعلق کا گہرا اثر تھا، اس کے بعد جب بھی وہ دیوبند تشریف لائے ہم لوگوں نے انہیں اس طرح گھیر لیا جس طرح پروانے شمع کو گھیر لیتے ہیں، ۷۵-۱۹۷۴ء کی بات ہے دارالعلوم میں میری تعلیم کا آخری سال تھا، غازی صاحب حسب معمول مجلس شوریٰ میں شرکت کے لیے تشریف لائے، اس موقع پر

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

انھوں نے طلبہ سے کچھ زیادہ ہی ربط ضبط بڑھایا، طلبہ کے متعدد جلسوں میں شرکت کی اور ہر جگہ، ہر گفتگو اور ہر ملاقات میں انھوں نے ایک ہی بات کہی کہ وہ بمبئی سے یہاں جوہر قابل کی تلاش میں آئے ہیں، ان کے ذہن میں ایک منصوبہ تھا، جس میں وہ دارالعلوم کے نوجوان فضلا کی علمی صلاحیتوں سے کوئی کام لینا چاہتے تھے، لیکن کچھ موانع تھے اگر انہیں دارالعلوم جیسے کسی ادارے کی مدد ملتی تو شاید وہ بہت کچھ کر سکتے تھے۔

اس واقعے کے ایک دو سال بعد دارالعلوم کی مجلس شوریٰ نے قیام دارالعلوم کے سو سال پورے ہونے پر ایک بین الاقوامی جشن زریں (اجلاس صد سالہ) کا اعلان کیا، اسی کام کو آگے بڑھانے کے لیے دارالعلوم میں جو دفتر قائم کیا گیا اس کی سربراہی کے لیے غازی صاحب کا انتخاب عمل میں آیا، راقم السطور اس سال حیدر آباد کے ایک عربی مدرسے میں درس وتدریس کے فرائض انجام دے رہا تھا اس اعلان سے دور دور تک پھیلے ہوئے فضلائے دیوبند، اور محبین دارالعلوم میں خوشی کی لہر دوڑ گئی دارالعلوم کے دفتر اہتمام میں خطوط کا تانتا لگ گیا، ہر طرف سے مکمل تائید اور بھرپور خوشی کا اظہار ہونے لگا ان حالات میں غازی صاحب نے دفتر کا نظم ونسق سنبھالا، کچھ لوگ انتظامی شعبے میں رکھے گئے، کچھ لوگ تصنیف وتالیف کے لیے مقرر کیے گئے، میرا نام بھی اسی دوسری خدمت کے لیے مجلس شوریٰ نے تجویز کیا، اور مجھے حیدر آباد سے دیوبند بلایا گیا، اس طرح میں نے لگ بھگ ڈیڑھ سال دارالعلوم دیوبند کے دفتر اجلاس صد سالہ کے شعبۂ تصنیف وتالیف میں غازی صاحب کے ماتحت رہ کر کچھ کام کیا، اس دوران غازی صاحب کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، ان کی یادوں کے گہرے نقوش میرے دل کی سطح پر مرتسم ہیں، دھیمے لہجے میں جوشیلی باتیں، چھوٹوں کے ساتھ شفقت ومحبت، ہمت افزائی کا نادر انداز، آج کی طرح اس زمانے میں بھی طبقۂ علما سے یہ چیزیں مفقود تھیں، ایسے ماحول میں غازی صاحب کا طلبہ کے ساتھ محبت

آمیز سلوک اور اپنے ماتحتوں کے ساتھ برابری کا برتاؤ ایک بڑا خوش گوار معاملہ تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ غازی صاحب نے دیوبند سے باہر اتنا وقت گزارا تھا اور زمانے کے اتنے سرد وگرم جھیلے تھے کہ اب ان کا مزاج دارالعلوم کے انتظامی مزاج سے میل نہ کھاتا تھا، وہ متواضع ہونے کے باوجود شاہانہ مزاج رکھتے تھے، وہ چاہتے تھے کہ جس طرح چاہیں دفتر کو چلائیں، ان کا دفتر کسی اور دفتر کا ذیلی شعبہ نہ بنے دارالعلوم کے مخصوص نظام کی وجہ سے وہ اس میں کامیاب نہ ہوسکے اور اس طرح کچھ دل برداشتہ بھی ہوئے، ادھر ان کے بارے میں کچھ دوست نما دشمنوں نے مسلسل یہ افواہیں پھیلائیں کہ وہ اجلاس کے انعقاد میں کوئی خاص دلچسپی نہیں رکھتے، بلکہ اپنا آخری وقت ''باعزت روزگار'' میں لگانا چاہتے ہیں، قدرتی طور سے وہ ان افواہوں سے دل برداشتہ بھی ہوئے دفتر کی کارکردگی متاثر ہوئی اور ذمہ دار غازی صاحب ٹھہرے کسی نے یہ دیکھنے کی کوشش نہیں کی کہ آخر یہ دفتر چلتے چلتے کیوں رک گیا ہے، اس دفتر کے ساتھ دارالعلوم کے دوسرے دفاتر تعاون کیوں نہیں کرتے بلکہ اس کی راہ میں پتھر کیوں ڈالتے ہیں، یہ ایک تلخ وترش موضوع ہے جس سے خاموش گزر جانا ہی بہتر ہے، مختصر یہ کہ غازی صاحب اجلاس کے کاموں سے سبک دوش ہوگئے اور یکا یک تمام تاروں میں برقی لہر دوڑ گئی اور مارچ ۱۹۸۰ء میں بڑی شان وشوکت کے ساتھ یہ اجلاس منعقد ہوا۔

دارالعلوم دیوبند کے اجلاس سے پہلے ہی ان کی امنگوں کا طوفان تھم چکا تھا اب وہ بجھے بجھے سے دیوبند آتے تھے، دارالعلوم کے انقلاب نے اس خاکستر کی حرارت بھی ختم کردی، مجلس شوریٰ کا سلسلہ بھی ختم ہوا، اس انقطاع تعلق کے بعد وہ بہت کم دیوبند آئے ہیں، شاید دو چار مرتبہ سے زیادہ نہ آئے ہوں، جب بھی آئے وضع داری میں فرق نہیں آیا چھوٹوں سے اسی طرح شفقت اور اپنائیت سے ملے، میرے تجارتی مکتبے دارالکتاب پر بھی تشریف لائے، میری قلمی کاوشوں کو سراہا اور گھر پر تشریف لاکر بھی عزت بخشی۔

غازی صاحب نہایت متواضع، خلیق، ملنسار، ہمدرد اور مشفق انسان تھے، بچوں کی طرح معصومانہ انداز رکھتے تھے، ذرا سی بات پر روٹھ جانا اور ذرا سی دیر میں خوش ہو جانا، منافقت اور ریا سے پاک، ظاہر کی طرح باطن بھی اُجلا اور شفاف، چھوٹوں کو بڑا بنانے کی لگن ان کے کردار کا ایک ایسا وصف تھا جو شاذ و نادر ہی کہیں نظر آتا ہے

علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے فرزند اکبر مولانا سید ازہر شاہ قیصر مرحوم کی تحریک پر سری نگر کشمیر میں ایک سہ روزہ سمینار اکتوبر ۱۹۷۸ء پر ان کے والد کی زندگی اور خدمات پر ہوا، اس وقت کشمیر کے وزیر اعلیٰ شیخ محمد عبداللہ تھے، اور سمینار کے انعقاد میں ذاتی طور پر دل چسپی لے رہے تھے، حضرت علامہ کشمیریؒ کے ممتاز تلامذہ، متعدد اہل قلم اور ارباب فکر و نظر مدعو کیے گئے تھے، دیوبند کا ایک بڑا قافلہ سری نگر پہنچا، راقم السطور اور مولوی بدر الحسن دربھنگوی اس قافلے کے کم عمر ممبر تھے، غازی صاحب کی وجہ سے اس سفر میں ہم دونوں کی کچھ زیادہ ہی پذیرائی ہوئی، وہ ہر محفل میں ہمیں نمایاں کرتے اور دل کھول کر ہماری تعریف کرتے، شیخ محمد عبداللہ، مولانا مسعودی، میر واعظ مولانا فاروق، مفتی محمد سعید وغیرہ حضرات کے دولت کدوں پر ہونے والی دعوتوں میں ہم دونوں غازی صاحب کی عنایت سے مرکز نظر بنے رہے۔

اس سمینار میں مولوی بدر الحسن کا مقالہ عربی زبان میں تھا، اناؤنسر نے جب انہیں مقالہ پڑھنے کے لیے مدعو کیا تو کچھ الفاظ مقالے کی تعریف میں کہے، اس کے بعد کسی دوسری نشست میں میرا مقالہ تھا، اس اجلاس کی صدارت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کر رہے تھے، مقالہ پڑھنے کے لیے میرا نام اسی طرح لیا گیا جس طرح لیا جانا چاہئے تھا، غازی صاحب میرے اٹھنے سے پہلے مائک پر پہنچے اور میری تعریف میں اتنا کچھ کہا کہ میرا اپنی جگہ سے اٹھنا مشکل ہو گیا، ظاہر ہے غازی صاحب کا یہ عمل دراصل اس معاملے کو برابر کرنا تھا جو میرے معاصر مقالہ نگار کے ساتھ ہو چکا تھا، ایک مرتبہ

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

دار العلوم میں کچھ عرب مہمان آ گئے، دار الحدیث کے وسیع ہال میں حضرت مہتمم صاحب کا خطاب تھا، ترجمانی مجھے کرنی تھی، عین تقریر کے وقت حضرت مہتمم صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے تقریر کرنے سے تسلسل میں فرق آتا ہے بہتر ہوگا کہ تقریر کے بعد کچھ بہ طور خلاصہ عربی زبان میں کہہ دیا جائے، میں نے کاغذ قلم سنبھالا اور پیچھے بیٹھ کر ترجمہ لکھنا شروع کر دیا، جن لوگوں نے حضرت مہتمم صاحب کی تقریر سنی ہے وہ جانتے ہیں کہ حضرت کی تقریر میں قرآنی آیات، احادیث، واقعات اور اشعار وغیرہ بہ کثرت ہوتے تھے، میں تقریر کا خلاصہ لکھنا چاہتا تھا لیکن حسنِ اتفاق سے حضرت کی تقریر کا مکمل عربی متن تیار ہو گیا اور جب حضرت نے وآخر دعوانا کہا میں نے عرب مہمانوں کے سامنے عربی متن پیش کر دیا، حضرت مہتمم صاحب نے بھی غائت شفقت سے تحسین فرمائی اور سامعین نے بھی سراہا، لیکن غازی صاحب کی خوشی کا عالم بالکل منفرد تھا اگلے چند روز تک یہ موضوع ان کی محفلوں کا عنوان بنا رہا۔

غازی صاحب کی طبیعت پر کسی ایسے واقعے کا اثر بہت جلد ہو جاتا تھا جو ان کی خواہش اور توقع کے خلاف ہو، لیکن ایک صاف دل مومن کی طرح ان کے دل کا آئینہ بہت جلد صاف بھی ہو جاتا تھا اور ناگواری کا اثر لمحوں میں زائل ہو جایا کرتا تھا۔

سری نگر میں ہمارا قیام شیخ عبداللہ کی رہائش گاہ کے سامنے واقع ایم، ایل، اے ہوسٹل میں تھا، اتفاق سے میرا اور غازی صاحب کا قیام ایک ہی کمرے میں ہوا، میں چاہتا تھا کہ اپنے مذاق لوگوں کے ساتھ ٹھہروں تا کہ کچھ بے تکلفی رہے، لیکن غازی صاحب نہ مانے اور میں نے بھی ان کے خوف سے زیادہ اصرار نہیں کیا، ایک روز ناشتے کے وقت میں دوسرے رفقا کے کمرے میں تھا، گفتگو چل رہی تھی، ہوٹل کے بیرے نے ناشتہ لگ جانے کی اطلاع دی ہم سب کا اور خاص طور پر میرا فرض تھا کہ ہم غازی صاحب کو ساتھ لے کر جاتے، معلوم نہیں ایسا کیوں ہوا اور ہم لوگ باتیں کرتے

کرتے ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں جا پہنچے کچھ دیر کے بعد غازی صاحب تنہا آتے ہوئے نظر آئے، تب ہمیں اپنی کوتاہی کا احساس ہوا، جس میز پر ہم لوگ ناشتہ کر رہے تھے اس پر جگہ تھی اور غازی صاحب وہاں بیٹھ سکتے تھے، لیکن غازی صاحب درخواست کے باوجود اپنی ناراضگی ظاہر کرنے کے لیے ایک الگ میز پر جا کر بیٹھے وہ پورا دن اسی خفگی میں گزرا، مگر شام تک وہ اپنی سابقہ حالت پر آ چکے تھے۔

ایک دن ہم کچھ لوگوں نے ڈل جھیل کی سیر کا پروگرام بنایا، پہلے حضرت بل گئے کچھ دیر خشکی پر گھومے، کچھ وقت جھیل کی سیر سے لطف اندوز ہوئے، کچھ وقت جھیل کے بیچوں بیچ بنے ہوئے ریستوران میں گذرا، عشاء کے قریب ہوسٹل پہنچے، خیال بھی نہیں تھا کہ ہمیں یہ تفریح مہنگی پڑے گی، غازی صاحب کو دیکھتے ہی ہم سمجھ گئے کہ موڈ آف ہے، دیکھتے ہی برس پڑے اور جب ڈرتے ڈرتے ہم نے اپنی کارگزاری بتائی تو وقت کا خیال کیے بغیر اٹھے، مولوی بدرالحسن کو ساتھ لیا اور باہر نکل گئے، آدھی رات کے قریب واپسی ہوئی، اگلے دن مولوی بدرالحسن نے بتلایا کہ انھوں نے بھی ڈل جھیل کی سیر کی، یہ معصومیت تھی، بچوں کی سی، اپنائیت تھی، شفقت تھی، ناراضگی تھی کدورت اور کینہ نہیں تھا، دل میں دیر تک کوئی بات نہیں رکھتے تھے، چنانچہ اس واقعے کے بعد جب صبح نیند سے بیدار ہوئے تو رات کی "گرمی" کشمیر کی برفیلی پھواروں سے سرد پڑ چکی تھی۔

واقعات تو بہت ہیں، لیکن اس مختصر مضمون میں اتنی گنجائش کہاں قومی آواز میں غازی صاحب کی وفات کی خبر کیا پڑھی، گزرے ہوئے ماہ وسال کی ایک ایک یاد دل میں کسک بن کر اتر گئی، وہ بزرگوں کی اس نسل کی یادگار تھے جس پر دیوبند کی تاریخ ہمیشہ فخر کرتی رہے گی، غازی صاحب رخصت ہوگئے، آہستہ آہستہ سب ہی رخت سفر باندھ رہے ہیں، لیکن دیوبند میں جو خلا پیدا ہو رہا ہے اس کو پر کرنے والا کوئی نہیں ہے۔

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

ولی کامل، مردِ حق آگاہ

مسیح الامت حضرت مولانا مسیح اللہ خاں شروانیؒ

مسیح الامت حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحبؒ اس سلسلۃ الذہب کی آخری کڑی تھے جس کا ہر فرد اپنی جگہ ایک مکمل تاریخ کی حیثیت رکھتا ہے، حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے اپنے جن تلامذہ اور مریدین کو مجاہدے کی بھٹی میں تپا کر کندن بنایا اور جن لوگوں کو تراش خراش کر چمکتے دمکتے ہیروں کا روپ دیا ان میں کئی نام اتنے اہم ہیں کہ ان کا ذکر آتے ہی بے ساختہ جبینِ عقیدت جھک جاتی ہے، حضرت مولانا عیسیٰ الٰہ آبادی حضرت مولانا عبدالغنی پھول پوری، خواجہ عزیز الحسن مجذوب، حضرت مولانا ظفر احمد تھانوی حضرت مولانا وصی اللہ اعظم گڑھی، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی حضرت مولانا اسعد اللہ سہارنپوری، حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب دیوبندی اور حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب جلال آبادی سلسلۂ تھانویؒ کے ایسے آفتاب و ماہتاب تھے جن سے ایک عالم روشن رہا، یہ لوگ اگرچہ اب دنیا میں نہیں رہے لیکن ان کے علم و عمل کی روشنی سے اب بھی ہزاروں لاکھوں لوگوں کے دل منور ہیں، اور انشاء اللہ قیامت تک ان کا فیض اسی طرح جاری رہے گا۔

سہارنپور دہلی روڈ پر سہارنپور سے مغرب کی جانب پچاس پچپن کیلومیٹر کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا قدیم قصبہ ہے جلال آباد، تھانہ بھون سے مشرق کی سمت یہ قصبہ

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

دو میل کے فاصلے پر ہے، قرب وجوار کے قصبات میں یہ قصبہ تعلیمی، تجارتی، صنعتی اور تمدنی کسی بھی لحاظ سے ترقی یافتہ کہلائے جانے کا مستحق نہیں ہے، ٹوٹی پھوٹی سڑکیں کچے پکے مکانات اور ننگ دھڑنگ بچے، اس قصبے کی زبوں حالی کی واضح تصویر ہیں لیکن ہندو بیرون ہند کے ہزاروں بندگانِ خدا یہاں کے ویران بس اسٹینڈ پر اترتے ہیں اور قصبے کی گرد آلود شاہ راہ سے گزرتے ہیں، بعض لوگ تو لمبا سفر طے کرکے اور راستے کی صعوبتیں برداشت کرکے محض اس لیے یہاں آتے ہیں کہ اس مرد خدا کی ایک جھلک دیکھ لیں اور اس کے پاکیزہ ہاتھوں کے لمس سے اپنے ہاتھوں کی کدورت دور کرلیں اور اس کی پند و نصائح سے اپنے دلوں کی دنیا آباد کرلیں، بعض اوقات انہیں پندرہ، بیس منٹ سے زیادہ بیٹھنے کا موقع نہیں ملتا اور بعض لوگ تو صرف مصافحہ اور زیارت ہی کر پاتے ہیں، نہ کچھ دیر بیٹھتے ہیں اور نہ کچھ سن پاتے ہیں مگر وہ اس مصافحے اور زیارت کو بڑا اعزاز اور بڑی سعادت سمجھ کر واپس ہوتے ہیں، آج سے پہلے اس قصبے کا کچھ یہی منظر تھا، مگر اب یہاں پہلی جیسی بھیڑ نہیں ہوتی اور نہ پہلی جیسی رونقیں ہیں اور نہ روحانیت اور سکون ہے۔

حضرت مولانا مسیح اللہ خاں صاحبؒ اسی قصبے میں رہائش پذیر تھے، جو کبھی گُم نام رہا ہوگا لیکن آج اس کی شہرت دور دور تک ہے اور ساری دنیا مولانا مسیح اللہ خاں صاحبؒ کے حوالے سے جلال آباد کو جاننے لگی ہے، حضرت مولانا مسیح اللہ خاں صاحبؒ علی گڑھ کے مشہور شروانی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، ۱۳۳۰ھ مطابق ۱۹۱۱ء میں برلا ضلع علی گڑھ میں پیدا ہوئے، خاندان میں انگریزی تعلیم کا چرچا تھا اس لیے ابتدائی تعلیم انگریزی اسکولوں میں پائی اور چھٹی کلاس تک داخل رہے لیکن کیوں کہ طبیعت شروع ہی سے دین کی طرف راغب تھی اور دینی علوم حاصل کرنے کا شوق ابتداء ہی سے دامن گیر تھا اس لیے انگریزی تعلیم سے جلدی ہی بددل ہوگئے اور اس کا سلسلہ از خود

منقطع کر دیا، مجبور ہو کر والد صاحب نے دینی تعلیم حاصل کرنے اجازت دی، مشکوٰۃ شریف تک اپنے وطن میں پڑھا، ۱۳۴۸ھ میں دار العلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور ۱۳۴۹ھ میں دورۂ حدیث شریف کی تکمیل کی، بعد میں دو سال علوم وفنون کی تکمیل کے لیے دار العلوم دیوبند ہی میں قیام پذیر رہے اور مختلف اساتذہ سے قاضی مبارک، میر زاہد، شرح التشریح شرح چغمنی وغیرہ کتابیں پڑھیں۔

طالب علمی کے زمانے میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے بیعت کا شرف حاصل ہوا، اس طرح تھانہ بھون کی آمد ورفت شروع ہوئی دار العلوم کی تعلیم مکمل کر لینے کے بعد ۱۳۵۱ھ میں خلافت واجازت بیعت سے سرفراز کیے گئے ۱۳۵۷ھ میں حضرت تھانویؒ نے انہیں جلال آباد کے ایک مدرسے ''مفتاح العلوم'' میں مدرس بنا کر بھیج دیا، یہ مدرسہ اس وقت ایک مکتب کی شکل میں تھا، بعد میں اللہ تعالیٰ نے اس کو ترقی دی اور حضرت کی محنت اور جدوجہد سے یہ مکتب مدرسہ مفتاح العلوم کی حیثیت سے مشہور ہوا اور آج اس کا شمار ہندوستان کے ممتاز مدارس میں ہوتا ہے اور اس کے فیض یافتہ تمام دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔

حضرت تھانویؒ کے مجازین بیعت میں حضرت مولانا مسیح اللہ خاں صاحبؒ ممتاز حیثیت رکھتے ہیں، حضرت تھانویؒ نے اپنی زندگی میں اپنے جن گیارہ مخصوص خلفاء کے ناموں کا اعلان فرمایا ان میں حضرت مولانا مسیح اللہ خاں صاحبؒ کا نام بھی ہے، اس اعلان میں حضرت تھانویؒ نے فرمایا'' اپنے چند مجازین کے نام لکھتا ہوں جن کے طرز تعلیم پر مجھے اعتماد ہے ان میں سے جس سے چاہیں اپنی تربیت متعلق کر لیں''۔

اپنے مربی وشیخ کے سانحۂ ارتحال کے بعد آپ نے جلال آباد کو اپنا مستقل مسکن بنایا اور جس مدرسے میں حضرت تھانویؒ نے انہیں مدرس مقرر کیا تھا اسی مدرسے میں درس وتدریس کا سلسلہ اس وقت تک برقرار رکھا جب تک جسم وجاں میں طاقت

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

باقی رہی، درس وتدریس کے ساتھ اپنے شیخ کے طرز پر بیعت وارشاد اور تلقین وتربیت کا سلسلہ بھی قائم رکھا، تقریباً ۶۵ رسال کے اس لمبے عرصے میں ہزاروں لاکھوں تشنگان علوم نبوت نے اس سرچشمۂ ہدایت سے سیرابی حاصل کی۔

حضرت حکیم الامت کی خانقاہِ امدادیہ کے طرز پر جلال آباد میں بھی ایک خانقاہ تھی جو ہندو بیرون ہند کے سالکین معرفت کے ذکر سے معمور رہا کرتی تھی، حضرت مسیح الامتؒ تمام سالکین کی بہ ذاتِ خود نگرانی فرمایا کرتے تھے اور سالک کے مرض کے لیے نسخۂ شفاء تجویز کرتے تھے، اس خصوصی تربیت کے علاوہ ہر ہفتے جمعہ کے دن نماز جمعہ کے بعد ایک عام مجلس منعقد ہوتی تھی جس میں حضرت تھانویؒ کے مواعظ خود حضرت مولانا مسیح اللہ خاں صاحبؒ پڑھا کرتے تھے اور جہاں تشریح یا وضاحت کی ضرورت پیش آتی تھی پڑھنے کا سلسلہ روک کر نہایت سہل انداز میں اس کی تشریح یا وضاحت کردیا کرتے تھے، شروع میں مختلف مقامات پر جاکر وعظ کہنے کا سلسلہ بھی تھا، اس مقصد کے لیے انھوں نے متعدد سفر کیے، ہندوستان کے مختلف شہروں کے علاوہ پاکستان، برطانیہ افریقہ، سعودی عرب اور دوسرے ملکوں کے لوگوں کی دعوت پر تشریف لے گئے اور وہاں کے لوگوں کو اپنے قیمتی مواعظ سے مستفیض فرمایا، دس پندرہ سال سے سفر کا سلسلہ بالکل بند تھا اور صرف جلال آباد ہی میں قیام رکھتے تھے، ضرورت مند بلا تکلف سفر کرتے اور فیض اٹھا کر جاتے، شاید ہی کوئی دن ایسا جاتا ہو جس میں واردین وصادرین کی اچھی خاصی تعداد جلال آباد کو رونق نہ بخشتی ہو، حضرت والا صبح سے شام تک اپنی خانقاہ میں تشریف رکھتے اور ہر آنے جانے والوں کے ساتھ گفتگو فرماتے اور وہ جس مقصد کے لیے آتا اس کی تکمیل فرماتے، آنے والوں میں ہر طرح کے لوگ ہوتے تھے مدارس عربیہ کے علما اور طلبہ، دیہات کے سادہ لوگ اور ان پڑھ مسلمان، جدید تعلیم یافتہ حضرات سیاسی اور سماجی لیڈر، ہندو اور مسلمان سب ہی دعا کے لیے حاضری دیا کرتے تھے

جلال آباد کے لوگوں کے ساتھ حضرتِ والا کا معاملہ اتنا مشفقانہ تھا کہ ہر چھوٹا بڑا ہر خاص وعام انہیں ابا جی کہا کرتا تھا اور حضرت کی اہلیہ مرحومہ امی جان کے نام سے پہچانی جاتی تھیں۔

حضرت والا کا تمام وقت دین کے کاموں میں صرف ہوتا تھا، آنے جانے والوں کے علاوہ ڈاک کا بھی طویل سلسلہ تھا جس میں سالکین کے خطوط بھی ہوتے تھے جن میں وہ اپنی پریشانیاں لکھا کرتے تھے، عام لوگوں کے بھی خطوط ہوتے جن میں وہ مسائل دریافت کرتے، علما اور طلبہ کے بھی خطوط ہوتے جن میں وہ اپنے علمی اشکالات کا حل چاہتے تھے، ضرورت مندوں کے خطوط بھی ہوتے تھے جن میں وہ دعاؤں کی درخواست کرتے تھے، حضرت نہایت پابندی اور التزام کے ساتھ ہر خط کا جواب دیا کرتے تھے، اور تمام جوابات اپنے ہاتھ سے تحریر فرماتے تھے، خواہ لکھنے والے نے کتنی ہی غیر اہم بات کیوں نہ تحریر کی ہو۔

راقم السطور سے حضرت والا کا تعلق تین نسلوں کو محیط ہے، میرے دادا حضرت مولانا احمد حسن صاحب مفتاح العلوم جلال آباد کے ممتاز ترین مدرسین میں سے تھے اور حدیث کی امہات کتب کی تدریس کے فرائض انجام دیتے تھے، دارالعلوم سے فراغت کے سولہ سال بعد وہ مفتاح العلوم سے متعلق ہوگئے تھے اور اپنی زندگی کی آخری سانس تک اسی سے وابستہ رہے، یہ تعلق تقریباً اٹھائیس تیس برس تک برقرار رہا میرے والد ماجد حضرت مولانا واجد حسین صاحب زید مجدہٗ بھی دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد مفتاح العلوم میں مدرس مقرر ہوئے اور تقریباً بیس برس تک اس منصب پر فائز رہے، بعد میں وہ گجرات کے مشہور ومعروف تعلیمی ادارے جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل میں استاذ حدیث کی حیثیت سے تشریف لے گئے میرے والد محترم کی ترقی اور علمی شہرت کا سفر جلال آباد ہی سے شروع ہوا، میرے دادا اور والد دونوں ایک ہی وقت میں مفتاح العلوم جلال آباد کے استاذ تھے، اس لیے ہمارا

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

پورا گھرانہ جلال آباد ہی میں مقیم تھا، میں نے اپنی زندگی کے کم وبیش دس برس جلال آباد میں گزارے ہیں اور حضرت والا کی محبت اور شفقت کا خوب مزا لوٹا ہے۔

حضرت والا طلبہ کے معاملہ میں ایک طرف اگر نہایت سخت تھے تو دوسری طرف بے حد مہربان بھی تھے، تعلیم کی پابندی انہیں بے حد عزیز تھی، لباس اور وضع قطع پر ان کی خاص نظر رہتی تھی اور اس سلسلہ میں تغافل کرنے والے طلبہ کی سخت گرفت فرمایا کرتے تھے، لیکن کسی طالب علم کی بیماری انہیں مضطرب اور پریشان کر دیتی تھی اور وہ اس کا اس طرح خیال رکھتے تھے جیسے کوئی مشفق باپ اپنی اولاد کا رکھتا ہے۔

حضرت والا کی تربیت کا اپنا ایک مخصوص طرز تھا، میرے دورِ طالب علمی میں مدرسے کی تمام ڈاک پہلے حضرت والا کے پاس آتی تھی اور حضرت تمام خطوط پہلے خود پڑھا کرتے تھے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ ان کے مدرسے میں داخل طلبہ اپنے گھر والوں، دوستوں اور عزیزوں سے کس طرح کی خط وکتابت کرتے ہیں، اس دوران اگر کوئی اصلاح طلب بات نظر آتی تو متعلقہ طالب علم کو طلب فرماتے اور اس کو نصیحت فرماتے، میں نے اس وقت جب کہ میں فارسی کے ابتدائی درجات کا طالب علم تھا دہلی سے شائع ہونے والا اک رسالہ اپنے نام مدرسے کے پتہ پر جاری کرا لیا تھا، حضرت نے اسے ڈاک میں دیکھا اور کھول کر پڑھ لیا پھر مجھے بلایا اور اس طرح کے رسالوں کو پڑھنے سے منع فرمایا اور خود ہی ایک کارڈ دہلی کے اس رسالے کو تحریر فرما دیا کہ اس پتہ پر بھیجنا بند کر دیا جائے۔

طالب علموں پر حد سے زیادہ شفقت کا نتیجہ تھا کہ وہ ہر ایک کی مصروفیات پر گہری نظر رکھتے تھے کون کیا کرتا ہے، کہاں جاتا ہے یہ سب انہیں معلوم تھا، ایک مرتبہ میں مدرسے کے باہر کھیل میں مشغول تھا کہ اچانک حضرت والا تشریف لے آئے، میرا کان پکڑ کر فرمایا میاں صاحبزادے اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو، میں نے عرض کیا

کہ ابا جی میرا گھنٹہ خالی ہے، فرمایا کیا طالب علم کے گھنٹے بھی خالی ہوتے ہیں، کل سے اس گھنٹے میں پند نامہ لے کر آنا، چنانچہ اگلے دن میں چوتھے گھنٹے میں پند نامہ لے کر خانقاہ پہونچ گیا، دو تین دن تو تنہا پڑھنے کا اتفاق ہوا پھر بہت سے افریقی اور ہندوستانی طلبہ کو معلوم ہوا تو وہ بھی شریک درس ہو گئے، پند نامہ کا سبق تو ایک بہانہ تھا اصل مقصد یہ تھا کہ کسی چھوٹے سے چھوٹے بچے کا وقت بھی ضائع نہ ہو، اب احساس ہوتا ہے کہ کاش! اس وقت میں اکتساب فیض کر لیتا تو شاید کسی لائق ہوتا۔

بارہ تیرہ سال کی عمر کا زمانہ بے شعوری کا زیادہ ہوتا ہے لیکن اس عمر میں جو وقت شعور کا گذرا ہے اس میں حضرت سے تعلق کے بے شمار واقعات ذہن کی اسکرین پر روشن ہیں، اس وقت میں یہ مضمون لکھ رہا ہوں اس دور کے تمام مناظر ایک ایک کر کے آنکھوں کے سامنے آرہے ہیں، ہمارے گھرانے کا تعلق حضرت کے گھرانے سے عزیز داری کے ساتھ تھا اور میں چھوٹا ہونے کی وجہ سے حضرت کے زنان خانے میں بلا تکلف آمد و رفت رکھتا تھا، میں نے ناظرہ، حفظ اور فارسی و عربی کے ابتدائی درجات کی تعلیم مفتاح العلوم میں حاصل کی، بعد میں مجھے ضد سوار ہوئی کہ میں دارالعلوم دیو بند میں داخلہ لوں گا، دیو بند اپنا وطن ہے، غالباً اس ضد کے پیچھے وطن میں رہنے کی خواہش زیادہ رہی ہوگی، میرے دادا کو یہ منظور نہیں تھا اور نہ حضرت جی نے اسے پسند فرمایا لیکن میں نے اپنی ضد نہ چھوڑی اور بالآخر مجھے دارالعلوم دیو بند میں داخل کر دیا گیا۔

دارالعلوم دیو بند میں داخل ہونے کے بعد جلال آباد سے اور حضرت سے میرا تعلق برقرار رہا، دادا اور والد چونکہ جلال آباد میں تھے اس لیے بھی آنے جانے کا سلسلہ لگا رہتا اور ہر مرتبہ حضرت کی خانقاہ میں حاضری ضرور ہوتی، ایسا کبھی نہیں ہوا کہ میں حاضر ہوا ہوں اور حضرت نے خالی ہاتھ آنے دیا ہو، کبھی کبھی خط بھی لکھتا اور جواب سے سرفراز ہوتا، حضرت نے اسفار کا سلسلہ بالکل بند کر دیا تھا، ۱۹۸۴ء میں جب

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

میرے دادا شدید بیمار ہو کر دیوبند تشریف لائے تو حضرت والا نے ضعف ونقاہت کے باوجود عیادت کے لیے سفر فرمایا، اس موقعہ پر میرے بیٹے یاسر ندیم کو پہلی مرتبہ دیکھا اور کچھ روپے عنایت فرمائے، میں عزیزی یاسر کو محض حصول برکت اور دعا کے لیے متعدد مرتبہ جلال آباد لے کر گیا، یاسر نے جب ناظرہ کلام پاک ختم کیا اور ہمارا ارادہ اسے حفظ کرانے کا ہوا تو ہم لوگ خانقاہ پہونچے اور حضرت سے حفظ کلام پاک کا آغاز کرایا، یاسر نقد انعام اور دعاؤں کے ساتھ واپس آیا، شاید حضرت کی دعاؤں کا ہی ثمرہ تھا کہ اس نے ڈیڑھ سال سے بھی کم مدت میں قرآن پاک حفظ کرلیا اور ہم فروری ۱۹۹۱ء کی ابتدائی تاریخوں میں اسے لے کر جلال آباد پہونچے، ہمارے لیے فخر ومسرت کی بات تھی کہ حضرت نے باوجود لاغری اور کم زوری کے (اس دن تنفس کی شکایت کچھ زیادہ ہی تھی) بہت دیر تک حفظ قرآن کریم کے فضائل پر اپنے ملفوظات سے نوازا اور دیر تک بچے کو علم وعمل اور درازیٔ عمر کی دعائیں دیں، میرے دادا اور والد اور میری اہلیہ تینوں حضرت سے بیعت کا تعلق رکھتے تھے، بدقسمتی سے میں بیعت کا تعلق قائم نہ کرسکا تھا لیکن عقیدت کا تعلق آخر تک قائم رہا۔

حضرت بے پناہ خوبیوں کے مالک تھے متواضع، خلیق، مہربان اصول پسند باطن کی طرح ظاہر بھی بڑا خوب صورت تھا، سرخ وسفید چہرہ، کشادہ پیشانی، سفید داڑھی لمبا قد دیکھنے والا ایک دفعہ دیکھے تو دیکھتا ہی رہ جائے، گفتگو ایسی دل نشیں کہ سننے والے کے دل میں اتر جائے، بسا اوقات مخاطب سے اس کے حسبِ حال گفتگو فرماتے، کئی مرتبہ راقم السطور کو بھی اس کا تجربہ ہو چکا ہے، یہی فراست مومن ہے جو ہمارے بزرگوں کو اللہ تعالیٰ نے بڑی فراوانی سے عطا فرمائی ہے۔

حضرت کے متعدد مواعظ زیورطبع سے آراستہ ہوچکے ہیں، ملفوظات اور مجالس کے بھی متعدد حصے چھپ کر مقبول عام ہوچکے ہیں، اور مختلف موضوعات پر بعض کتابیں

بھی شائع ہوئی ہیں، ان میں ''شریعت وتصوف'' حضرت کی تمام کتابوں میں نہایت اہمیت کی حامل ہے، اس میں حضرت نے عقلی اور نقلی دلائل کے ذریعہ یہ بات ثابت کی ہے کہ شریعت اور تصوف دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں، جیسا کہ سمجھ لیا گیا ہے، بلکہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح مربوط ہیں کہ انہیں ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا، یہ کتاب تصوف کی بنیادی کتابوں میں شمار ہوتی ہے، حضرت والا کا معمول رہا ہے کہ وہ سالکین کو بیعت کرنے سے پہلے چند کتابیں پڑھنے کے لیے فرمایا کرتے تھے، جن میں امام غزالی کی تبلیغ دین، حضرت تھانویؒ کی جزاء الاعمال اور اپنی شریعت وتصوف قابل ذکر ہیں۔

حضرتِ والا یکسوئی کے ساتھ دین کے کاموں میں منہمک رہنے والے تھے اپنے پیر ومرشد کی طرح حضرت نے کبھی سیاست میں حصہ نہیں لیا اور نہ اپنے متعلقین کو اس طرح کے جھمیلوں میں پڑنے دیا، نزاعی معاملات میں شدو مد کے ساتھ حصہ لینا پسند نہیں تھا، اگر کبھی اس طرح کی صورت حال پیش آتی تو صرف حق بات واضح کرنے پر اکتفا کرتے، فریقین کا نام لے کر نقد نہ فرماتے، ماضی قریب میں جب دارالعلوم کا قضیۂ نامرضیہ پیش آیا اور حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کے گروپ کی طرف سے دہلی کے نمائندہ اجلاس میں دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ تحلیل کر دی گئی تو دوسرے فریق نے اس مسئلے کو اخبارات ورسائل میں بڑا اچھالا اور خود مجلس شوریٰ کے بعض ممبران نے اسے اپنے اختیار تمیزی اور بالاتری کے لیے چیلنج تصور کیا، ان حالات میں حضرت مولانا مسیح اللہ خاں صاحب سے استفسارات ہوئے اور جواب میں حضرت نے مدلل تحریر سپرد قلم فرمائی جو ''شوریٰ ہیئت حاکمہ نہیں'' کے نام سے چھپ چکی ہے دارالعلوم دیوبند کے ایک سینئر استاذ نے اس سے اختلاف کیا اور اس کے جواب میں ایک مفصل کتاب لکھی جو دارالعلوم دیوبند کی شیخ الہند اکیڈمی سے شائع ہو چکی ہے، اس

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

میں انھوں نے حضرت کا نام لے کر اوران کی عبارتوں کو بنیاد بنا کر زیر بحث مسئلے میں اپنے موقف کو واضح کیا ہے، اس کتاب کی اشاعت کے بعد مفتاح العلوم کے بعض اہل علم نے اس کا مفصل جواب تیار کیا تھا لیکن حضرت نے اس کی اشاعت گوارا نہیں فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ ہمارے حضرت (تھانویؒ) کا مسلک جواب الجواب کا نہیں تھا، ہمارا کام صرف حق واضح کرنا ہے وہ ہم کر چکے ہیں، اگر کرنا ہی ہے تو یہ کیا جائے کہ اس موضوع پر تمام بزرگوں کی تحریریں یک جا کر کے شائع کر دی جائیں، چنانچہ یہ تمام تحریریں یک جا کر کے شائع کر دی گئیں اور شاید بہترین جواب بھی بن گئی۔

کم وبیش پینسٹھ سال تک علم وعمل کی روشنی پھیلا کر یہ آفتاب تراسی سال کی عمر میں ۱۳؍نومبر ۱۹۹۲ء جلال آباد کے افق میں غروب ہوگیا، حضرت کے سانحۂ وفات کی خبر قرب وجوار کے دوسرے علاقوں کی طرح دیو بند میں بھی رنج وغم کے ساتھ سنی گئی، دیکھتے ہی دیکھتے ہزاروں افراد خانقاہ کے اطراف میں جمع ہونے لگے ان میں علما، صلحاء، طلبہ، زعما اور عوام ہر طرح کے لوگ تھے ہر آنکھ اشکبار ہر دل سوگوار تھا، ہجوم کا یہ عالم تھا کہ دور دور تک سروں کا ایک سمندر موج زن تھا، جلال آباد کے لوگوں نے زندگی میں کبھی یہ منظر نہیں دیکھا تھا کم وبیش ایک لاکھ انسانوں نے ایک نحیف ونزار بے جان جسم کو اپنے کاندھوں پر اٹھا کر اس کی آخری منزل تک پہنچایا اور زمین کی امانت زمین کے سپرد کر دی۔ کل نفسٍ ذائقة الموت۔ بلا شبہ موت ہر انسان کو آئے گی لیکن وہ موت اس قدر قابل رشک ہے جو مرنے والے کو حیاتِ جاوداں عطا کرتی ہے، حضرت اگر چہ محفل سے چلے گئے لیکن اپنے پیچھے اپنے علوم کی ایسی دولت چھوڑ گئے جو آنے والی نسلوں میں ان کی یادوں کے چراغ روشن رکھے گی۔

مجسم شفقت، سراپا محبت

میری دادی مرحومہ

مجھے ٹھیک طرح سے یاد نہیں کہ ہماری والدۂ محترمہ ہمیں چھوڑ کر کب اللہ کو پیاری ہوگئیں، صرف ایک منظر ہلکا سا میرے ذہن کے افق پر روشن ہے کہ رات کے آخری پہر مجھے کوئی میرے بستر سے گود میں اٹھا کر لے گیا اور اس نے مجھے میری بیمار والدہ کے پہلو میں لٹا دیا، مجھے تو یہ بھی پتہ نہیں کہ میری والدہ کو کیا بیماری لاحق تھی، البتہ جب میں ان کے قریب لیٹا تو آس پاس بہت سے لوگ موجود تھے، والدہ نے مجھے اپنے پاس لٹا کر بہت پیار کیا، بہت روئیں، اس کے بعد کیا ہوا مجھے یاد نہیں، صبح جب آنکھ کھلی تو چھوٹا سا گھر خواتین سے بھرا ہوا تھا اور برآمدے کی ایک چارپائی پر کوئی چادر اوڑھے لیٹا ہوا تھا، مجھے کسی نے بتلایا کہ رات تمہاری امی کا انتقال ہوگیا ہے، میں اتنا چھوٹا تھا کہ انتقال کا مطلب بھی نہیں سمجھا، جب جنازہ اٹھنے لگا تو کسی نے مجھے میری امی کے قریب کھڑا کر دیا، اور زور سے کہا کہ واصف (میرا گھریلو نام) تمہاری امی اب اللہ میاں کے جا رہی ہیں، کبھی نہیں آئیں گی، یہ سن کر میں اپنی امی کے چہرے پر گر پڑا اور دھاڑے مار مار کر رویا، اس کے علاوہ میرے ذہن میں کچھ نہیں ہے، جو کچھ ہے وہ دادی کے دل نواز پیکر کی سرد گرم شفقتیں و محبتیں ہیں، یہ شفقتیں اور محبتیں ہی سرمایہ

حیات ہیں، یہی زندگی بھر کی یادیں ہیں، ہوش سنبھالنے کے بعد دادی ہی سے واسطہ رہا اور جب تک وہ رخصت نہیں ہوگئیں ان ہی سے قلب ونظر کا اٹوٹ رشتہ رہا۔

دادی کو یوں بھی اپنے پوتوں اور پوتیوں سے کچھ زیادہ ہی محبت ہوتی ہے اور اگر وہ پوتے ماں کی شفقت یا باپ کے سایۂ عاطفت سے محروم ہوں تو اس محبت میں کچھ زیادہ ہی شدت پیدا ہو جاتی ہے، میرے اور چھوٹے بھائی شاہد کے ساتھ بھی یہی ہوا، ہم دونوں والدہ کی محبت اور شفقت سے محروم تھے، اس لئے ہم دادی کی مشفقانہ توجہات کا مرکز بنے ہوئے تھے، وہی ہمیں اٹھاتی بٹھاتیں، نہلاتی دھلاتیں کھلاتی پلاتیں ہمارے چھوٹے بڑے سب کام وہ خود ہی کرتیں، ہوسکتا ہے کبھی کبھی گھر کے دوسرے افراد بھی ان کی مدد کرتے ہوں، ماشاءاللہ گھر میں کافی لوگ موجود تھے لیکن بنیادی کردار وہی ادا کرتیں اور ہم دونوں ان ہی سے مانوس بھی زیادہ تھے، اور یہ اُنسیت آخر تک برقرار رہی۔

میں جب بھی گھر میں داخل ہوتا میری نگاہیں دادی ہی کو تلاش کرتیں، کھانا وہی اتار کر دیتیں ڈانٹ پھٹکار بھی وہی کرتیں، ماں کی محرومی کا قلق اتنا زیادہ تھا کہ ہم دونوں بھائیوں کا گھر سے تعلق سونے اور کھانے کی حد تک رہ گیا تھا، باقی وقت ہمارا گھر سے باہر ہی گزرا کرتا تھا، یہ اس وقت کی بات ہے جب میری عمر کوئی پندرہ سولہ برس کی ہوگی، گھر میں غربت تھی، معمولی کھانا پینا اور بہت معمولی پہننا اوڑھنا تھا، ہر وقت احساس محرومی کچوکے لگاتا رہتا تھا، اس پر مستزاد یہ کہ کوئی محبت کرنے والی ہستی بھی نہیں تھی، سوائے دادی کے کہ وہ محبت تو بہت کرتیں اور خیال بھی زیادہ سے زیادہ رکھتیں لیکن بعض وجوہات کی بنا پر محبت وشفقت کے اظہار میں بخل سے کام لیا کرتی تھیں، اس صورت حال نے مجھے چڑ چڑا بنا دیا تھا، گھر میں داخل ہوتا تو خاموشی سے اپنے پلنگ پر لیٹ جاتا اور الٹی سیدھی کتابیں پڑھتا رہتا، کھانے کا وقت ہوتا اٹھ کر کھانا

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

کھالیتا، کبھی سب کے ساتھ، بسا اوقات الگ بیٹھ کر، گوشۂ تنہائی میں رہنے کی عادت سی ہوتی جارہی تھی، گھر سے دور رہ کر بڑا سکون ملا کرتا تھا، گھر میں آتا تو گھر کا ماحول کشیدہ اوراجنبی سا لگتا، خدا جانے یہ میرا احساس تھا یا واقعی ہمارے گھر کا ماحول ہی ایسا تھا، حقیقت یہ ہے کہ گھر میں بچوں کو پوری توجہ ملنی ضروری ہے، ماں باپ یا ان دونوں میں سے کسی ایک کی محرومی بچوں کے لئے بہت سے مسائل پیدا کرتی ہے، بچوں کو اگر قریبی عزیزوں کی شفقتیں حاصل بھی ہوجائیں تب بھی یہ احساس کچوکے لگاتا رہتا ہے کہ ہماری ماں نہیں ہے، ہمارے باپ نہیں ہیں، اگر ماں ہوتی تو ایسا ہوتا، باپ ہوتے تو ایسا ہوتا، باپ کی کمی کسی طرح نبھ جاتی ہے اور ماں اپنے آنچل کے سائے میں زمانے کے سرد وگرم سے بچا کر باپ کی کمی کے احساس کو کسی نہ کسی حد تک کم بھی کردیتی ہے، لیکن ماں کا کوئی بدل نہیں ہے، اس احساس نے کہ ہم ماں کی شفقتوں سے محروم ہیں ہم دونوں بھائیوں کو گھر سے لاتعلق سا کردیا تھا، چھوٹا بھائی سالہا سال تک گھر سے غائب رہا، میں اگرچہ دیوبند میں ہی رہا لیکن جب تک گھر میں رہتا اجنبیوں کی طرح رہتا، میرے لئے وہ گھر ایک سرائے کی طرح تھا جہاں مسافر صرف آرام کے لئے قیام کرتا ہے صبح ہوتے ہی چل دیتا ہے، گھر میں میرا واسطہ صرف دادی سے ہوتا وہی صبح کو جگاتیں، وہی چائے دیتیں، اگر وہ مصروف ہوتیں یا اِدھر اُدھر ہوتیں تو میں خود صبح کی بچی ہوئی چائے پیالے میں اتار کر رات کی باسی روٹی کے ساتھ پی لیا کرتا تھا، یہی صورت کھانے کے وقت پیش آتی، اگر میں گھر میں ایسے وقت پہنچ جاتا جب کھانا کھایا جارہا ہوتو سب کے ساتھ شریک ہوجاتا اور اگر وقت بے وقت پہنچتا یا تو اس وقت دادی اٹھ کر کھانا دے دیتیں یا باورچی خانے میں گھُس کر میں خود ہی کھالیا کرتا تھا ان دنوں مزاج بڑا تلخ ہوگیا تھا، گھر میں ہر ایک سے لڑنے کو جی چاہتا، کوئی بات برداشت نہیں تھی، گھر کا ہر فرد اپنا دشمن نظر آتا تھا، ایسے میں کوئی کچھ کہہ دیتا تو زبان بھی خاموش

نہیں رہتی تھی، اچھی خاصی کہا سنی بھی ہو جایا کرتی تھی، ایسے میں صرف دادی ہی اپنی نظر آیا کرتی تھیں، محبت کرنے والی، شفیق اور ہم درد، اگر چہ وہ کھُل کر کبھی محبت کے دو بول نہ بولتیں، خدا جانے انھیں کس کا ڈر تھا، مگر وہ لاپرواہ بھی نہ ہوتیں، ان کی کوشش ہوا کرتی تھی کہ مجھے کھانا وغیرہ دے کر جلد از جلد فارغ کر دیں، اصل میں کشیدہ صورت حال میں اُن کی پوزیشن بڑی نازک ہوا کرتی تھی، وہ مجھ سے اعراض بھی نہیں کر سکتی تھیں اور میری مکمل پشت پناہی کر کے دوسروں کی تنقید کا نشانہ بھی نہیں بننا چاہتی تھیں ایک وقت وہ آیا کہ میں نے دارالعلوم کے ایک کمرے کو اپنا ٹھکانہ بنا لیا، تین سال اس طرح گزرے کہ وہ کمرہ تھا اور میں، دن رات اسی میں رہتا، دارالعلوم سے اچھا خاصہ وظیفہ مل جاتا تھا، دوست احباب بھی بہت تھے، ان کے ساتھ کھانا پینا رہتا، کبھی کبھی گھر بھی چلا جاتا، ان دنوں پڑھنے کے علاوہ کوئی دُھن نہیں تھی اور لکھنے کے علاوہ کوئی مشغلہ نہ تھا۔

دادی کو مجھ پر غصہ بھی بہت آتا تھا اور وہ ناراض بھی ہو جایا کرتی تھیں، خاص طور پر اس وقت جب میں کھانے میں مِین میخ نکالا کرتا تھا، اصل میں مجھے پتلا پانی شوربہ سادہ چاول، دال سبزی کبھی پسند نہیں رہی، میرا دل چاہتا تھا کہ کھانا وغیرہ معیاری من پسند ہو، گھر کی اقتصادی پوزیشن ایسی نہیں تھی کہ روز روز بریانی اور قورمہ بنتا، یہ بات کم عقلی کی بنا پر سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ آخر گھر میں اتنے سارے مرد ہیں، سب کما رہے ہیں، پھر بھی ہم غریب کیوں ہیں، بعض اوقات میں ناراض ہو کر کھانا چھوڑ دیتا اور کھائے بغیر باہر چلا جاتا، کبھی کبھی غصے میں آکر سالن پھینک بھی دیتا، اس وقت دادی سخت ناراض ہوتیں اور غصے میں آکر کہتیں دیکھوں گی جب تو کمائے گا تو فلاں فلاں سالن کیسے کھائے گا، وہ میرے پسند کے سالنوں کا نام لیتیں اور سخت ناراضگی کا اظہار کرتیں، میں غصے میں الٹے سیدھے جواب پکڑاتا، گھر میں جب بھی سادہ چاول بنتے

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

تو میں دودھ چینی ڈال کر ضرور کھاتا تھا، یہ بات بھی جھگڑے کا سبب بنتی تھی، دودھ کی محدود مقدار میں بھلا یہ عیاشی کیسے ممکن تھی، اور اگر سادہ چاول نہ بنتے تو روز آنہ پلاؤ اور طہاری کیسے بنتی، بس دادی اماں اس بات پر سخت برافروختہ ہوتیں، اور مستقبل کے حوالے سے بھی اپنے اندیشوں کا اظہار کرتی رہتی تھیں، خیال آتا ہے کہ وہ زبان سے تو ناراضگی دکھلاتی ہوں گی لیکن دل ہی دل میں یہ تمنا بھی کرتی ہوں گی کہ میرے پوتے کو اس کے پسند کے کپڑے اور اس کے پسند کے کھانے میسر ہوں، اور میرا خیال ہے شاید جو فراخی اللہ نے مجھے عطا کی ہے وہ انہی کی دعاؤں کا ثمرہ ہے، دودھ چاول کھانے کی مجھے آج تک عادت ہے، گھر میں سادہ چاول بنتے ہیں تو میرے لئے اہتمام کے ساتھ ایک پیالے میں دودھ اور شکر دان دستر خوان پر رکھا جاتا ہے، میں جب بھی دودھ چاول کھاتا ہوں یا جب بھی گھر میں میری پسند کے کھانے بنتے ہیں تو مجھے دادی یاد آجاتی ہیں اور ایسا تقریباً روز ہی ہوتا ہے۔

میری دادی پرانی وضع کی ایک سیدھی سادھی خاتون تھیں، ضلع بجنور میں ایک تاریخی قصبہ ہے شیر کوٹ وہاں کی رہنے والی تھیں، زبان بھی اسی علاقے کی بولا کرتی تھیں، اس ضلع کے کئی قصبوں جیسے سیوہارہ، نہٹور وغیرہ کے نام وہ اکثر لیا کرتی تھیں جب ہم چھوٹے تھے تو اکثر یہ سوچا کرتے تھے کہ نہ جانے شیر کوٹ کتنی دور ہوگا، اس لئے کہ دیوبند اور شیر کوٹ کے درمیان عزیزوں کی آمد و رفت بہت کم تھی، کبھی کبھار کوئی بھولا بھٹکا مسافر آجاتا، کبھی دادی کے کوئی بھائی یا ان کا کوئی بھتیجہ، بعد میں پتہ چلا کہ بجنور تو دیوبند سے اتنا قریب ہے کہ صبح سے شام تک کئی چکر لگائے جاسکتے ہیں اس وقت حیرت ہوتی کہ آخر ہماری دادی شیر کوٹ کیوں نہیں جاتیں اور ہم بھی کیوں نہیں جاتے، معلوم ہوا اقتصادی مجبوریاں تھیں، دادی کو اپنے وطن سے اور اپنے بھائی بھتیجوں سے محبت بہت تھی، کوئی آجاتا تو ان کی جیسے عید ہوجاتی، اپنی بڑی بہن کے

ساتھ ان کی گفتگو کا بڑا موضوع شیر کوٹ ہی ہوا کرتا تھا، ہم ان دونوں بہنوں کی گفتگو بڑی توجہ سے سنا کرتے تھے، جو اگر چہ ہمارے لئے بیکار ہوتی تھی مگر ہمیں مزا بہت آتا تھا۔

میری دادی پڑھنا لکھنا بالکل نہیں جانتی تھیں، حالاں کہ وہ ایک عالم کی بیوی تھیں، اوران کا تعلق شیر کوٹ کے قاضی خاندان سے تھا، مگر خدا جانے اس وقت عورتوں کو تعلیم سے بے بہرہ کیوں رکھا جاتا تھا، سیدھی سادھی خاتون تھیں، کوئی کچھ بھی بتلا دیتا یقین کرلیا کرتی تھیں، انھیں گنتی تک بھی ٹھیک سے نہیں آتی تھی، دس بیس تک وہ صحیح صحیح گن لیتی تھیں اس کے آگے تک گننا ان کے بس میں نہیں تھا، ایسے میں وہ ہم سے کہتیں، ذرا گننا اور ہم گنتے بھی تھے اور نظر بچا کر ان کی دو چار چونیاں یا اٹھنیاں غائب بھی کردیا کرتے تھے، دارالعلوم کے پاس ہمارے چچا کی دکان تھی، پان کی تھی یہ دکان آج بھی موجود ہے، ان دنوں کتھا گھر پر پکا کرتا تھا، چھالیاں بھی گھر پر ہی کاٹی جاتی تھیں، اور یہ دونوں کام میری دادی کیا کرتی تھیں، کتھّا پکا کر دادی امّاں دو برتنوں میں جمنے کے لئے رکھ دیتی تھیں، بڑا برتن چچا دوکان پر لے جاتے اور چھوٹا برتن دادی گھر میں رکھ لیتیں، دور دور سے بچے اور عورتیں دادی سے پکا ہوا کتھّا خرید کر لے جاتے تھے، اس طرح دادی کو جیب خرچ کے طور پر کچھ پیسے بچ جایا کرتے تھے، جنھیں وہ نہایت احتیاط کے ساتھ سنبھال کر رکھتیں، اس احتیاط کے باوجود ہم اس میں سے دو چار سکّے غائب کر ہی دیتے تھے، اکثر تو انہیں پتہ بھی نہیں چلتا تھا کہ ان کی رقم کم ہوگئی ہے، اور کبھی اندازہ بھی لگا لیا کرتی تھیں، اس وقت بڑی پریشان ہوتیں اور ایک ایک سے پوچھتیں، ہم صاف مکر جاتے، اللہ انھیں آخرت کی نعمتوں اور رحمتوں سے نوازے، شرافت اور سادگی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

تین تین بہوویں گھر میں تھیں، مگر خود بھی سارے دن کام میں لگی رہتیں، جھاڑو برتن سے لے کر آٹا گوندھنے اور مصالحہ پیسنے تک کے تمام پُر مشقت کام خود کرتیں

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

ایک زمانے تک قریب کے محلّے میں جا کر پورے مہینے کے خشک مصالحے (دھنیا مرچ اور ہلدی وغیرہ ہاتھ کی چکی پر پیس کر لایا کرتی تھیں، ان کو یہ انتظار نہیں رہتا تھا کہ بہوویں کام کریں گی، خود اپنے کپڑے دھو کر ڈال دیتیں، خود ہی نل سے پانی بھر کر غسل خانے میں لے جاتیں، جب تک ان کے جسم میں طاقت رہی اُن کا یہی معمول رہا، ہم نے کبھی نہیں دیکھا کہ انھوں نے اپنے کسی کام کے لئے کسی بہو یا بیٹی کو زحمت دی ہو عام طور پر ساس بڑی گرم مزاج ہوتی ہیں، اور بیٹے تابع دار اور فرماں بردار ہوں تو ساسوں کی تلخ مزاجی دو چند ہو جاتی ہے، ناک پر مکھی تک نہیں بیٹھنے دیتیں، ایسی ساسیں پلنگ توڑتی ہیں اور بیٹھے بیٹھے حکم چلایا کرتی ہیں، مگر ہم نے اپنی دادی اماں کو کبھی نہیں دیکھا کہ وہ بہوؤں پر حکم چلا رہی ہوں یا ان کے کام میں کیڑے نکال رہی ہوں یا اُن کے خلاف اپنے بیٹیوں کے کان بھر رہی ہوں، بلکہ یہاں معاملہ کچھ الٹا تھا، اکثر و بیشتر ان کی بہوویں ان پر حاوی رہتیں، ہماری دادی اپنی بہوں سے بہت ڈرا کرتی تھیں جس طرح سادہ لوح بہوویں سخت گیر ساسوں سے ڈرا کرتی ہیں، ان کی مرضی سے کپڑے بناتیں، کہیں جانا ہوتا تو ان سے پوچھ کر جاتیں، ان کے مشورے سے لباس کا انتخاب کرتیں، عجیب طرح کی سادگی اور بے بسی تھی اُن کے مزاج میں بہت کم ایسا ہوتا کہ وہ کھانے کے معاملے میں کوئی مشورہ دیتی ہوں، عموماً ان کی بہوویں طے کرتیں کہ آج صبح کیا پکّے گا اور شام کے کھانے میں کون سی ڈش بنے گی ان کا مزاج تو یہ تھا کہ جو بنتا صبر شکر کے ساتھ کھالتیں، عموماً سادہ کھانا پسند کرتیں چنے کی روٹی یا مکئی کی روٹی اور لہسن کی چٹنی بے حد پسند تھیں اور مزے مزے لے کر کھاتیں۔

میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ انھوں نے اپنی بہوں کے ساتھ سخت لب و لہجے میں بات کی ہو، یا کبھی کوئی ناگوار بات کہی ہو، اکثر و بیشتر تو خاموش ہی رہتیں، یا تو لیٹی رہتیں یا بیٹھے بیٹھے چھالیاں کترتی رہتیں، بلکہ یہ کام تو دیر رات تک جاری رہتا، عموماً

رات کے بارہ ایک بجے تک دادی امّاں کا سروتا چلتا ہی رہتا، ہم اس کی آواز سے اس قدر مانوس ہو چکے تھے کہ کبھی کسی وجہ سے سروتا خاموش ہوتا تو ماحول کی خاموشی بری لگا کرتی تھی، ہم سروتے کی آواز سنتے سنتے سو بھی جاتے تھے، اور وہ خود بھی بیٹھے بیٹھے جھپکیاں لیتی رہتی تھیں، مگر سوتی اسی وقت تھیں جب ہمارے چچا اپنی دکان بند کر کے واپس گھر آ جاتے، وہ گھر کے صحن یا برآمدے میں ایسی جگہ بیٹھا کرتی تھیں کہ ان کی نظر دروازے پر رہتی اور کان بھی آنے جانے والوں کی آہٹ پر لگے رہتے، دروازہ کھلنے بند ہونے کے انداز اور آواز سے وہ سمجھ جایا کرتی تھیں کہ فلاں آیا ہوگا، ماشاءاللہ اچھی صحت تھی، جو انتقال سے چند ماہ پہلے تک اسی طرح برقرار رہی، سماعت بصارت ہر چیز بہت درست تھی، دانت بھی صحیح سالم تھے، گنا آرام سے چوس لیا کرتی تھیں، آخر میں اتنا تو ہوا کہ سوئی میں دھاگا پرونا ان کے لئے مشکل ہو جاتا تھا، ایسے میں وہ قریب بیٹھے ہوئے کسی بچے سے کہتیں، وہ سوئی میں دھاگا ڈال دیتا، اپنے کپڑوں پر ٹکی پیوند خود لگا لیا کرتی تھیں، مدت دراز تک دو چار گھنٹے دن میں چرخا بھی چلاتی رہیں، سوت کاتا کرتی تھیں، پھر اس سوت سے پلنگ پر بچھانے کی دریں بن جاتی تھیں، لحاف گدوں میں ڈورے خود ڈالا کرتی تھیں، مشقت بھرے تمام کام خود کرتیں، مثلاً گنے کی کھیر خود راتوں کو جاگ کر بنایا کرتی تھیں، ساگ کڑھی وغیرہ سالن بھی خود ہی تیار کرتیں، چٹنی خود پیستیں، مکئی اور چنے کی روٹی خود بناتیں، یہ سارے ہی کام محنت طلب ہوتے ہیں اور ہر عورت کے بس کے بھی نہیں ہوتے۔

ہماری دادی اپنے شوہر سے یعنی دادا سے بہت ڈرا کرتی تھیں، دادا سخت گیر تو زیادہ نہ تھے لیکن اصول پسند بہت تھے، کچھ ان کا رعب بھی چھوٹے بڑوں پر بہت زیادہ تھا، جتنی دیر وہ گھر میں ہوتے ماحول پر خاموشی طاری رہتی، سب لوگ چھپے چھپے پھرا کرتے تھے، دادی کی مجبوری تھی، ان کو کھانا دینا، پانی پیش کرنا، پان لگا کر دینا

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

چائے دینا، ان کی دوسری چھوٹی بڑی ضرورتوں کا خیال رکھنا دادی ہی کی ذمہ داری تھی، اس طرح وہی دادا کے سامنے زیادہ پڑا کرتی تھیں اور گھریلو معاملات پر دادا کو جو کچھ کہنا ہوتا وہ ان ہی کو مخاطب بنا کر کہا کرتے تھے، مثال کے طور ہم اگر آوارہ گردی میں مشغول پائے گئے یا دیر تک پڑے سوتے رہے، یا رات گئے تک الٹی سیدھی کتابیں پڑھتے رہے تو ان ہی سے کہا جاتا، وہی سب کچھ سنتیں اور خاموش رہتیں، دادا جلال آباد کے مدرسہ مفتاح العلوم میں استاذ تھے، کبھی کبھی دیوبند آیا کرتے تھے، ہفتہ دس دن رہ کر چلے جاتے تھے، رمضان دیوبند ہی میں گزرا کرتا تھا، دادا جتنے دن بھی دیوبند میں رہتے دادی بھی ایک طرح سے گھر میں قید ہوکر رہ جاتیں، اس لئے ان کے آنے سے پہلے عموماً ان کی زبان پر یہ جملہ ہوتا فلاں جگہ ہوآؤں پھر تو تمہارے ابّا آجائیں گے، دادا جنہیں ہم ابا کہا کرتے تھے دادی کو کچھ بھی کہہ دیتے تھے مگر وہ پلٹ کر کبھی جواب نہ دیتیں، خاموشی کے ساتھ سنتی رہتیں، ابّا خود ہی خاموش ہو جاتے، ایسی وفا شعار خدمت گزار اور متحمّل مزاج عورتیں بھی کم ہوتی ہیں۔

ہمارے گھر میں دادی اماں کی شخصیت اگرچہ مرکزی اہمیت کی حامل نہیں تھی، نہ ان کا حکم چلا کرتا تھا اور نہ کسی معاملے میں اُن کی مرضی معلوم کی جاتی تھی، مگر ان کے وجود سے رونق بہت تھی، بعض اوقات سب لوگ ادھر ادھر ہو جاتے اور وہ پورے گھر کی دیکھ بھال کے لئے گھر میں اکیلی بیٹھی رہتیں، گرمی کے لمبے دوپہر میں سب اپنے کمروں میں لیٹ جاتے، وہ برآمدے میں کھرے پلنگ پر لیٹی پنکھا جھلتی رہتیں، اور پورا دوپہر کچھ سو کر کچھ جاگ کر گزار دیتیں، بہت ہی صابر، شاکر اور قناعت پسند عورت تھیں، ہر حال میں خوش، ہر حال میں مگن، نہ کسی سے شکوہ نہ شکایت، نہ کسی کی غیبت نہ برائی، جن خواتین سے بے تکلفی نہ ہوتی ان کے سامنے لئے دئے رہتیں اور بہت کم بول بات کیا کرتی تھیں، کئی گھنٹے کی نشست میں شاید ہی دو چار جملے اُن کی زبان سے ادا ہوتے

ہوں، ہاں جن خواتین سے ان کا مزاج ملتا اور بے تکلفی ہوتی ان سے دیر دیر تک باتیں کرتی تھیں، ہمارے پردادا بجنور سے بہ سلسلۂ ملازمت دارالعلوم میں تشریف لائے تھے، یہاں ان کا کوئی گھر تو تھا نہیں، لگ بھگ پچاس سال کے طویل عرصے تک کرائے کے مکانوں میں رہتے رہے، اس دوران جہاں جہاں رہنا ہوا، وہاں کے پڑوس سے ہماری دادی کا تعلق اتنا مضبوط رہا کہ زندگی کے آخری سانس تک یہ تعلق برقرار رہا، ہم لوگ ان گھروں میں دادی اماں کے ساتھ اتنی کثرت سے آتے جاتے تھے کہ ان کے متعلق ہمارا گمان یہ تھا کہ شاید یہ لوگ ہمارے قریبی عزیز ہیں، ہمارے گھرانوں سے آج بھی ان کا تعلق اسی طرح قائم ہے۔

بچوں سے بہت محبت کرتی تھیں، ان کے گوموت تک دھودیا کرتی تھیں، ایک مرتبہ میرا ایک علاتی چھوٹا بھائی چیچک میں مبتلا ہوا، بڑی خطرناک چیچک نکلی جسم کا کوئی حصّہ ایسا نہ تھا جس پر چیچک نہ ہو، دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہوجاتے تھے، یہ دادی امّاں تھیں جو رات دن اس کی تیمارداری میں لگی رہتیں، یہاں تک کہ سوتی بھی اسی کے پاس تھیں ہفتوں تک یہی سلسلہ رہا، بچوں کی پیدائش کے موقع پر اپنی بہوؤں کی خدمت کرنا بھی ان کے معمولات میں داخل تھا، ایسے موقعوں پر یا ہر مرض میں ہماری دادی اپنی بیٹیوں کے یہاں جاکر بھی رہا کرتی تھیں، پورے خاندان کو ان سے بڑی ڈھارس رہتی تھی ان کا وجود بڑا غنیمت تھا، وہ ہر ایک کے لئے شجر سایہ دار بن جایا کرتی تھیں، انتقال سے دو تین سال پہلے ان کے ایک داماد کا انتقال ہوگیا، اس واقعے نے ان کی صحت پر بُرا اثر ڈالا، ہماری یہ پھوپھی جن کے شوہر کینسر کے مرض میں انتقال کرگئے تھے اقتصادی طور پر بہت پریشان رہا کرتی تھیں، کئی بچے تھے، شوہر کا انتقال ہوا تو گھر کی پریشانیاں اور بڑھ گئیں، ہماری دادی کو ان پریشانیوں کا بڑا احساس تھا، وہ اس فکر میں گھلی جاتی تھیں کہ اب بچوں کا کیا ہوگا، اس واقعے سے ان کی صحت متأثر ہوئی اور وہ

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

دن بہ دن کم زور ہوتی چلی گئیں، یہاں تک کہ پلنگ سے لگ گئیں، مگر اس حالت میں بھی دل دماغ پر بیوہ بیٹی کا خیال حاوی رہا، کچھ دن ایسے بھی گزرے کہ وہ خاموش اور بے سدھ لیٹی رہا کرتی تھیں، یادداشت بالکل جواب دے گئی تھی، مشکل ہی سے کسی کو پہچانا کرتی تھیں، اتفاق سے مجھے اپنی اہلیہ اور بیٹے کے ساتھ شکاگو امریکہ جانا تھا جہاں ہمارے ساس سسر وغیرہ رہتے ہیں، سفر کا پروگرام پہلے سے طے تھا اور قانونی طور پر جانا بھی ضروری تھا، ورنہ ویزا کی مشکلات کھڑی ہوسکتی تھیں، میں جانے سے پہلے ملنے گیا، بے دھیانی سے میری طرف دیکھتی رہیں، پھر نہ جانے کیا خیال آیا میرے دونوں کاندھوں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ دئے اور عجیب مضمحل درد بھری آواز میں انھوں نے صرف ایک لفظ کہا راشو، یہ میری بیوہ پھوپھی کا گھریلو نام ہے مجھے احساس ہوا کہ وہ اس حالت میں بھی اپنی بیوہ بیٹی کے غم سے چھٹکارا نہیں پاسکی ہیں اور مجھے اس کی طرف متوجہ کررہی ہیں، جب میں ان سے رخصت ہوا تو مجھے یہ احساس تھا کہ شاید اب یہ آخری ملاقات ہے، کیوں کہ اب وہ بے حد کم زور ہوگئیں تھیں، اور ان کے ضعف میں دن بہ دن اضافہ ہوتا جارہا تھا، اسی احساس کے ساتھ رخصت ہوا امریک پہنچا، چند ہی دن گزرے تھے کہ یہ اطلاع آگئی کہ دادی رخصت ہوگئیں، دل چاہا کہ کسی طرح اڑ کر دیوبند پہنچ جاؤں، مگر یہ ممکن نہ تھا، دل دیوبند میں ہی پڑا رہا، بار بار رونا آتا رہا، چھپ چھپ کر رویا بھی بہت، مگر جانا سب ہی کو ہے، افسوس وہ ذات رخصت ہوگئی جس نے ماں بن کر ہماری پرورش کی، ہمارے ناز اٹھائے، ہماری کڑوی کسیلی باتیں سنیں، لیکن کبھی ناطہ نہیں توڑا، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے، اور ان کی محبتوں وشفقتوں کا بہترین صلہ عطا فرمائے۔

دادی اماں کے انتقال کو سولہ سال ہوگئے ہیں، یہ چورانوے کی بات ہے، مگر لگتا ہے کل ہی کی بات ہے، ان کی یاد دل میں ہر وقت تازہ رہتی ہے، جب بھی قرآن

کریم کی تلاوت کے بعد دعا کے لئے ہاتھ اٹھتے ہیں تو سب سے پہلے زبان پر دو نام آتے ہیں ایک اپنی والدہ کا جنھوں نے ہمیں جنم دیا، ہم سے بے شمار امیدیں باندھیں، لیکن اس سے پہلے کہ ہماری ذات سے ان کو کوئی خوشی ملتی دنیا سے رخصت ہوگئیں، دوسرا دادی اماں کا جنھوں نے ماں بن کر پالا، جو وقت کی کڑی دھوپ میں ہمارے سروں پر سایہ بن کر کھڑی رہیں، ایصال ثواب کے لئے اپنے سے جو کچھ بن پڑتا ہے کرنے کی کوشش کرتا ہوں مگر حق بات یہ ہے کہ اس طرح کی کسی بھی کوشش سے ان کا حق ادا نہیں ہوتا، انتقال کے بعد سے آج تک جتنی بار میں نے دادی کو خواب میں دیکھا ہے اتنا کسی کو بھی نہیں دیکھا، کبھی نماز پڑھتے ہوئے، کبھی بیٹھے ہوئے، کبھی بات چیت کرتے ہوئے، کبھی اپنے ددھیالی گھر میں اور کبھی خود اپنے گھر میں، بار بار دیکھا ہے، اللہ تعالی ان کی مغفرت کرے، اور ہمیں توفیق دے کہ ہم ان کے لئے ایصال ثواب کی صورت میں کچھ تحفے بھیجتے رہا کریں، زندگی میں تو ہم ان کی کچھ خدمت نہ کرسکے، اب تلافی کی صرف یہی ایک صورت باقی بچی ہے۔

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

آج کچھ درد دل مرے دل میں سوا ہوتا ہے

حضرت مولانا وحید الزماں کیرانویؒ

کچھ حقائق، کچھ تاثرات

سمجھ میں نہیں آتا کیا لکھوں؟ استاذِ محترم حضرت مولانا وحید الزماں کیرانوی کی وفات کے حادثۂ جاں کاہ کو کئی ماہ کا عرصہ گذر چکا ہے، اس عرصے میں شاید ہی کوئی دن ایسا گذرا ہو جس دن میں نے یہ ارادہ نہ کیا ہو کہ استاذ محترم کے تئیں اپنی محبت اور عقیدت کا خراج پیش کرنے کے لیے کچھ لکھوں، لیکن جب بھی میں اپنے اس ارادے کو عمل کا ملبوس پہنانے کے لیے بیٹھا ایسا محسوس ہوا جیسے دل کے سمندر میں جذبات کا طوفان برپا ہو گیا ہو اور میرے خیالات کی کشتی بپھری ہوئی لہروں میں ہچکولے کھانے لگی ہو، نہ جانے کتنی بار کاغذ قلم لے کر بیٹھا لیکن یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ میں اپنے محبوب اور مشفق استاذ کو کس طرح خراجِ عقیدت پیش کروں، اس عظیم شخصیت کو جس نے ہمیں اپنا خون جگر پلایا، جس نے ہمیں ایک مہذب اور باوقار انسان بنانے کے لیے اپنا آرام وراحت قربان کیا، جس نے ہماری زندگی کو مقصدیت عطا کی، جس نے ہمارے عزائم کو بلندی اور حوصلوں کو رفعت بخشی معمولی الفاظ کے ذریعہ کس طرح خراجِ عقیدت پیش کیا جا سکتا ہے۔

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

دنیا میں رات دن آنے اور جانے کا سلسلہ جاری ہے، قیامت تک یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہے گا، یہاں کسی کو دوام نہیں، لوگ آتے ہیں اور کاروانِ زندگی سے بچھڑ جاتے ہیں، لیکن بعض شخصیتیں دنیا کو اس طرح داغِ مفارقت دیتی ہیں کہ ان کی جدائی کے صدمے سے آنکھیں ہی اشکبار نہیں ہوتیں بلکہ دل روتے ہیں، استاذ محترم کی شخصیت بھی ایسی ہی تھی وہ دنیا سے کیا گئے ان کے ہزاروں تلامذہ، متعلقین و منتسبین کی دنیا تاریک ہوگئی، حقیقت یہ ہے کہ جس قدر رجوع استاذ محترم کی طرف تھا اور ان کے تلامذہ کو جس قدر تعلق خاطر اپنے استاذ سے تھا اور اللہ تعالیٰ نے جو شانِ محبوبیت انہیں عطا کی تھی اس کی مثال دارالعلوم کے موجودہ دور میں کہیں نہیں ملتی، آج جب میں لکھنے بیٹھا ہوں تو یہ فیصلہ نہیں کر پا رہا ہوں کہ استاذ محترم کی روشن اور تابناک زندگی کے کس پہلو کو اپنی گفتگو کا عنوان بناؤں، وہ ایک ایسی دل آویز، طرح دار اور دل نواز شخصیت کے مالک تھے جس کا ہر پہلو ممتاز، منفرد اور جداگانہ تھا، جس کا ہر عمل لائق تقلید اور ہر نقش کفِ پا لائق اتباع تھا، وہ اپنے عشاق کے لیے شمع یقین تھے، اپنے شاگردوں کے لیے مینارۂ نور اور اپنے متعلقین کے لیے ایک شجر سایہ دار تھے، وہ جب تک زندگی سے بہرہ ور رہے اپنے عمل سے ماحول کو اجالے اور پاکیزگی بخشتے رہے۔

ایک طالب علم کو اس کی تعلیمی زندگی میں بہت سے لائق اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ طے کرنے کی سعادت حاصل ہوتی ہے، ان میں سے بعض مہربان اور مشفق بھی ہوتے ہیں اور بعض محتاط اور یکسو ہوتے ہیں، میں نے بھی دارالعلوم کے تعلیمی سفر میں بہت سے لائق تعظیم اور مشفق اساتذہ سے رہ نمائی حاصل کی ہے، ان سب کے بے شمار احسانات مجھ پر ہیں لیکن جو بات استاذ محترم میں تھی وہ کسی میں نہیں تھی وہ دارالعلوم کے روایتی اساتذہ کی طرح نہیں تھے جو صرف اپنا فرض منصبی ادا کرتے ہیں اور جن کی تمام تر سرگرمیوں کا مرکز وہ اسباق ہوتے ہیں جو ارباب حل وعقد نے

ان کو تفویض کر رکھے ہیں یا ان کے دائرۂ عمل ان مناصب تک وسیع ہوتا ہے جو انہیں حاصل ہیں یا جن کے حصول کی امید ہے، استاذ محترم بھی ایک استاذ تھے ان کے ذمے بھی کچھ اسباق تھے، لیکن وہ استاذ کم ایک مشفق مربی اور ایک مہربان باپ زیادہ تھے میری طرح ان کی لاتعداد شاگردوں کو یہ فخر حاصل تھا کہ وہ محض تعلیم حاصل نہیں کر رہے ہیں بلکہ ایک رحم دل، ہمدرد اور مزاج شناس باپ کے سایۂ عاطفت میں پرورش پا رہے ہیں، اپنے طلباء سے ان کا لگاؤ، ان کے مشاغل پر گہری نظر، ان کی اصلاح و تربیت کے لیے جہد مسلسل ان کے مسائل سے دل چسپی، ان کی پریشانیوں میں اضطراب، یہ استاذ محترم کی ایسی خصوصیات ہیں جو روایت کے اسیر اساتذہ میں ناپید ہیں، ہر طالب علم ان سے انتساب کو اپنے لیے سرمایۂ افتخار سمجھتا تھا اور جس نے ان کے دامن میں پناہ لے لی اسے یہ احساس سرشار کر جاتا تھا کہ وہ حالات کی تیز دھوپ سے بچ کر ایک ایسے درخت کے سائے میں آ گیا ہے جس کی شاخیں گھنی اور جس کی ہوائیں خنک ہیں۔

میں نے اپنی تعلیمی زندگی کے پورے دو سال استاذ محترم کے مخصوص شعبوں تکمیل ادب عربی اور تخصص ادب عربی میں لگائے اور اس عرصے میں ان کی بے پناہ شفقتوں اور محبتوں سے مالا مال رہا، مجھے یہ لکھنے میں کوئی تامل نہیں کہ استاذ محترم نے اپنی رہنمائی سے میری زندگی کو نیا رخ عطا کیا، میرے تعلیمی سفر کو نیا زاویہ بخشا اور میرے حوصلوں کو نئی جہت دی، بہت ممکن تھا کہ میں آج وہ ہوتا جو میں نہ چاہتا تھا، خدا کے فضل و کرم سے میں اپنی زندگی کے سفر میں اس راستے پر گامزن ہوں جس پر استاذ محترم نے مجھے چلایا اور میری رہنمائی کی۔

شانِ انفرادیت:

دار العلوم کی تعلیمی زندگی میں مجھے سب سے پہلے استاذ محترم سے القرأۃ الواضحہ

کا پہلا حصہ پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی، اس وقت دارالعلوم میں درجہ بندی نہیں تھی، بلکہ طلبہ اپنی خواہش سے بھی خالی گھنٹوں میں یا خارج میں اسباق لے لیا کرتے تھے، بہر حال کسی گھنٹے میں میرا اسبق شروع ہوا، سو ڈیڑھ سو طلباء درسگاہ میں حاضر تھے دوسری درس گاہوں کے برعکس یہاں کا منظر کچھ غیر مانوس اور اجنبی محسوس ہوا، اب تک یہ تو دیکھا تھا کہ ہر کتاب کا آغاز جانے پہچانے انداز میں ہوتا، استاذ صاحب تشریف لاتے، سلام کا تبادلہ ہوتا اور اپنی نشست پر تشریف رکھتے، کوئی طالب علم کتاب کی ابتدائی عبارت پڑھتا اور استاذ صاحب کی تقریر شروع ہوجاتی، یہاں ابتداء ہی عجیب وغریب انداز سے ہوئی، نہ کسی طالب علم سے عبارت پڑھنے کے لیے کہا گیا اور نہ لمبی چوڑی تمہید باندھی گئی اور نہ بسم اللہ پر بحث وگفتگو کے دروازے کھولے گئے، بلکہ طلبہ کے سامنے تعلیم کی افادیت، عربی زبان کے اہمیت اور سبق کے آداب پر کچھ دل میں اتر جانے والی باتیں کہی گئیں، جب اجنبیت کی دیوار گری اور فضا میں انسیت گھلی تو طلبہ سے کہا گیا کہ وہ کھڑے ہوکر اپنا تعارف کرائیں، ہر طالب علم نے اپنا تعارف کرایا اور استاذ صاحب ہر طالب علم کی طرف اس طرح متوجہ رہے جیسے کوئی منکسر المزاج اور متواضع میزبان اپنے کسی پسندیدہ مہمان کی طرف متوجہ رہتا ہے، دو تین روز اسی تعارفی کاروائی میں لگے، یہ نقش اولیں تھا جو میرے اور مجھ جیسے نو آموز طلبہ کی سطح ذہن پر مرتسم ہوا، یہ انوکھی کاروائی ہی ہماری گفتگو کا موضوع بن گئی، پہلے ہی دن تمام ہم سبق ایک دوسرے سے متعارف ہو گئے۔

استاذ محترم کی درسی خصوصیات بھی ان کی شان انفرادیت کو نمایاں کرتی ہیں وہ اس طرح سبق پڑھاتے کہ ایک ایک لفظ ذہن نشین ہوجاتا، پہلے مختلف طلبہ سے سبق کی عبارت پڑھواتے، اگر کوئی طالب علم غلطی کرتا تو دوسرے طالب علم سے سوال کرتے کہ اس نے کیا غلطی کی ہے؟ اگر وہ بتلا دیتا تو اس سے عبارت کی تصحیح کراتے

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

تلفظ کی درستگی اور لہجے کی اصلاح پر خاص توجہ ہوتی، ایک ایک جملہ کئی کئی بار پڑھواتے دائیں بائیں آگے، اور پیچھے بیٹھے ہوئے کسی بھی طالب علم سے عبارت پڑھوائی جاسکتی تھی اور کسی سے کچھ بھی پوچھا جاسکتا تھا، اسی لیے درس گاہ میں ہر شخص حاضر دماغی کے ساتھ بیٹھتا، جہاں ذرا ذہن بھٹکا، چہرے کے تأثر یا آنکھوں کی گردش سے استاذ محترم نے اندازہ لگالیا، اسی وقت گرفت ہوگئی، عبارت کی قرأت، تصحیح واصلاح اور لہجے کی درستگی کے بعد معانی کا نمبر آتا، پہلے ان الفاظ کے معانی بیان کرتے جو گذشتہ اسباق میں گذر چکے ہیں پھر نئے الفاظ کے معانی بتلاتے، اس کے بعد ترجمہ شروع ہوتا مختلف طلبہ بار بار ایک ہی عبارت پڑھتے اور اس کا ترجمہ کرتے، باقی طلبہ سماعت کرتے، دو روز کے بعد مشق وتمرین کا سلسلہ شروع ہوتا، ایک ایک سبق کی تمرین میں کئی کئی دن لگتے، کبھی اردو جملوں کی عربی بنوائی جاتی، کبھی عربی جملوں کا اردو میں ترجمہ کرایا جاتا، کبھی سوال وجواب ہوتے، کبھی طلبہ کا محادثہ کرایا جاتا، غرضیکہ مشق میں اس قدر تنوع تھا کہ ایک دن کا سبق ہفتوں کا سبق بن جاتا، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہماری القرأۃ الواضحہ کا پہلا جزء سال کے آخر تک چلتا رہا، پھر کتابی تعلیم پر ہی قناعت نہیں تھی، ہم اس سبق کے دوران اٹھنے بیٹھنے، گفتگو کرنے چلنے پھرنے اور ہنسنے تک کے آداب سیکھتے تھے، درس گاہ میں کیسا لباس پہن کر آئیں، کس طرح سلام کریں، اگر درسگاہ میں تاخیر سے آئے ہیں تو باہر کھڑے ہوکر کس طرح اجازت لیں، کس طرح بیٹھیں، سبق کے دوران استاذ صاحب کو کس طرح مخاطب کریں، حد یہ ہے کہ کمرے میں کس طرح رہیں بازاروں میں کس طرح جائیں، دوکانوں سے کس طرح خریداری کریں مطبخ سے کھانا کس طرح لائیں یہ اور اس جیسی تمام باتیں ہماری تعلیم کا حصہ بن گئی تھیں اور یہ ایک ایسا سلسلہ تھا جو ہم سب کے لیے نامانوس تھا، لیکن یہ باتیں ایسی تھیں کہ طبیعت خود بہ خود ان کی طرف مائل ہوتی تھی، پھر استاذ محترم کے بولنے کا طریقہ، ان کی

گفتگو کا انداز، ان کے سمجھانے کا اسلوب، دل میں اتر جانے والے الفاظ، کبھی ایسا لگتا جیسے سارے بدن میں نیزے اتر گئے ہوں، اور کبھی دل کو برف کی سی ٹھنڈک اور پھولوں کی سی خوشبو ملتی، کبھی ایسی حرارت نصیب ہوتی جیسے شعلے بھڑک اٹھے ہوں، وہ جادوگر تھے، الفاظ سے ایسا سحر کرتے کہ سننے والا اپنے دل و دماغ پر سے قابو کھو دیتا، وہ ایک سحر طراز شخصیت کے مالک تھے، ان کے ایک گھنٹے کے سبق نے ہماری زندگی میں انقلاب برپا کر دیا تھا اور آہستہ آہستہ ہم اپنے اردگرد کے ماحول میں امتیاز پاتے جارہے تھے، یہ تھا استاذ محترم کی شاگردی کا پہلا سال، اور ان کی ساحری کے زیر اثر آنے کی ابتداء۔

اس کے دو سال بعد استاذ محترم سے ''مقاماتِ حریری'' پڑھی، یہاں بھی پڑھانے کا وہی دل آویز انداز تھا، وہی سرد و گرم لہجہ، وہی دلوں پر حکومت کرنے کے تیور وہی سب کچھ تھا جو دو سال پہلے تھا، فرق صرف اتنا تھا کہ یہاں کتاب کی مقدار خواندگی بھی مفقود تھی، ابتدائی سالوں میں استاذ محترم سے دو کتابیں پڑھیں اور اپنی بساط کے مطابق استفادہ بھی کیا، لیکن اپنی کم ہمتی اور نوعمری کے باعث وہ تقرب حاصل نہ کرسکا جو میرے ہم سبق بعض طلبہ کو میسر تھا اور جس کے ذریعہ وہ عربی زبان و ادب میں اور تہذیب و شائستگی میں اپنی شناخت بنا رہے تھے۔

عالی ظرفی:

چند سال ایسے گذرے کہ ان میں استاذ محترم سے دوری رہی، لیکن دار العلوم کی تعلیمی اور غیر تعلیمی سرگرمیوں میں میرا انہماک بڑھ گیا، انجمنوں میں حصہ لینے لگا اردو زبان میں لکھنے کا شوق بھی ہوا لیکن صرف مقامی سطح پر وہ بھی محض اپنے جذبات کی تسکین کی خاطر اور اس ہیجان پر قابو پانے کے لیے جو برسر اقتدار کانگریس کے مسلم مخالف فیصلوں سے پیدا ہوتا رہتا تھا، ان دنوں کانگریس سے اس قدر نفرت تھی کہ کسی

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

مسلمان لیڈر کی اس کے ساتھ وابستگی کو ہم نہایت مکروہ سمجھتے تھے، ایک سرکردہ عالم دین اور ایک مسلم جماعت کے سربراہ اس زمانے میں کانگریس کے ایک فعال رکن تھے اور راجیہ سبھا میں اس کے نامزد ممبر کی حیثیت سے بیٹھتے تھے، استاذِ محترم کو ان سے بڑا تعلق خاطر تھا، ان کی مخالفت میں کوئی لفظ سننا انہیں گوارا نہیں تھا، اسی زمانے میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے سلسلے میں وہ سیاہ بل پاس ہوا جس سے اس کا اقلیتی اور اقامتی کردار متأثر ہو رہا تھا، مسلمانوں میں اس بل کے خلاف نہایت غم وغصہ تھا، خاص طور پر ملت کے وہ رہنما جنہوں نے اس بل کی خاموشی تائید کی تھی مسلمانوں کے غصے کا شکار ہو رہے تھے، ہم بھی جوش اور جذبات سے لبریز تھے، اور جن بزرگ کا ہم نے ذکر کیا ہے ان کے خلاف اخبارات میں لکھ لکھ کر دل کی بھڑاس نکال رہے تھے، سولہ سترہ سال کی عمر بے شعوری کی عمر ہوتی ہے، عواقب کا خیال نہیں ہوتا اور نہ نفع ونقصان پر نظر ہوتی ہے، اس وقت دار العلوم میں اس مسلم جماعت کی ممبر سازی بھی ہوتی تھی، خاصی تعداد میں طلبہ اس کے ممبر بنتے تھے، ہم نے پوسٹر لگا کر اور دیواری پرچوں میں مضامین لکھ لکھ کر ممبر سازی کے اس کے سلسلے کو رکوانے کی کوشش کی، ممبر سازی تو خیر کیا رکتی، طلبہ میں گروپ بندی ہوگئی اور وہ اساتذہ بھی کھل کر میدان میں آگئے جو اس جماعت سے وابستہ تھے استاذ محترم کا تعلق بھی اسی جماعت سے تھا اور اس قدر پختہ تھا کہ پورے ملک کی مخالفت اور صدائے احتجاج بھی انہیں اپنے موقف سے ہٹنے پر مجبور نہ کرسکتی تھی، اگرچہ استاذ محترم کے پاس ان دنوں ہمارا کوئی سبق نہیں تھا اور بدقسمتی سے میں اس تعلق کو بھی برقرار نہ رکھ سکا تھا جو گذشتہ برسوں میں قائم ہوا تھا تاہم سلام کلام کا سلسلہ تھا جب بھی سامنا ہوتا میں ادب واحترام سے سلام کرتا اور وہ محبت سے جواب دیتے لیکن اس سیاسی ہنگامہ آرائی کا نتیجہ یہ نکلا کہ استاذ محترم نے سلام کا جواب تو کیا بلکہ نظر اٹھا کر دیکھنا تک بند کردیا، یہ بھی استاذ محترم کی ایک ادا تھی، جس سے ناراض ہوتے اپنے

طرزِ عمل سے اس کا صاف صاف اظہار کر دیتے، نہ خود میں منافقت تھی اور نہ دوسروں میں منافقت پسند کرتے تھے۔

شاید کچھ وقت گذرنے پر یہ ناراضگی دور ہو جاتی، لیکن دارالعلوم کے ماحول میں رونما ہونے والے ایک اور واقعے نے اس ناراضگی کو مزید غذا فراہم کر دی، دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث حضرت مولانا فخر الدینؒ کے انتقال کے بعد دارالعلوم میں بخاری شریف کی تدریس کا مسئلہ انتظامیہ اور طلبہ کے درمیان اختلاف کا سبب بن گیا تھا، اس وقت حضرت مولانا شریف الحسنؒ کی قابلیت اور علمیت کے سب معترف تھے علوم حدیث پر ان کی گہری نظر تھی، طلبہ بجا طور پر یہ توقع کر رہے تھے کہ ان کی بخاری شریف کا درس حضرت مولانا شریف الحسنؒ سے متعلق کیا جائے گا، بالفاظ دیگر انہیں نیا شیخ الحدیث نامزد کیا جائے گا، لیکن ایسا نہیں ہوا، بلکہ ایک دوسرے استاذ کو ان کی سینیارٹی کی بنیاد پر شیخ الحدیث بنا دیا گیا، طلبہ کو ان سے تشفی نہیں ہوئی اس لیے سبق شروع ہونے کے بعد بھی یہ کوشش جاری رہی کہ بخاری شریف کا درس ان کے یہاں سے تبدیل ہو کر مولانا شریف الحسنؒ کے یہاں چلا جائے، اس سلسلے میں جمہوری طرز پر تحریک چلائی گئی، حضرت مہتمم صاحبؒ اور مجلس شوریٰ کے مؤثر اراکین سے ملاقاتیں کی گئیں اور ان کی خدمت میں درخواستیں پیش کی گئیں، دارالعلوم دیوبند کے جن قدیم استاذ صاحب کو شیخ الحدیث کے منصب پر فائز کیا گیا تھا وہ ان دنوں اس جماعت کے (جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے) دیوبند شاخ کے صدر تھے، اس طرح یہ مسئلہ تعلیمی سے زیادہ سیاسی بن گیا، استاذ محترم کیوں کہ اپنی جماعت میں سب سے زیادہ باحوصلہ انسان تھے، قوت فیصلہ اور مقاصد سے وابستگی کو اخلاص کے ساتھ اہمیت دیتے تھے اس لئے وہ مقابلے میں سینہ تان کر کھڑے ہو گئے انھیں غصّہ ان طلبہ پر تھا جو بخاری شریف کا درس تبدیل کرانا چاہتے تھے، شوریٰ میں بھی دو گروپ بن گئے تھے، بالآخر طے یہ ہوا

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

کہ بخاری حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب پڑھائیں گے، لیکن اپنے مسلسل اسفار، اہتمام کی مصروفیات اور پیرانہ سالی کے باعث حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نے چندروز بخاری کا درس دیا، اس کے بعد معذرت پیش کر دی بالآخر شوریٰ کو یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ بخاری حضرت مولانا شریف حسن پڑھائیں گے، شوریٰ نے اس مسئلے کی نزاکت کو محسوس کیا طلبہ کے دباؤ سے نہیں بلکہ خالص علمی بنیادوں پر وہ فیصلہ کیا گیا جس کے لیے طلبہ جدوجہد کر رہے تھے، اس طرح ہمیں اپنی تحریک میں کامیابی تو مل گئی لیکن اس دوران جو واقعات پیش آئے ان سے استاذ محترم کے ساتھ ایک نئے اختلاف کی بنیاد پڑ گئی۔

اس حکایت دراز سے داستان سرائی مقصود نہیں ہے، بلکہ ان واقعات سے استاذ محترم کی مزاجی خصوصیات اور اپنے ساتھ ان کے طرز عمل پر روشنی ڈالنا مقصود ہے، دورۂ حدیث شریف کا سال پورا ہوا، دورہ حدیث شریف کی تکمیل کے بعد طلبہ کی بڑی تعداد دارالعلوم سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو جاتی ہے، کچھ طلبہ ایسے بھی ہوتے ہیں جو مختلف شعبوں میں داخلہ لے کر کچھ اور وقت مادرِ علمی کی رفاقت میں گذارنے کے آرزومند ہوتے ہیں، میری دلی خواہش تھی کہ میں عربی زبان پر دست رس حاصل کروں، اس کے لیے ضروری تھا کہ شعبۂ تکمیل ادب میں داخلہ لوں، اس شعبے کی تمام تر ذمہ استاذ محترم پر تھی اور تمام اسباق آپ ہی سے متعلق تھے، اگرچہ میں اس شعبے میں داخلے کی تمام شرائط پوری کر رہا تھا لیکن گذشتہ چند سالوں کے واقعات اور ان سے پیدا ہونے والی تلخی اور دوری نے مجھے اس شعبے میں داخلہ لینے سے روکا، میں اپنی کم فہمی کے باعث یہ جرأت بھی نہ کر سکا کہ اپنے بہتر مستقبل کے لیے استاذ محترم کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں اور اظہار ندامت سے تلافیٔ مافات کر لوں، مجبوراً شعبۂ تفسیر میں داخلہ لینا پڑا۔

اللہ تعالیٰ استاذ محترم کو جزائے خیر عطا کرے انہوں نے جب کسی ذریعے سے

سنا کہ میرا ارادہ تکمیلِ ادب میں داخلہ لینے کا تھا لیکن گذشتہ سالوں کے ناگوار واقعات مجھے اس شعبے میں داخلے سے روک رہے ہیں اور میں ان حالات میں حاضر ہونے کی جرأت سے بھی محروم ہوں تو انہوں نے از خود میرے ماموں حضرت مولانا شریف الحسنؒ کے ذریعے کہلایا کہ میرے دل میں کسی طرح کی کوئی رنجش باقی نہیں ہے، وہ میری ناراضگی کے موہوم تصور سے اپنا سال برباد نہ کرے اور فوراً مجھ سے رابطہ قائم کرے میرے لیے یہ دعوت ایک نوید تھی، ڈرتا ڈرتا حاضر ہوا، مسکرا کر سلام کا جواب دیا، کچھ حوصلہ ملا، خود ہی گفتگو شروع کی، فرمایا اس سے خوشی ہے کہ تم تکمیل ادب کرنا چاہتے ہو، مگر تمہاری اس حماقت پر افسوس ہوا کہ تم معمولی واقعات کو بنیاد بنا کر اپنا مستقبل تباہ کررہے ہو، پوری گفتگو یاد نہیں، اتنا ذہن میں ہے کہ مجھے پڑھنے لکھنے میں انہماک اور سیاسی سرگرمیوں سے کنارہ کشی کی تلقین فرمائی، آخر میں فرمایا کہ تم ضرور اس شعبے میں داخلہ لو، ماضی میں جو ہو چکا ہے اسے بھول جاؤ، لیکن تمہیں یہ وعدہ کرنا ہوگا کہ مستقبل میں کوئی ایسا کام نہ ہو جس سے مجھے تکلیف پہونچے، میں اس زمانے میں ایک مقامی پندرہ روزہ اخبار میں ایک شخصیت کی کانگریس نوازی کے خلاف کچھ نہ کچھ لکھتا رہتا تھا اس سلسلے میں فرمایا کہ اس خاندان سے مجھے محبت اور تعلق ہے، میں یہ نہیں کہتا کہ تم بھی تعلق رکھو لیکن کوئی ایسا کام بھی نہ کرو جس سے مجھے تکلیف ہو اور دوسروں کو یہ کہنے کا موقع ملے کہ تمہارا فلاں شاگرد ایسا کر رہا ہے۔

اس واقعے سے استاذ محترم کی متعدد اہم خصوصیات پر روشنی پڑتی ہے، بلاشبہ وہ اعلا ظرفی اور وسیع المشربی کا زبردست نمونہ تھے، انہیں اپنے شاگردوں کے بہتر مستقبل کی فکر دامن گیر رہتی تھی، وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ استاذ اور شاگرد کے درمیان بے مثال ذہنی ہم آہنگی ہوتا کہ شاگرد صحیح طور پر اکتساب فیض کرسکے، پھر جس جماعت کے وہ رکن تھے اور جس شخصیت کو اس کے خاندانی پس منظر کے باعث یا اس کی ملکی وملی

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

خدمات کی وجہ سے اپنا قائد مانتے تھے اس سے مکمل وفاداری بھی تھی، یہی وجہ ہے کہ وہ اس شخصیت کے خلاف کوئی نامناسب بات سننے کے متحمل نہیں تھے خاص طور پر اپنے تلامذہ سے۔

تکمیل ادب میں داخلے کے بعد تعلیم کا آغاز ہوا، شروع کے چند دنوں ہی میں استاذ محترم نے یہ اندازہ لگالیا کہ جماعت کے کچھ طلبہ اچھی صلاحیت رکھتے ہیں اور کچھ کم زور ہیں، فوراً ہی طلبہ کے دو گروپ بنا دیئے اور کم زور طلبہ کو مولانا عبدالخالق مدراسی کے سپرد کردیا گیا جوان دنوں حضرت کی کوشش اور جدوجہد سے معاون مدرس کے طور پر مقرر کیے گئے تھے اور دوسرے گروپ کو اپنے پاس رکھا، خوش قسمتی سے میرا تعلق اسی دوسرے گروپ سے تھا، اللہ کا فضل ہے میں نے اپنے استاذ محترم کی توقعات پر پورا اترنے کی بھرپور کوشش کی اور مختلف مواقع پر حضرت کی ستایش سے یہ اندازہ بھی ہوا کہ میں اپنی کوشش میں کچھ نہ کچھ کامیاب ضرور ہوں۔

النادی الادبی ایک مکمل ادارہ:

ان دنوں دارالعلوم میں عربی زبان سیکھنے کا شوق کافی بڑھا ہوا تھا، بے شمار طلبہ القرأۃ الواضحہ کے اجزاء سبقاً سبقاً پڑھنے میں مصروف تھے، استاذ محترم نے عربی زبان کی ترویج واشاعت کے مقصد سے طلبہ کو مشق وتمرین کی سہولتیں بہم پہنچانے کے لیے ''النادی الادبی'' کے نام سے ایک انجمن قائم کررکھی تھی، استاذ محترم اس کے المشرف العام (سرپرست اعلا) تھے، انجمن کی باقی تمام ذمہ داریاں طلبہ کے سپرد تھیں، بہ ظاہر یہ ایک انجمن تھی لیکن حقیقت میں یہ ایسا ادارہ تھا جہاں طلبہ عربی زبان میں تحریر وتقریر کی مشق بھی کرتے تھے اور تہذیب وشائستگی کا درس بھی لیتے تھے دارالعلوم کے تمام ذہین، باشعور اور باصلاحیت طلبہ اس انجمن کے رکن تھے اور اس طرح استاذ محترم ''النادی الادبی'' کے ذریعہ بلکہ النادی الادبی کے واسطے سے اپنی

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

خدمات کے ذریعہ تمام طلبہ کے دل و دماغ پر حکومت کرتے تھے۔

ابھی تعلیمی سال کے آغاز کو ایک ہی مہینہ گذرا تھا کہ استاذ محترم نے ''النادی الادبی'' کی نئی کابینہ تشکیل فرمائی اور میں اس وقت خوش گوار حیرت میں پڑ گیا جب استاذ محترم نے یہ بتلایا کہ تمہیں ''النادی الادبی'' کا معتمد بنا دیا گیا ہے، یہ ایک بڑی ذمہ داری تھی، دارالعلوم دیوبند میں طلبہ کی سب سے بڑی انجمن کا معتمد بننا کوئی معمولی اعزاز نہیں تھا، ماضی میں لائق اور ہونہار طلبہ اس عہدے پر فائز رہ چکے تھے استاذ محترم کا یہ فیصلہ جس طرح میرے لیے باعثِ حیرت تھا اسی طرح دوسرے لوگ بھی کچھ کم حیرت زدہ نہیں تھے، ہر شخص یہ سوچنے میں حق بجانب تھا کہ ایک ایسے شخص کو جس کی وابستگی دوسرے گروپ سے ہے، (حالانکہ ایسا نہیں تھا) اس اعزاز سے سرفراز کرنا ہوش مندی اور دانائی نہیں ہے، جماعت کے بعض لوگوں نے کھلے لفظوں میں اس فیصلے پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا، لیکن استاذ محترم نے کبھی اس طرح کے دباؤ قبول نہیں کیے، وہ اگر کوئی فیصلہ کرتے تو اس کے تمام پہلوؤں پر ان کی نظر ہوتی تھی فیصلہ کرنے کے بعد محض کسی کے کہنے سے اس کو مسترد کرنا ان کے مزاج کے خلاف تھا اس لیے نکتہ چینوں کو دوٹوک الفاظ بتلا دیا گیا کہ یہ فیصلہ تعلیمی پس منظر میں کیا گیا ہے اس کا جماعتی سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

تکمیل ادب عربی اور النادی الادبی میں شرکت نے استاذ محترم کی خدمت میں زیادہ سے زیادہ حاضر رہنے کے مواقع بخشے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ دن میری زندگی کے سنہرے دن تھے، میں نے اگر کچھ سیکھا تو انہی دنوں میں، قدم قدم پر استاذ محترم کی رہنمائی نے ذہن وفکر کی دنیا میں ایک ایسا انقلاب برپا کیا جس کے اثرات آج تک باقی ہیں، میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ استاذ محترم روایتی استاذ نہیں تھے بلکہ وہ ایک مہربان باپ تھے جس کو ہر لمحہ اپنے بیٹے کے تابناک مستقبل کا خیال رہتا ہے، انہیں

اپنے وقت اور صحت کی فکر نہیں تھی، وہ دارالعلوم کی زندگی میں ایسی مشین بن گئے تھے جسے ہر وقت متحرک رہنا ہے۔

دل چاہتا ہے ''النادی الادبی'' کا کچھ اور ذکر کروں، یہ انجمن استاذ محترم کی محنتوں کا ثمر، ان کی امنگوں کی آماج گاہ، ان کے حسین خوابوں کی تعبیر، ان کے تخیل کی اڑان اور ان کے خون جگر سے سینچا ہوا وہ شاداب پودا تھا جو اب تناور درخت بن گیا ہے اور جس کے برگ و بار دارالعلوم کی حدود سے گذر کر اب دنیا کے بے شمار مدارس میں پہنچ چکے ہیں، یہ انجمن استاذ محترم کی ایک ایسی علمی یادگار ہے جسے مستقبل کا کوئی مؤرخ نظر انداز نہیں کرسکتا، اس کے ذریعہ استاذ محترم نے جو خدمت انجام دی ہے وہ ناقابل فراموش ہے، کوئی تسلیم کرے یا نہ کرے، لیکن جو لوگ اس انجمن کے رکن رہ چکے ہیں وہ اس کی اہمیت اور افادیت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہیں۔

یہ انجمن دارالعلوم کے ان طلبہ کے لیے تشکیل دی گئی تھی جو عربی زبان میں تقریر وتحریر کی مشق کرنا چاہتے ہوں، اس کا ایک دفتر تھا، جس میں سلیقے سے متعدد ڈیسک رکھے ہوئے تھے اور ہر ڈیسک پر النادی الادبی کے کسی ایک ذمہ دار کے منصب کی تختی رکھی ہوئی تھی، الماریوں میں قرینے سے فائلیں اور رجسٹر رکھے ہوئے تھے دیواروں پر طلبہ کی تحریری کاوشوں کے نمونے شیشے کے بڑے بڑے فریموں میں آویزاں تھے، النادی الادبی کا مکمل نظام تھا، پوری انجمن مختلف شعبوں پر منقسم تھی شعبۂ تقریر، شعبۂ تحریر، لائبریری، مالیات، شعبۂ اصلاح، شعبۂ تعاون وغیرہ، ہر شعبے میں تین عہدے دار تھے، ایک ناظم، دوسرا نائب، تیسرا معاون، معتمدان تمام شعبوں کا سربراہ تھا اور براہ راست سرپرست اعلیٰ کو جواب دہ تھا، شعبۂ تقریر کے تحت طلبہ عربی زبان میں تقریر کی مشق کرتے تھے، اس کے لیے جمعرات کے دن مغرب کی نماز کے بعد دارالعلوم کی مختلف درس گاہوں میں آٹھ آٹھ دس دس طلبہ ایک جگہ بیٹھتے، ایک

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

طالب علم جو ان سب میں ممتاز اور باصلاحیت ہوتا ان کی نگرانی کرتا، یہ ایک چھوٹا سا جلسہ ہوتا تھا، اور اس میں ایک مکمل اجلاس کے آداب کی رعایت کی جاتی تھی، مراقب یا نگراں کسی طالب علم کے نام کا اعلان کرتا اور وہ متعین جگہ پر کھڑے ہوکر اپنی صلاحیت اور استعداد کے مطابق تقریر کرتا، نگراں کے پاس النادی الادبی کے مطبوعہ فارم ہوتے تھے، جن پر مقرر کا نام اس کی تقریر کا عنوان تحریر کیا جاتا اور یہ لکھا جاتا کہ اس نے کتنی دیر تقریر کی ہے، اس کا لہجہ کیسا تھا، اس کی تقریر میں نحوی، صرفی اور لغوی غلطیاں کتنی تھیں، بعد میں یہ فارم دفتر میں جمع ہوتے، اس طرح تمام ممبر طلبہ کی ہفتہ وار سرگرمیوں کی رپورٹ معتمد کے سامنے رہتی، ماہانہ اور سالانہ جلسوں میں ان سے بڑی مدد ملتی تھی ان جلسوں میں خاص طور پر ان طلبہ کو ترجیح دی جاتی تھی جن کی کارکردگی ہفتہ وار اجتماعات میں اچھی رہی ہو۔

ماہانہ جلسوں کی اپنی الگ شان تھی، کئی دن پہلے دارالعلوم کے صدر گیٹ پر یہ اعلان لگا دیا جاتا تھا کہ فلاں تاریخ کو النادی الادبی کا ماہانہ اجتماع منعقد ہوگا، جو طلبہ اس اجتماع میں اپنی تحریری یا تقریری کاوشیں پیش کرنا چاہتے ہوں وہ درخواست دے دیں، اسی کے ساتھ اجتماع کی باقاعدہ تیاری شروع ہوجاتی، خواہش مند طلبہ سے ان کے مقالے، تقریریں، نظمیں اور محادثے حاصل کر لیے جاتے، معتمد اور شعبۂ تقریر کے ذمہ دار لوگ ان کاوشوں پر غور و خوض کرتے، ضرورت ہوتی تو اصلاح کرتے، لمبی اور طویل تحریروں کو مختصر کرتے تاکہ کم وقت میں زیادہ سے زیادہ طلبہ کو موقع دیا جاسکے، یہ اجلاس پورے مہینے کی کارکردگی کا مظاہرہ ہوتا تھا اس لیے بڑی دل جمعی اور نہایت ذوق وشوق کے ساتھ اس کی تیاری ہوتی تھی اور یہ کوشش کی جاتی تھی کہ پورا پروگرام اتنا دلچسپ اور ہمہ جہت ہو کہ سامعین شروع سے آخر تک جلسہ گاہ میں جمے رہیں اس مقصد کے لیے نئے نئے موضوعات پر دلچسپ محادثے (مکالمے) تیار کئے جاتے

تھے، اور دو ایک تقریروں یا مقالوں کے بعد ایک محادثہ پیش کر دیا جاتا تھا، ماہانہ اجتماعات میں استاذ محترم لازماً شرکت فرماتے تھے، بعض دوسرے مدرسین کو بھی شرکت کی دعوت دی جاتی تھی اور اکثر و بیشتر اساتذۂ دارالعلوم ہی جلسوں کی صدارت بھی کیا کرتے تھے۔

راقم السطور جب النادی الادبی کا معتمد تھا تو ایک مرتبہ استاذ محترم نے ایک نئی تجویز رکھی کہ ماہانہ اجتماعات کی صدارت کوئی ذہین اور ممتاز طالب علم کیا کرے، کسی جلسے کی صدارت کرنا بھی ایک فن ہے اور دارالعلوم سے رخصت ہونے کے بعد ایسے مواقع پیش آسکتے ہیں کہ کسی جلسے کی صدارت کرنی پڑ جائے، اس لیے تقریر کی طرح صدارت کی مشق بھی ہونی چاہیے، دارالعلوم کے ماحول میں یہ انوکھا فیصلہ تھا، اول تو کوئی طالب علم اپنے ہی جیسے ساتھیوں کے اجتماع کی صدارت کرے، یہ معاملہ ہی کچھ کم حیرت انگیز نہیں، پھر اپنے اساتذہ کی موجودگی میں صدارت کرنا، آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ دارالعلوم کے روایتی ماحول میں جہاں عربی زبان کا یہ چلن ہی لوگوں کی نگاہوں میں خار کی طرح کھٹکتا تھا اس طرح کی جدت طرازیوں پر کیا کچھ واویلا نہ ہوا ہوگا، لیکن ظاہر ہے استاذ محترم کا یہ فیصلہ کسی کی اہانت کے لیے نہیں تھا اور نہ اس لیے تھا کہ طلبہ میں عُجب اور پندار پیدا کیا جائے بلکہ اس کا مقصد صرف اتنا تھا کہ طلبہ جس طرح نظامت اور خطابت کی مشق کرتے ہیں اسی طرح صدارت کی بھی مشق کر لیں، بہر حال متعدد طلبہ نے اپنے اساتذہ کرام کی موجودگی میں صدر جلسہ بننے کا شرف حاصل کیا پورے وقار اور ادب کے ساتھ، اپنے بڑوں کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے، محض مشق کی خاطر، نہ کہ خودنمائی اور ستائش کے لیے۔

دارالعلوم کے تعلیمی اور ثقافتی ماحول پر ''النادی الادبی'' کے ماہانہ اجتماعات کے زبردست اثرات مرتب ہوتے تھے، طلبہ میں عربی زبان سے دل چسپی اور وابستگی

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

بڑھتی تھی، نئے طلبہ آنا چاہتے تھے اور پرانے طلبہ زیادہ بہتر انداز میں کام کرنا چاہتے تھے اور کامیابیوں سے حوصلہ پاکر ذمہ دار طلبہ نقش ثانی کو نقش اول سے بہتر بنانے کی کوشش کرتے تھے، اجتماعات میں پیش کیے گئے پروگراموں کے معیار اور جلسہ گاہ کے نظم ونسق میں استاذ محترم کے ذہن وفکر کی جھلک ملتی تھی، یہ ماہانہ اجتماعات دوسری اضلاعی انجمنوں کے لیے نمونہ اور معیار قرار پاتے تھے۔

النادی الادبی کا سالانہ اجتماع دارالعلوم کی تعلیمی زندگی کا ایک بے مثال پرجوش اور کیف آور واقعہ ہوا کرتا تھا، تقریباً دو ماہ پہلے سے اس اجتماع کی تیاری شروع کردی جاتی تھی، خواہش مند طلبہ سالانہ اجتماع میں پروگرام پیش کرنے کے لیے درخواستیں دیتے تھے، مگر ترجیح ان طلبہ کو دی جاتی تھی جنہوں نے ہفتہ وار اور ماہانہ اجتماعات میں عمدہ کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہو، جس کی درخواست منظور ہوجاتی اسے اس کی استعداد اور صلاحیت کے مطابق موضوع دیا جاتا، اجتماع سے کافی پہلے تمام طلبہ سے ان کے موضوعات تحریری شکل میں لے لیے جاتے، ان پر غور کیا جاتا، بعض طلبہ کے مضامین دفتر ہی میں صحیح کردیئے جاتے اور بعض طلبہ سے دوبارہ لکھنے کے لیے کہا جاتا، بعض طلبہ کو دفتر میں بلاکر تقریریں اور محادثے سنے جاتے، جلسہ گاہ کے نظم ونسق کے متعلق تمام جزئیات پر نظر ڈالی جاتی اور ہر کام کے لیے طلبہ میں سے ذمہ دار مقرر کیے جاتے، یہ زمانہ النادی الادبی کے اراکین کے لیے مصروفیت کا زمانہ ہوتا تھا، رات رات بھر دفتر کھلتا، چاروں طرف سے مشقوں کی آوازیں سنائی دیتیں، خاص بات یہ ہے کہ استاذ محترم ہر مرحلے میں اپنے طلبہ کے ساتھ شریک رہتے، اپنا قیمتی وقت بھی دیتے اور اپنی جیب بھی ہلکی کرتے۔

یادگار سالانہ اجتماع:

راقم السطور کے دور معتمدی میں طلبہ نے اس کثرت سے سالانہ اجتماع میں

شرکت کے لیے درخواستیں دیں کہ ہمارے لیے پروگرام کو سمیٹنا مشکل ہو گیا، مجبور ہو کر یہ فیصلہ کیا گیا کہ اس اجتماع کو دو روزہ کر دیا جائے، اس طرح طلبہ کی اچھی خاصی تعداد کو اجتماع میں پروگرام پیش کرنے کا موقعہ مل گیا، النادی الادبی کے سالانہ اجتماعات کی ایک اہم خصوصیت یہ ہوتی تھی کہ اس میں ملک وملت کی کسی اہم شخصیت کو بہ طور صدر مدعو کیا جاتا تھا، خاص طور سے کسی ایسی شخصیت کو جس کا دارالعلوم دیو بند سے علمی اور فکری تعلق بھی ہو، اس اجتماع کی صدارت کے لیے دارالعلوم دیو بند کے سابق رکن شوریٰ حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ (امیر شریعت بہار واڑیسہ) کو دعوت دی گئی تھی، سہولت یہ ہوئی کہ اس موقع پر دارالعلوم کی مؤقر مجلس شوریٰ کا اجلاس بھی منعقد ہو رہا تھا، اس طرح مجلس شوریٰ کے تمام اراکین کو النادی الادبی کی سرگرمیوں اور عربی زبان کے لیے ان کے جذبوں اور ولولوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع مل گیا۔

اجتماع رات میں تھا، دن میں النادی الادبی کی طرف سے ایک عصرانے کا اہتمام کیا گیا تھا، جس میں النادی الادبی کے تمام اراکین کے علاوہ دارالعلوم کی تمام اصلاحی انجمنوں کے صدور اور نظماء بھی مدعو تھے، دارالعلوم کے تمام اساتذہ کو بہ طور خاص دعوت دی گئی تھی، بہت سے اساتذہ نے عصرانے کو رونق بخشی اس پروگرام کی مرکزی شخصیت حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ تھے، عصرانے کا اہتمام دارالحدیث فوقانی میں کیا گیا تھا اور کوشش یہ کی گئی تھی کہ تمام حاضرین ایک ہی نشست میں چائے نوش کرلیں، استاذ محترم نے پورے پروگرام کی خود نگرانی فرمائی اور ہر کام میں پورا پورا حصہ لیا، نشستوں کی ترتیب اس طرح رکھی گئی تھی کہ دارالحدیث میں ایک دائرہ سا بن گیا، درمیان میں حضرت مہتمم صاحبؒ اور اساتذہ کرام جلوہ افروز ہوئے اور ان کے چاروں طرف طلباء کی قطاریں لگیں، اس خوب صورت اور باوقار منظر سے حضرت مہتمم صاحب بے حد متاثر ہوئے اور اپنے مزاج کے مطابق تعریفی کلمات ارشاد

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

فرمائے، استاذ محترم نے شکریہ ادا کرتے ہوئے درخواست کی کہ اجتماعی کھانے میں اللہ نے جو برکت اور وقار رکھا ہے وہ الگ الگ کھانے میں نہیں ہے، کیا ہی اچھا ہو اگر دارالعلوم میں طلبہ کے لیے اجتماعی طور پر کھانا کھانے کا کوئی کشادہ ہال تعمیر ہو جائے حضرت مہتمم صاحب نے اس خیال کی تصویب فرمائی اور وعدہ فرمایا کہ وہ اس ضمن میں مجلس شوریٰ کے رواں اجلاس میں تجویز رکھیں گے، معلوم ہوا یہ تجویز رکھی گئی اور منظور بھی ہوئی اور جہاں تک مجھے یاد ہے اس کے لیے اس جگہ کا انتخاب بھی ہوا جہاں آج کل رواق خالد ہے، لیکن معلوم نہیں کس طرح یہ تجویز سرد خانے میں چلی گئی اور آج تک سرد خانے میں ہے، جب کہ بے شمار مدارس میں اجتماعی طور پر کھانے کے کامیاب تجربے ہو چکے ہیں، گجرات کے اکثر مدارس میں اس مقصد کے لیے وسیع ہال تعمیر کیے گئے ہیں، تمام طلبہ وقت مقررہ پر آتے ہیں اور بیس پچیس منٹ میں کھانے سے فارغ ہو کر چلے جاتے ہیں، نہ مطبخ میں لائن لگانی پڑتی ہے، نہ کھلے برتنوں میں کھانا لے کر دو دو فرلانگ کا فاصلہ طے کرنا پڑتا ہے، نہ یخ سالن کھانا پڑتا ہے، نہ طلبہ کا ذہن برتنوں کو دھونے رکھنے میں مشغول ہوتا ہے، نہ کمرے گندے ہوتے ہیں، نہ کم کھانے والے کھانا ضائع کرتے ہیں اور نہ زیادہ کھانے والے بھوکے رہتے ہیں، معلوم نہیں کیوں ارباب دارالعلوم ایک ساتھ بٹھا کر کھلانے کو معیوب سمجھتے ہیں؟

یہ ایک جملہ معترضہ آ گیا ورنہ میں تو اجتماع کے سحر میں گم تھا، استاذ محترم کی نگرانی، توجہ اور شوق نے منتظمین کی محنت اور جانفشانی نے اور عام طلبۂ دارالعلوم کے جوش و خروش نے اس جلسے کو ایک یادگار جلسہ بنا دیا، آج بھی جب کبھی اس اجتماع کا خیال آتا ہے تو دل کے نہاں خانوں میں یادوں کے چراغ روشن ہو جاتے ہیں۔

استاذ محترم کے تخیل کی پرواز جداگانہ تھی، نئے بال و پر تلاش کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا، وہ اپنی جدت طرازیوں سے کسی بھی واقعے کو یادگار بنانے کے فن سے بہ خوبی

واقف تھے، استاذ محترم نے صدر جلسہ کے استقبال کے لیے النادی الادبی کے اراکین میں سے تقریباً تین سو طلبہ کا انتخاب فرمایا تھا، اس گروپ میں شامل تمام طلبہ سفید کرتے سفید پاجامے اور سفید دو پلی ٹوپی میں ملبوس تھے، سفید کرتے پاجامے تو طلبہ کے پاس موجود تھے لیکن کیوں کہ طلبہ عموماً دیوبندی ٹوپی (گاندھی کیپ کی بگڑی ہوئی شکل کی ٹوپی) پہنتے ہیں اس لیے اس موقع کے لیے سفید کپڑے کی تین سو دوپلّی ٹوپیاں بطور خاص سلوائی گئی تھیں، دارالحدیث تحتانی کے شمالی حصے میں بنے ہوئے طویل وعریض اسٹیج سے مہمان خانے کے کمرے تک جہاں حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ مقیم تھے، ان سفید پوش طلبہ کی دورویہ قطار بنائی گئی تھی، درمیان میں مہمان محترم کے گذرنے کا راستہ چھوڑ دیا گیا تھا، جیسے ہی مہمان محترم نے اپنے کمرے سے باہر قدم رکھا فضا دارالعلوم تدوم اور الشیخ منۃ اللہ یعیش کے پرجوش نعروں سے گونج اٹھی اور نعروں کا یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک مہمان محترم اسٹیج پر جلوہ افروز نہیں ہوگئے، یہ اجتماع استاذ محترم کے حسن انتظام، سلیقہ مندی اور فکر وتدبر کا ایک ایسا مظاہرہ تھا جس کی صدائے بازگشت سے کافی دنوں تک دارالعلوم کے دیوار ودر گونجتے رہے بلاشبہ مبدأ فیاض نے استاذ محترم کو ایسی بے شمار خصوصیات سے نوازا تھا جن کی نظیر ان کے معاصرین میں تو مفقود ہے ہی، سابقین میں بھی کم ملتی ہے اور لاحقین کا حال تو سب پر عیاں ہے۔

شعبۂ تحریر سے روزنامہ کا اجراء:

النادی الادبی کا دوسرا بڑا شعبہ قسم التحریر تھا، اس شعبے کے تحت النادی الادی میں شامل طلبہ عربی زبان میں مضمون نگاری اور مقالہ نگاری کی مشق کرتے تھے اور اس کا طریقہ یہ ہوتا تھا کہ مضمون نگاری سے دل چسپی رکھنے والے طلبہ کے چند گروپ بنا دیئے جاتے اور ہر گروپ کو ایک دیواری رسالہ نکالنے کا پابند کیا جاتا، کچھ رسالے

الصّف الاول، الصّف الثانی اور تکمیل الادب کے طلبہ نکالتے تھے، ہر رسالے کا ایک مدیر ایک نائب مدیر اور کچھ اراکین مجلس ادارت ہوتے تھے، رسالوں کے شائع ہونے (آویزاں ہونے) کی تاریخ مقرر ہوتی، رسالہ شائع ہونے سے قبل مضامین نگار حضرات اپنے اپنے مضامین ایڈیٹر کے سپرد کر دیتے، ایڈیٹر (جو اپنے گروپ میں ممتاز ہوتا تھا) مضامین کی خود اصلاح کرتا یا اپنے سینئرز کو دکھلا دیتا، اس کے بعد سفید کاغذ پر جس کے چاروں طرف پھولوں کی رنگین بیل بنائی جاتی تھی کوئی خوش خط طالب علم مضامین کی کتابت کرتا، النادی میں کچھ طلبہ استاذ محترم کی کرم فرمائی سے بہترین کاتب بن گئے تھے اور ہر سال دو تین طالب علم اچھے کاتب ہو جاتے تھے، جن میں سے کئی آج بھی اس فن کی بہ دولت روزی روٹی سے جڑے ہوئے ہیں، یہاں یہ بھی بتلا دوں کہ استاذ محترم اردو اور عربی کے بہترین کاتب بھی تھے، بلکہ عربی ٹائپ کے حروف کو قلم سے لکھنے کے فن کے موجد تھے، جو طلبہ اپنے ذوق سے عربی کی کتابت سیکھنا چاہتے تھے استاذ محترم ان کی رہنمائی فرما دیتے تھے اور وہ لوگ چند روز کی محنت اور مشق سے بہترین کاتب بن جاتے تھے ایسے ہی کاتب طلبہ رسالے کا نام اور اس کے مضامین کے عنوانات کی کتابت کر دیا کرتے تھے، کتابت کے تمام لوازمات النادی الادبی کی طرف سے مہیا کیے جاتے تھے، کتابت کے بعد رسالہ شیشے کے ایک فریم میں سجا کر دار العلوم کے صدر گیٹ پر آویزاں کر دیا جاتا تھا، بہر حال رسالہ ہفتہ دس روز دیواروں پر معلق رہتا اور جب ناظرین کی توجہ کم ہو جاتی تو اس فریم میں دوسرا رسالہ لگا دیا جاتا، اس طرح دس بارہ رسالے ہر ماہ شائع ہوتے، عام طور پر ماہانہ رسالوں کا دستور تھا کیونکہ درسی مصروفیات کے بعد اس طرح کی ''غیر درسی'' سرگرمیوں کے لیے وقت ہی کہاں ہوتا تھا، تاہم تکمیل ادب کے طلبہ ''النادی'' کے نام سے پندرہ روزہ رسالہ نکالتے تھے، ہمارے زمانے میں ایک جدت یہ ہوئی کہ طلبہ نے استاذ محترم

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

کی رائے مشورے اور ہمت افزائی سے ''النادی'' کو پندرہ روزہ کے بجائے روزنامہ بنادیا، راقم السطور اس کا ایڈیٹر تھا، میرے ایک ساتھی جو اس وقت دارالعلوم دیوبند میں استاذ ہیں معاون ایڈیٹر تھے اور کچھ رفقا مجلس ادارت میں شامل تھے، ہم ملکی اور غیر ملکی خبریں تو روزنامہ الجمعیۃ سے اخذ کرتے تھے اور دارالعلوم کی داخلی خبروں کے لیے دفاتر کے کلرکوں اور چپراسیوں کے انٹرویو لیتے پھرتے تھے، داخلی طور پر ہماری دل چسپی کا محور اساتذہ کرام کی رخصت ہوا کرتی تھی اور ہم یہ خبر کہ آج صبح کون سے استاذ چھٹی پر ہیں نمایاں طور پر شائع کرتے تھے، رات کو دیر تک رسالہ تیار کیا جاتا تھا اور کسی ایک شخص کی یہ ذمہ داری ہوتی تھی کہ وہ فجر کی اذان اور نماز کے درمیانی وقفے میں روزنامے کا فریم صدر دروازے پر آویزاں کردے، نماز پڑھ کر لوٹنے والے طلبہ اخبار کے سامنے ہجوم لگا لیتے تھے، حالانکہ اس وقت روشنی بھی پوری طرح پھیلتی نہیں تھی اس طرح کی سرگرمیوں میں استاذ محترم کی رہنمائی اور نگرانی قدم قدم پر تھی اور ساتھ ہی ہر وقت تعریف اور توصیف کے خزانے بھی ہاتھ آتے رہتے تھے اور یہ اپنے مشفق استاذ کی ہمت افزائی ہی کا نتیجہ تھا کہ ہم لوگ راتوں کو جاگ جاگ کر رسالے نکالتے تھے، مشق کی مشق تھی، اور دل چسپی سے بھرپور ایک مشغلہ بھی تھا۔

النادی کے دوسرے شعبے:

النادی الادبی کے دوسرے شعبے بھی تھے، جن میں سے ایک مالیات کا شعبہ تھا جس کے ذریعے ''النادی الادبی'' کے ماہانہ اور ہنگامی چندے وصول کیے جاتے تھے یہ چندے بہت معمولی ہوتے تھے، زیادہ بڑے مصارف کے لیے ہم ہمیشہ استاذ محترم کے سامنے دست سوال دراز کرتے تھے، دارالعلوم سے کوئی مالی امداد نہیں ملتی تھی، ہم لوگوں کی جدوجہد سے حضرت مہتمم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی حلیمی کے باعث یہ اجازت مرحمت فرمادی تھی کہ النادی الادبی اپنے ماہانہ اور سالانہ اجتماعات میں

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

دارالعلوم کا لاؤڈ اسپیکر استعمال کرلیا کرے، ورنہ جن لوگوں کے اختیار میں یہ سیٹ تھا وہ تو مختلف حیلوں بہانوں سے اس اجازت کو منسوخ کرانے کی کوشش میں لگے رہے، اس اجازت سے ماہانہ مصارف میں کچھ کمی آ گئی تھی، النادی الادبی میں ایک شعبہ امداد باہمی کا تھا، اس شعبے کے ذریعہ نادار طلبہ کی مالی مدد کی جاتی تھی، دارالعلوم میں غیر امداد یافتہ طلبہ کی معقول تعداد زیر تعلیم رہتی ہے، ان میں سے کچھ طلبہ جو کھاتے پیتے گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں اپنے کھانے کا انتظام خود کر لیتے ہیں، لیکن جو طلبہ معاشی اعتبار سے نہایت غریب ہوتے ہیں اور وہ کسی وجہ سے دارالعلوم کی امداد (طعام) سے محروم رہ جاتے ہیں وہ خشک روٹی کا بھی انتظام نہیں کر پاتے، اس وقت دارالعلوم کے مطبخ سے خشک روٹی قیمتاً ملتی تھی، استاذ محترم کے لیے غیر امدادی طلبہ کا معاملہ دلی اذیت کا باعث بنا رہتا تھا، ظاہر ہے النادی الادبی کوئی خوش حال انجمن نہیں تھی کہ اپنے مصارف کی متکفل بھی ہوتی اور ضرورت مند طلبہ کو روٹی بھی مہیا کرتی، متعدد طلبہ استاذ محترم سے ماہانہ وظائف کی شکل میں کچھ رقم حاصل کرتے تھے لیکن ضرورت مند طلبہ کی تعداد اچھی خاصی تھی اس لیے ایک مرتبہ یہ حل نکالا گیا کہ جو طلبہ اپنی دو روٹیوں میں سے کچھ بچا دیتے ہیں وہ ضائع نہ کیا کریں بلکہ النادی کے آفس میں جمع کرا دیا کریں، وہاں سے یہ روٹیاں ضرورت مند طلبہ میں تقسیم کردی جائیں گی یا وہ لوگ وہاں آ کر کھالیا کریں گے، اس مقصد کے لیے ہم لوگ استاذ محترم کے ساتھ دار جدید کے مختلف کمروں کا گشت کرتے اور جو روٹی بچی ہوئی حاصل ہوتی اسے النادی کے دفتر میں لا کر رکھ دیتے، یہ ایسا اقدام تھا شاید ہی کسی کے ذہن میں اس کا تصور آیا ہو، استاذ محترم کو اللہ نے فکر و عمل کی بے پناہ توانائی عطا کی تھی، انہوں نے طلبہ کی بھلائی اور خیر خواہی کے لیے سوتے جاگتے بے شمار خواب دیکھے، کچھ کی تعبیر ملی اور کچھ ٹوٹ گئے۔

النادی الادبی کا ایک اور اہم شعبہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے تھا

اس شعبے کے مقاصد میں یہ بات شامل تھی کہ طلبہ میں دینی اور اجتماعی بیداری پیدا کی جائے، طلبہ کو نماز کے اوقات میں نماز کے لیے تاکید کرنا، خاص طور پر ظہر اور فجر کی نمازوں میں کمرے کمرے گھوم کر طلبہ کو بیدار کرنا، یہ ایک اہم ذمہ داری تھی، فجر کے وقت استاذ محترم خود بھی طلبہ کو بیدار کیا کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے استاذ محترم کو علمی فضل و کمال کے ساتھ ساتھ ذاتی وجاہت اور شخصی ہیبت بھی عطا فرمائی تھی اور یہ چیز بہت کم لوگوں کو میسر آتی ہے، عام طور پر طلبہ کم ہی کسی سے اس حد تک متاثر ہوتے ہیں جس حد تک وہ استاذِ محترم سے تھے، ان کی ایک آواز پر یا قدموں کی آہٹ پر طلبہ کا اپنے بستروں سے اٹھ اٹھ کر مسجد کی طرف لپکنے کے مناظر آج بھی نگاہوں کے سامنے روشن ہیں۔

جی چاہتا ہے کہ یہ سلسلۂ گفتگو دراز تر کروں، اس میں ہے ہی کچھ ایسی لذت ''النادی الادبی'' ایک انجمن ہی نہیں تھی، بلکہ اپنے آپ میں ایک مکمل ادارہ تھی ایک تربیت گاہ تھی، جس نے دارالعلوم کے طلبہ میں عربی زبان کا شوق اور اسے ایک زندہ اور ترقی یافتہ زبان کی حیثیت سے سیکھنے کا جذبہ پیدا کیا، ان میں اجتماعیت کا شعور اور اس کی طاقت کا احساس بخشا، ان کے دل و دماغ میں یہ حقیقت راسخ کی کہ وہ بیکار کی چیز نہیں ہیں، بلکہ امت مسلمہ کے لیے ان کی حیثیت شہ رگ کی سی ہے، صحیح بات تو یہ ہے کہ النادی الادبی ایک بے جان جسم تھی، اس کی روح استاذ محترم تھے، جنہوں نے اپنے فکر و عمل کی تمام جوانی طلبہ دارالعلوم کی فکری، علمی اور عملی تربیت کے لیے وقف کردی تھی، ایک دور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند کا تھا جنہیں ہر وقت یہ فکر دامن گیر رہتی تھی کہ وہ کس طرح قطروں کو گہر بنائیں اور کس شخص سے کیا کام لیں کہ وہ آسمانِ علم پر آفتاب بن کر چمکے، ایک شخصیت حضرت علامہ کشمیریؒ کی تھی جن کی تربیت نے جادو جگایا اور ایسے شاگرد تیار کیے جو دارالعلوم کی آبرو ہیں ایک شخصیت حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی تھی جنہوں نے ایک چھوٹے سے قصبے کی

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

مسجد کو رجال علم وعمل اور اصحاب فضل وکمال ڈھالنے کا کارخانہ بنادیا ان چند عظیم شخصیتوں کے بعد دارالعلوم کی تاریخ میں اگر کسی نے رجال سازی کے میدان میں کوئی نمایاں کارنامہ انجام دیا ہے تو وہ استاذ محترم کی شخصیت ہے، انھوں نے اپنے طلبہ کو مادی نفع ونقصان سے بے نیاز ہوکر اپنے مفوضہ فرائض سے الگ ہٹ کر کچھ اور بہت کچھ بنانے کی کوشش کی، پھر ان کی جد وجہد کے نتائج بار آور ہوئے، آج دارالعلوم کے بے شمار نوجوان فضلا جہاں بھی ہیں، جس جگہ بھی ہیں اور جو کچھ علم دین اور عربی زبان وادب کی خدمت انجام دے رہے ہیں، وہ سب استاذ محترم کی تیس سالہ سعی پیہم کو اپنے حسن عمل سے مجسم شکل دے رہے ہیں اور ان کے خوابوں کو تعبیر کا لبادہ پہنا رہے ہیں۔

النادی الادبی کا ذکر کچھ طویل ہوگیا، دراصل استاذ محترم پر کوئی مضمون مکمل ہو ہی نہیں سکتا اگر اس میں النادی الادبی کا ذکر جمیل نہ ہو، یہ ان کی ایک ایسی تخلیق ہے جس کو انھوں نے اپنے خون جگر سے پروان چڑھایا، اپنوں اور غیروں کی سرد وگرم نگاہوں سے اس کے نرم ونازک وجود کو بچایا، مخالفتوں کی تیز وتند آندھیوں سے اس پودے کے گلاب بکھرنے نہیں دیئے، اگر کوئی مؤرخ دارالعلوم کی تاریخ بالکل غیر جانب دار ہوکر لکھے گا تو مجھے یقین ہے کہ وہ النادی الادبی کے حوالے سے استاذ محترم کی طویل جدوجہد کو اور بے مثال خدمات کو دارالعلوم کی تاریخ کا سنہرا ضرور عنوان قرار دے گا۔

بے پناہ شفقتیں:

تکمیل ادب کے بعد عام طور پر طلبہ اپنی تعلیم کا سلسلہ ختم کر کے رخت سفر باندھ لیتے ہیں، دو سال پہلے دارالعلوم نے تکمیل ادب سے فارغ طلبہ کے لیے استاذ محترم کی تجویز پر ایک نیا شعبہ قسم التخصص فی الادب العربی کے نام سے قائم کیا تھا میری بڑی خواہش تھی کہ اس شعبے میں داخلہ لوں اور اس طرح مادر علمی کے سایے میں ایک سال اور گذاروں، لیکن میرے گھریلو حالات معاشی اعتبار سے مستحکم نہیں تھے

اس لیے والد محترم سے مزید ایک سال کے لیے اجازت مانگنے کی ہمت نہیں تھی استاذ محترم کے علم میں میری یہ دشواری تھی، اس لیے خود ہی اس کا حل تلاش کرلیا اور جو کام میں خواہش کے باوجود نہیں کرا پا رہا تھا وہ استاذ محترم کی شفقت سے ہوگیا میرے والد اور استاذ محترم دونوں ہم سبق تھے، اس حوالے سے دوستی بھی تھی، اس لیے انہوں نے میرے والد سے مل کر انہیں اس بات پر آمادہ کرلیا کہ وہ مجھے مزید ایک سال تعلیم میں مشغول رہنے دیں، مجھے یہ لکھنے میں کوئی تکلف نہیں کہ استاذ محترم کو اپنے شاگردوں کی بہتری کا جس قدر خیال تھا شاید ہی کسی دوسرے استاذ کو ہو۔

میری زندگی کے یہ دو سال سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں، میں ان دو سالوں سے پہلے کی زندگی میں جھانک کر دیکھتا ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے کوئی اجنبی مسافر لق ودق صحرا میں ٹھوکریں کھاتا پھر رہا ہو اور منزل کی جستجو میں سرگرداں ہو، یہ دو سال ایسے لگتے ہیں جیسے کسی مسافر کو اچانک اس کی منزل مل گئی ہو، استاذ محترم کو اس تعلیمی سفر کے دوران جس قدر تعلق مجھ سے تھا شاید ہی کسی سے ہو، لیکن شاید میرا خیال غلط ہے میرے تمام احباب اور رفقائے درس استاذ محترم کی بے پایاں توجہات اور بے پناہ شفقتوں کا ذکر اسی اعتماد سے کرتے ہیں جس طرح میں کر رہا ہوں، اس لیے ایسا لگتا ہے کہ استاذ محترم کو اپنے ہر شاگرد سے کچھ ایسا تعلق تھا کہ وہ اسے اپنے لیے خاص سمجھ بیٹھتا تھا۔

تکمیل ادب کے سال حالانکہ ہم لوگ مکمل چھ گھنٹے استاذ محترم کے اسباق میں گذارتے تھے، لیکن اس زمانے میں عربی زبان سیکھنے کا شوق جنون کی حد تک تھا، دل چاہتا تھا کہ کچھ اور وقت مل جائے، اسی جذبے کے تحت میں نے استاذ محترم سے درخواست کی کہ وہ مجھے عربی کا کوئی اخبار پڑھا دیا کریں، حسب توقع حضرت نے مصروفیات کا عذر کیا، مگر میں نے امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور جب بھی موقع

ملا یہ درخواست ضرور دہرادی، مجبوراً مجھے کچھ وقت عنایت کیا گیا، مگر صرف ان چند لمحوں کا وقت جب استاذ محترم درس گاہ سے کمرے تشریف لے جاتے ہیں اور کچھ وقفے کے بعد دوبارہ کمرے سے درس گاہ تشریف لاتے ہیں، جو لوگ کمرہ اور درس گاہ کا فاصلہ جانتے ہیں وہ یہ بات سمجھ رہے ہوں گے کہ اس مختصر وقت میں عربی اخبار کی ایک سطر بھی مشکل ہی سے پڑھی جاسکتی ہے، مگر میں مایوس نہیں ہوا، استاذ محترم نے میرے ذوق وشوق کو دیکھ کر وقت میں کچھ توسیع فرمائی، مگر وقت ایسا دیا جو ایک طالب علم کے لیے خاص طور پر جو دیر تک جاگتا ہو لذتِ خواب کا وقت ہوتا ہے، یعنی فجر سے پہلے، مگر میں اس امتحان میں کامیاب اترا، بالآخر مجھے اطمینان کے چند لمحے نصیب ہوئے اور میں نے ایک اخبار کے کئی صفحے سبقاً سبقاً پڑھے۔

مجھے اردو میں مضامین لکھنے کا شوق تھا اور دورِ طالب علمی میں ہی میرے سینکڑوں مضامین ملک بھر کے اخبار ورسائل میں شائع ہوچکے تھے، استاذ محترم میرے اس شوق سے واقف تھے، اس لیے وہ مجھے اکثر وبیشتر عربی میں مضامین لکھنے کی تلقین فرمایا کرتے تھے، چنانچہ میں نے حکم کی تعمیل میں متعدد عربی مضامین لکھے، میرا پہلا مضمون اپنی ادارت میں شائع ہونے والے سہ ماہی رسالہ ''دعوۃ الحق'' میں کافی کچھ ترمیم واصلاح کے بعد شائع کیا، اس زمانے میں جمعیۃ علما ہند نے اپنا ترجمان الکفاح کے نام سے شائع کرنا شروع کیا، اس اخبار میں میرے متعدد مضامین، خبروں کے تراجم اور دوسری قلمی کاوشیں شائع ہوئیں، لیکن جمعیۃ سے میرے فکری اختلافات کے باعث کبھی میرا نام اخبار میں نہ آسکا لیکن میں نے محض مشق کے لیے اور تکمیل شوق کی خاطر لکھنے کا مشغلہ جاری رکھا اور استاذ محترم سے دادِ تحسین وصول کرتا رہا۔

استاذ محترم کے ساتھ ناانصافیاں:

دار العلوم سے رخصت ہوگیا، لیکن استاذ محترم سے تعلق میں کوئی فرق نہیں آیا

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

میں ان دنوں حیدر آباد میں بہ سلسلۂ تدریس مقیم تھا جب دارالعلوم نے اپنا صد سالہ جشن منانے کا فیصلہ کیا اور اس کی تیاریوں کا آغاز کیا اس سلسلے میں دارالعلوم نے اپنے عربی ترجمان دعوۃ الحق کو الداعی کے نام سے نکالنے کا فیصلہ کیا اور اسے سہ ماہی سے پندرہ روزہ میں تبدیل کر دیا، استاذ محترم اس کے مدیر اعلیٰ قرار پائے اور ایک فاضل دارالعلوم نائب مدیر قرار پائے، لیکن اس زمانے میں دارالعلوم میں گروپ بندی کی سیاست زوروں پر تھی، آہستہ آہستہ استاذ محترم کے اختیارات سلب کر لیے گئے، اور نائب مدیر ہی سب کچھ قرار پائے، مجھے یہ لکھنے میں کوئی جھجک نہیں کہ دارالعلوم کی تدریسی زندگی میں استاذ محترم کے ساتھ زبردست ناانصافیاں کی گئیں، وہ ایک ایسے انسان تھے جس کی رائے کی صلابت اور فکر و عمل کی قوت پر دوست دشمن سب یقین رکھتے تھے لیکن جب دارالعلوم میں انتظامی اور علمی عہدوں پر تقرری کا سوال اٹھتا تھا تو چن چن کر ایسے ایسے لوگ رکھے جاتے تھے جو کچھ ہوں یا نہ ہوں مگر چاپلوس ضرور ہوں، یہ ناانصافی کا دور تھا، حق تلفی کا زمانہ تھا، کچھ مفاد پرست لوگ حضرت حکیم الاسلامؒ کی سادہ لوحی اور ضعف و پیرانہ سالی کی بنا پر اس طرح کی سازشیں رچ رہے تھے جن کی وجہ سے قابل لوگ حاشیے میں جا پڑے تھے اور بے صلاحیت لوگ نمایاں ہو رہے تھے، غالباً یہی حق تلفیاں اور ناانصافیاں تھیں جن کے خلاف انہیں آواز اٹھانی پڑی، اگرچہ اجلاس صد سالہ سے کچھ قبل استاذ محترم کو ارباب حل و عقد نے غیر معمولی طور پر اور توقع کے برخلاف اہمیت دی، اجلاس صد سالہ کے نظم و نسق کے لیے تشکیل دی جانے والی کئی کمیٹیوں کا کنوینر یا ممبر نامزد کیا گیا، بہت سے کام متعلق کیے گئے خاص طور پر تعمیراتی کاموں کی ذمہ داری ان کے ناتواں کاندھوں پر ڈال دی گئی یا خود انہوں نے اس ذمہ داری کے بار گراں سے خود کو بوجھل کر لیا، بہر حال ان آنکھوں نے دیکھا کہ وہ دن بھر ادھر سے ادھر دوڑ رہے ہیں، کہیں کمرہ بن رہا ہے، کہیں ٹوٹ رہا

ہے، کسی عمارت میں اضافے ہورہے ہیں کسی عمارت کو گرایا جارہا ہے، شام ہوتی ہے راج مزدوروں اور لوہے سیمنٹ والوں کا جمِ غفیر کمرے کے اندر اور باہر موجود ہے حسابات کیے جارہے ہیں اور ادائیگیاں ہورہی ہیں، رات ہوتی ہے، تمام بہی خواہان دارالعلوم گداز بستروں پر محوِ استراحت ہیں اور یہ مجاہد ٹھیکیداروں اور انجینئروں سے آج کی پیش رفت اور کل کے لائحہ عمل پر مصروفِ گفتگو ہے، تعمیر کا کام بھی اس شان سے کیا کہ اگر رقم کم رہ گئی تو خود ہی سفر کی زحمتیں برداشت کرکے سرمایہ بھی جمع کیا، شب وروز کی اس جاں گسل محنت نے وہی کام کیا جو اسے کرنا چاہئے تھا، صحت جواب دے گئی یہاں تک کہ جب لوگوں کا جمِ غفیر دیوبند میں پروانوں کی طرح شمعِ علم پر نثار ہورہا تھا اور ارباب اقتدار دونوں ہاتھوں سے تعریف و تحسین کی دولت سمیٹ رہے تھے یہ نحیف ونزار جسم اجلاس کی رونقوں سے دور بسترِ مرض پر دراز تھا، دارالعلوم کے لیے آفاق کی وسعتوں کے در کھل گئے لیکن تمام صلہ، تمام ستائش، تمام برکتیں اور سعادتیں چند مخصوص لوگوں نے سمیٹیں، جن لوگوں نے تن من کی بازی لگائی وہ اس طرح نظرانداز کردیئے گئے جیسے وہ کوئی وجود ہی نہ رکھتے ہوں۔

ناانصافی بے ضمیر لوگوں کو بے حس بناتی ہے، لیکن ضمیر رکھنے والے خوددار لوگ انصاف کے لیے جدوجہد کرتے ہیں اور بالآخر انصاف پالیتے ہیں، اجلاس صدسالہ کے بعد دارالعلوم میں جو انقلاب آیا وہ اسی شخصیت کی جدوجہد کا ثمرہ تھا، یہاں اس سے بحث نہیں کہ انقلاب کے لیے یہ اقدام غلط تھا یا صحیح، نہ ہم اس بحث کے دروازے کھولنا چاہتے ہیں کہ انقلاب کے بعد حالات اچھے ہیں یا پہلے کے حالات اچھے تھے یہاں صرف یہ گفتگو ہے کہ کیا اقتدار کی تبدیلی کے لیے استاذ محترم کی جدوجہد نظرانداز کی جاسکتی ہے، جب خیال آتا ہے دل مسوس کررہ جاتا ہوں کہ استاذ محترم کس قدر سادہ لوح تھے کہ انہوں نے اپنی صحت خراب کی، اپنا سکون برباد کیا، اپنے قیمتی شب وروز

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

ضائع کیے، استاذ محترم تو بڑے دور رس، دور بیں، دور اندیش تھے، پھر کیا ہوا کہ وہ ایک ایسے مقصد کے لیے اپنی جان کی بازی لگا بیٹھے جس کے نتیجے میں انہیں صحت کی خرابی دل کی بے چینی اور گوشۂ تنہائی ملا، جو لوگ کام نکالنے کے لیے ان کے آگے پیچھے پھرتے تھے کام نکلنے کے بعد اس طرح رخ بدل کر کھڑے ہو گئے جیسے ان سے کوئی شناسائی نہ ہو، کوئی واسطہ نہ ہو، استاذ محترم کی زندگی کے بے شمار تابناک باب ہیں لیکن یہ باب ایک سوالیہ نشان ہے جب بھی کوئی شخص اس پر قلم اٹھائے گا اس کے سامنے متعدد سوال اٹھ کھڑے ہوں گے، کسی کی وفاداری کا سوال کسی کی بے وفائی کا سوال کسی کی جاں بازی کا سوال، کسی کی بے رخی کا سوال۔

اس وقت میرے ذہن کی اسکرین پر بے شمار واقعات روشن ہیں، لیکن یہ ایک مضمون ہے کوئی کتاب نہیں، اس میں اتنی گنجائش کہاں کہ جو کچھ ذہن میں ہے وہ سب کاغذ پر منتقل کر دیا جائے پھر استاذ محترم کی شخصیت کے بے شمار پہلو ہیں، ہر پہلو ایک مکمل کتاب بن سکتا ہے اگر کوئی قلم اٹھائے، یقیناً لوگ لکھیں گے، استاذ محترم کے شاگردوں میں ایک سے بڑھ کر ایک صاحب قلم ہیں، ان شاء اللہ کوئی گوشۂ زندگی تشنہ نہیں رہے گا، ان کی خدمات کا دائرہ بے حد وسیع ہے، انہوں نے اپنے اسباق سے اپنی تقریروں سے، اپنی تحریروں سے، اپنی گفتگو سے، اپنے فکر و خیال سے، اپنی کتابوں سے جو چراغ روشن کیے تھے وہ ابھی بجھے نہیں ہیں اور جب تک یہ تحریریں زندہ رہیں گی اور جب تک ان کے شاگردوں کا قافلہ رواں دواں رہے گا ان کے جلائے ہوئے چراغ اسی طرح اجالے بکھیرتے رہیں گے۔

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

حضرت مولانا وحید الزماں کیرانویؒ

(یہ مضمون وحید العصر حضرت مولانا وحید الزماں کیرانویؒ کی مایہ ناز تالیف ''القاموس الوحید'' کی تقریب رونمائی کے موقعہ پر ۲۸/اپریل ۲۰۰۱ء کی شب حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن ہال دیوبند میں منعقد اہل علم کے ایک بڑے اجتماع میں پڑھ کر سنایا گیا۔)

جب کوئی عظیم شخصیت اس دنیا سے رخصت ہوتی ہے اور اپنے چاہنے والوں کو داغِ مفارقت دیتی ہے تو عام طور پر لوگ ایک دوسرے سے کچھ اس طرح تعزیت کرتے ہیں کہ مرحوم اپنے پیچھے ایک ایسا خلا چھوڑ گئے ہیں جو کبھی پُر نہیں ہوسکتا، یا مرحوم کی شخصیت اس قدر عظیم تھی کہ مستقبل قریب میں ان کا ثانی پیدا ہونا بہ ظاہر مشکل نظر آتا ہے، لیکن یہ ہماری خوش فہمی ہوتی ہے، بہت جلد ایسا ہوتا ہے کہ مرحوم کا چھوڑا ہوا وہ خلا پر ہوجاتا ہے، عظیم شخصیت کا جانشین پیدا ہوجاتا ہے اور لوگ بھول بھی جاتے ہیں کہ انہوں نے کسی کے متعلق کیا رائے ظاہر کی تھی، مگر حقیقت یہ ہے کہ وحید العصر حضرت مولانا وحید الزماں کیرانویؒ نے اپنی وفات کے بعد جو خلا چھوڑا ہے ان کے اٹھ جانے سے علم وادب کی دنیا میں اور تعلیم وتربیت کے میدان میں جو کمی پیدا ہوئی ہے وہ خلا ابھی تک پُر نہیں ہوسکا، اور وہ کمی ہنوز باقی ہے۔

وحید الزماں کیرانویؒ صرف ایک شخصیت کا نام ہی نہیں تھا بلکہ وہ ایک تاریخ

کا عنوان بھی تھا، ایک ایسی تاریخ کا عنوان جو اسی کے نام سے شروع ہوئی اور اسی کے نام پر ختم بھی ہوگئی، دارالعلوم دیوبند کے تعلیمی ماحول میں مولانا وحید الزماں کیرانویؒ کی آمد ایسی تھی جیسے لق ودق صحرا میں اچانک کوئی شجر سایہ دار نمودار ہو جائے اور لوگ جھلساتی دھوپ سے تپتے جسموں کو ٹھنڈک پہنچانے کے لئے اس کی گھنی چھاؤں میں پناہ لے لیں، ایسا مشفق، مہربان، مخلص اور جفاکش استاذ کسی ادارے کو مشکل ہی سے ملا کرتا ہے، یہ دارالعلوم کی خوش قسمتی تھی کہ اس کے چشمۂ فیاض سے ایک ایسے طالب علم نے علم کی پیاس بجھائی جو بعد میں اس کی پیشانی کا نور ثابت ہوا، اس کے اونچے سر پر سجے ہوئے تاج کا کوہِ نور بنا، جس نے ماحول کو اپنے علم کے اُجالوں سے روشن کیا جس نے اپنی تربیت کی سان پر ہزاروں سنگ ریزوں کو تراشا اور انہیں لعل شب تاب بنایا۔

مولانا وحید الزماں کیرانویؒ ۱۹۵۲ء میں دارالعلوم سے فارغ ہوئے اور ۱۹۶۳ء میں عربی زبان وادب کے استاذ کی حیثیت سے ان کا تقرر عمل میں آیا فراغت سے تدریس کے درمیانی مرحلے میں انہیں اپنے خاندان کی معاشی کفالت کے لئے جو کڑی محنت کرنی پڑی اس کی بڑی دل گداز داستان ہے، اگرچہ اس محنت نے ان کی شخصیت میں نکھار پیدا کیا، ان کو عظمت عطا کی، ان کو حساس بنایا، انہیں سوز دروں بخشا، ان کے دل میں دوسروں کے لئے ہمدردی، اور خیر خواہی کے جذبات پیدا کئے وہ اپنی بے مثال صلاحیتوں کی بنا پر اس کے مستحق تھے کہ انہیں فراغت کے بعد بلا تاخیر اس ادارے کی خدمت پر مامور کیا جاتا، مگر جیسا کہ ہمارے اداروں کا دستور ہے کہ وہ جوہر قابل تلاش نہیں کرتے بلکہ انہیں وفاداروں کی جستجو رہتی ہے، پھر وفاداری اگر مسلک سے ہو، نظریات سے ہو، ذمہ داریوں سے ہو تو بھی کوئی حرج نہیں بلکہ مستحسن ہے یہاں تو بالا دست شخصیتوں کے وفادار تلاش کئے جاتے ہیں بلکہ چن چن کر ایسے لوگ رکھے جاتے ہیں جو کچھ ہوں یا نہ ہوں مگر وفادار ضرور ہوں، ذمہ داریوں

میں کوتاہی گوارا کی جا سکتی ہے لیکن وفاداری میں کمی برداشت نہیں کی جا سکتی، اس لئے ان کی تقرری میں مشکلات پیش آتی رہیں اور تاخیر ہوتی چلی گئی۔

مولانا وحید الزماں کیرانویؒ دورِ طالب علمی ہی میں اپنی بے پناہ، خداداد تعلیمی صلاحیتوں کی بنا پر اور عربی زبان پر دسترس کی انفرادی خصوصیت کی وجہ سے اندرونِ دارالعلوم ایک ممتاز حیثیت حاصل کر چکے تھے، مولانا نے اپنی ذاتی محنت لگن، دل چسپی اور شب و روز کی مسلسل جدوجہد کے بعد عربی زبان پر مکمل عبور حاصل کیا وہ جب دارالعلوم میں اعلا تعلیم کے لئے داخل ہوئے تو انہیں عربی زبان اچھی طرح آتی تھی، وہ بلا تکلف بول بھی لیتے تھے، اور لکھ بھی سکتے تھے، چنانچہ پہلی بار طلبہ کے کسی اجتماع میں انہوں نے عربی زبان میں تقریر کی تو یہ انداز نامانوس ہونے کے باوجود دل چسپ اور ولولہ انگیز تھا، عموماً ہمارے مدارس میں زبان یک سر نظر انداز کی جاتی رہی ہے، حالانکہ زبان وسیلۂ اظہار ہے چاہے منہ سے بولی جائے یا قلم سے لکھی جائے، ہم سالہا سال تک عربی زبان میں لکھی ہوئی کتابیں پڑھتے ہیں، نحو و صرف کے قواعد یاد کرتے ہیں، فقہی موشگافیوں میں ید طولیٰ حاصل کرتے ہیں، منطق اور فلسفے کے دقیق مضامین قرآن کریم کی طرح حفظ کر لیتے ہیں لیکن اگر ہم سے کوئی شخص یہ کہے کہ جو کچھ تم نے سالہا سال تک پڑھا ہے ذرا اس کی تفصیل عربی میں کر دو، زبانی نہ بتلا سکو تو لکھ کر ہی دیدو تو شاید ہم میں سے بہت سے لوگ ایسا نہ کر سکیں۔

میں مولانا وحید الزماں کیرانویؒ کی طالب علمی کے بارے میں عرض کر رہا تھا وہ دارالعلوم میں ایک ایسے طالب علم کی حیثیت سے داخل ہوئے جس کا ذہن روایتی طلبہ کے ذہن سے مختلف تھا، وہ ایک انقلابی ذہن کے مالک تھے، فرسودہ روایات سے بغاوت ان کی سرشت میں داخل تھی، چنانچہ جب انہوں نے صاف اور شستہ عربی میں اپنے خیالات کی ترجمانی کی تو طلبہ نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور بہت جلد اس

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

طالب علم کے ارد گرد عربی زبان وادب کے پروانوں کا ہجوم ہوگیا، مولانا فرمایا کرتے تھے کہ جن طلبہ نے طالب علمی کے زمانے میں ان سے عربی زبان کی تعلیم حاصل کی ہے ان کی تعداد اسّی سے متجاوز ہے، آج کے دور میں شاید ہی کوئی مثال ایسی ہو کہ ایک طالب علم پڑھ بھی رہا ہے اور وہ اپنے جیسے دوسرے طلبہ پر محنت بھی کر رہا ہے انہیں بھی اپنے سانچے میں ڈھالنا چاہتا ہے، جب بھی اسے فرصت کے چند لمحات میسر آتے ہیں وہ کھیلنے کودنے میں مصروف نہیں ہوتا، سیر و تفریح میں وقت ضائع نہیں کرتا بلکہ چند طلبہ کو لیکر بیٹھ جاتا ہے تاکہ انہیں عربی پڑھا سکے، انہیں اپنا جیسا بنا سکے۔

مولانا وحید الزماں کیرانویؒ نے زمانۂ طالب علمی میں اپنی الگ پہچان بنالی تھی، علیحدہ شناخت قائم کرلی تھی، وہ اساتذہ اور طلبہ کے درمیان عرب مہمانوں کے مترجم کی حیثیت سے متعارف ہوگئے تھے، انہیں ہر ایسے موقعے پر یاد کیا جاتا تھا جب عالم عرب سے کوئی مہمان دارالعلوم میں وارد ہوتا، یا عالم عرب کے کسی ادارے کو، کسی شخصیت کو خط لکھنے کی ضرورت پیش آتی، یا وہاں سے آئے ہوئے کسی خط کا جواب ناگزیر ہوتا، یہ ایک اعزاز تھا جو اللہ تعالیٰ نے مولانا کو ان کی محنت کے صلے میں عطا کیا تھا، اور کسی طالب علم کے لئے اس طرح کا کوئی اعزاز ہی سرمایۂ افتخار ہوتا ہے۔

مولانا نے تعلیم کے دوران عربی زبان میں دیواری پرچے بھی جاری کئے جنھوں نے اس خوب صورت زبان کے تئیں طلبہ کے دلوں میں آتش شوق کو ہوا دینے میں اہم رول ادا کیا، وہ ان تعلیمی اور غیر روایتی خدمات کے لئے طلبہ میں اس قدر مقبول تھے اور ان کے لئے دلوں میں اس قدر احترام تھا کہ جب مدنی دارالمطالعہ کے لئے جو اس وقت طلبۂ دارالعلوم کی سب سے بڑی انجمن تھی انتخاب کا عمل شروع ہوا تو طلبہ نے انہیں منصب صدارت کے لئے منتخب کیا۔

دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد گیارہ سال کا طویل عرصہ انہوں نے منزل

کی جستجو میں گزارا، اس دوران انہوں نے حوصلوں کے ساتھ سفر جاری رکھا، مایوس ہوکر بیٹھنا گوارہ نہ کیا، کچھ عرصے تک وہ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کے پرنسپل سکریٹری کی حیثیت سے دہلی میں مقیم رہے اوران کے ساتھ بیرونی اسفار بھی کیئے ان کی وفات کے بعد اگرچہ ڈاکٹر سید محمود کے ذریعہ مولانا کوکسی عرب ملک کے سفارت خانے میں ملازمت مل گئی تھی، مگر انہوں نے اس نفع بخش ملازمت کے بجائے دیوبند کے علمی ماحول میں رہنے کوترجیح دی، چنانچہ وہ ۱۹۵۹ء میں دیوبند چلے آئے اور یہاں دارالفکر کی بنیاد ڈالی، جس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ دارالعلوم دیوبند کے طلبہ کو ان کے فارغ اوقات میں عربی اورانگریزی زبانیں سکھلائی جائیں، اس ادارے سے کافی تعداد میں طلبہنے استفادہ کیا۔

مولانا نے دارالفکر کو علمی، ادبی، اور تصنیفی سرگرمیوں کا مرکز بنانے میں دن رات ایک کردیا۔ جامع مسجد دیوبند کے مغرب میں واقع ایک مکان میں دارالفکر قائم تھا، جو صبح سے رات تک عربی زبان کے زمزموں سے گونجتا رہتا تھا، اس زمانے میں مولانا نے انتھک محنت کی، ان کے دوست احباب اور رفقا سب اس تھکا دینے والی جدوجہد کو رشک سے دیکھا کرتے تھے، دارالفکر کے قیام کے بعد مولانا نے ماہنامہ ''القاسم'' بھی جاری کیا، اس زمانے میں دیوبند علمی اور ادبی سرگرمیوں کا مرکز تھا، اور یہاں مولانا عامر عثمانی جیسی شخصیت موجود تھی جن کے رسالے تجلی کی ہر طرف دھوم تھی، اس ماحول میں القاسم جیسا سنجیدہ اور باوقار رسالہ جاری کرنا اور اسے مقبول بنادینا یہ صرف مولانا کی ہنرمندی اور جادوئی شخصیت کا کمال تھا۔

اسی زمانے میں انہوں نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''القاموس الجدید'' کی تالیف، ترتیب اور تدوین بھی کی اور اسے اس طرح منظر عام پر لائے کہ خود ہی کتاب لکھی خود ہی اس کی کتابت کی، خود ہی تصحیح کا کام انجام دیا، اور خود ہی دہلی سے چھپوا کر لائے

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

آج ''القاموس الجدید'' بہ شمول ''القاموس الاصطلاحی'' چار جلدوں میں مکمل ہے، اور اب یہ کتاب عربی زبان وادب کے طلبہ کی ایسی ضرورت بن گئی ہے جس کے بغیر وہ ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکتے، عربی میں کوئی مضمون لکھنا ہے اُردو سے عربی میں جملے بنانے ہیں، کسی عربی اخبار کا مطالعہ کرنا ہے، عربی زبان میں لکھی ہوئی کوئی کتاب پڑھنی ہے، عالم عرب کی کسی شخصیت سے شرفِ تکلم حاصل کرنا ہے، ایسے تمام مواقع پر اگر آپ کسی چیز کے محتاج ہیں تو وہ ہے ''القاموس الجدید'' اس شاہ کار کتاب کی مقبولیت کا عالم یہ ہے کہ آج دار العلوم دیوبند اور اس سے متعلق تعلیمی اداروں کے طلبہ ہی اس سے مستفید نہیں ہورہے ہیں بلکہ دار العلوم ندوۃ العلما کا ہر طالب علم اسے حرزِ جاں بنائے ہوئے ہے، غیر مقلدین اور بریلوی مکتب فکر کی درس گاہوں میں بھی اگر کسی کتاب کو آزادی کے ساتھ پروانۂ راہ داری حاصل ہے تو وہ یہی کتاب ہے، بہت کم کتابیں اپنوں اور غیروں میں اس طرح مقبولیت حاصل کرتی ہیں، یقیناً یہ مصنف کے اخلاص کی برکت ہے۔

القاموس الجدید کے علاوہ القرأۃ الواضحہ کے تینوں اجزاء بھی آج ہندوستان پاکستان اور بنگلہ دیش کے ہزاروں مدارس میں پڑھائے جارہے ہیں، اس کتاب کا اسلوب نگارش منفرد اور جداگانہ ہے، اسباق اس طرح ترتیب دیئے گئے ہیں کہ زبان کی مشق بھی ہوجاتی ہے اور نحو وصرف کے قواعد بھی معلوم ہوجاتے ہیں، جن لوگوں نے یہ کتاب خود مصنف سے سبقاً سبقاً پڑھی ہے وہ بتلا سکتے ہیں کہ مولانا نے کتاب کیا لکھی ہے دریا کو کوزے میں بند کردیا ہے۔

دار العلوم دیوبند میں بہ حیثیت استاذ مولانا کی آمد ایک ایسا واقعہ ہے جس نے دار العلوم کے اندر تعلیمی اور تربیتی محاذ پر زبردست انقلاب برپا کیا ہے۔ عربی زبان کے حوالے سے ایک کمی یہاں ہمیشہ محسوس کی جاتی رہی ہے، علوم وفنون میں ید طولیٰ

رکھنے والے باکمال اساتذہ کی یہاں کمی نہ تھی، ہر ذرہ یہاں آفتاب تھا اور ایسے طلبہ بھی بڑی تعداد میں ہمہ وقت موجود رہتے تھے جو اپنے قابل اساتذہ سے ان علوم وفنون میں بھر پور اکتساب فیض کرتے تھے، مگر اس اعتراف میں کوئی جھجک نہ ہونی چاہئے کہ وہ لوگ تمام تر علم وفضل کے باوجود، سالہا سال عربی زبان میں لکھی ہوئی کتابیں پڑھنے پڑھانے کے باوجود نحو وصرف کے قواعد اور فصاحت وبلاغت کے اصول گھول کر پی جانے کے باوجود کسی عرب عالم کی طرح بلا تکلف رواں دواں عربی بولنے پر قادر نہیں تھے اور نہ انہیں عصری اسلوب میں عربی زبان لکھنے کا ملکہ تھا، مولانا دارالعلوم میں کیا تشریف لائے درودیوار سے عربی بولنے کی صدائیں آنے لگیں، طلبہ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے عربی میں گفتگو کرنے لگے، عربی زبان میں دیواری پرچے شائع ہونے لگے، ایسے اجتماعات منعقد ہونے لگے جن میں تحریک صدارت سے لیکر اختتامی دعا تک ہر بات عربی زبان میں ہوتی تھی، اندرون دارالعلوم ایک خوش گوار تبدیلی ظاہر ہوئی، دوستوں نے پذیرائی کی، دشمنوں نے تنقید کا ہدف بنایا، مگر یہ مرد مجاہد، یہ قلندر صفت انسان، کسی تحسین وتنقید سے بے نیاز طرزِ کہن کے خلاف لڑنے میں مصروف رہا۔

مولانا دارلعلوم میں صرف چھ گھنٹے کے ملازم تھے، جسے محدود اور متعین وقت میں مفوضہ ذمہ داری انجام دینی ہوتی ہے، مگر مولانا نے زمان ومکان کی یہ تمام حدود وقیود بالائے طاق رکھ دیں، وہ ایک ایسے استاذ کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آئے جس کا تعلق اپنے شاگردوں سے صرف درس گاہ کے ماحول ہی میں نہیں ہوتا بلکہ درس گاہ سے باہر کی زندگی میں بھی استاذ کی اپنے شاگرد کے تعلیمی اور ذاتی امور سے دلچسپی ہوتی ہے۔ وہ کیا کرتے ہیں، کہاں جاتے ہیں، کس طرح وقت گذارتے ہیں، کمروں میں ان کے مشاغل کیا ہیں؟ یہ وہ تمام چیزیں تھیں جن پر ان کی گہری نظر رہتی تھی، حقیقت یہ ہے کہ مولانا نے تدریس کو پیشہ نہیں بنایا، بلکہ اسے ایک فرض سمجھا، عبادت کا درجہ دیا

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

جس طرح عبادات اسلامی میں اخلاص، للّٰہیت، انہماک، تواضع، خشوع اور خضوع جیسے اوصاف مطلوب ہیں اسی طرح تدریس میں بھی جذبہ للّٰہیت، خلوص نیت، مفوضہ امور میں دلچسپی اورانہماک، عالمانہ وقار کے ساتھ بے نیازی اور انکساری ذمہ داریوں کی انجام دہی میں کوتاہی پر بازپرس کا خوف اور ڈر ہونا ضروری ہے ہمارے استاذ محترم ان تمام خوبیوں سے بہرہ ور تھے۔

تدریس میں استاذ محترم کا اسلوب بالکل جداگانہ تھا، وہ خود اپنے اسلوب کے موجد تھے اور خود ہی خاتم بھی، سبق کے دوران پوری توجہ کتاب پر ہوتی، نہایت مرتب سادہ اور پرشکوہ اندازِ بیان، طلبہ ہمہ تن متوجہ، گوش برآواز، نہ سستی، نہ بے توجہی، نہ انگلیاں چٹخانے کی آواز، نہ سرسراہٹ، نہ بھنبھناہٹ، استاذِ محترم اگرچہ سبق اس طرح پڑھا رہے ہیں جیسے دنیا ومافیہا سے بے خبر ہوں نہ پہلو بدل رہے ہیں نہ پشت دیوار سے لگانے کا کوئی سوال ہے، نہ تسبیح ورومال سے کوئی شغل، پورے وقار کے ساتھ تشریف فرما ہیں، درس میں انہماک کے باوجود ماحول سے بے خبر نہیں ہیں، کیا مجال کوئی طالب علم غفلت کر جائے، دوسرے ہی لمحے گرفت میں آجائے گا، اور پھر اس سے پوچھا جائے گا کہ بتلاؤ ابھی میں نے کیا کہا تھا، بھلا جس درس گاہ کی یہ صورت حال ہو وہاں کسی طالب علم کو یہ حوصلہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ ایک لمحے کے لئے بھی اپنی توجہ دوسری طرف ہٹا سکے۔

حضرت الاستاذ کے یہاں کتاب کی رسمی خواندگی نہیں تھی، جیسا کہ ہمارے مدارس میں عام طور پر دستور ہے کہ استاذ تشریف لاتے ہیں، کوئی طالب علم عبارت پڑھتا ہے، استاذ محترم دھواں دھار تقریر کرتے ہیں اور واپس تشریف لے جاتے ہیں۔ حضرت الاستاذ کے یہاں سبق کا یہ انداز کبھی نہیں رہا سب سے پہلے عبارت پڑھی جاتی، باری باری تمام طلبہ کو پڑھنے کا موقع دیا جاتا، تاکہ سب کا حوصلہ کھلے

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

سب کو عبارت پڑھنے کا سلیقہ آئے، تلفظ کی ادئیگی پر پورا پورا زور دیا جاتا، عربی عبارت پڑھتے ہوئے عربی لہجہ ہونا چاہئے، الفاظ پوری طاقت کے ساتھ ان کے صحیح مخرج سے ادا ہونے چاہئیں، آواز اتنی بلند ہونی چاہئے کہ درس گاہ کے آخری کونے میں بیٹھا ہوا شخص بھی آسانی کے ساتھ سن سکے، اور سمجھ سکے، عبارت میں اعراب کی غلطی گوارا نہیں تھی، اگر آپ غلط پڑھ گئے تو یہ بتلانا آپ کا فرض تھا کہ اس غلطی کی وجہ کیا ہے، اور صحیح اعراب کیا ہونا چاہئے، کیا مجال کوئی طالب علم ''ق'' کو ''ک'' یا ''ش'' کو ''س'' پڑھ جائے، جب تک ادائیگی حروف صحیح نہ ہو آگے بڑھنا ممکن ہی نہیں تھا، عبارت کا پل صراط طے کرنے کے بعد ہی تشریح وتوضیح کا سفر شروع ہوتا، نہ غیر ضروری طوالت، نہ مجمل اور مبہم گفتگو، ایک ایک جملہ ناپ تول کر، ضرورت کے مطابق، سامع کا معیار اور مخاطب کی ضرورت ملحوظ رکھتے ہوئے، درمیان میں کوئی ایسی بات کہ بے ساختہ ہنسی آجائے، مگر کس میں اتنی ہمت تھی کہ زیر لب مسکراہٹ سے تجاوز کرتا، البتہ ذہنی تناؤ ختم، کوفت دور اور فضا میں انسیت کا خوش گوار احساس، جیسے گرمی اور گھٹن سے بوجھل فضا میں اچانک ہوا کے ٹھنڈے جھونکے بدن کو چھو جائیں اور ساری تھکن دور ہوجائے، درس گاہ کیا تھی، تربیت گاہ تھی، جہاں ہر چیز کے آداب بیان کئے جاتے تھے اور ان پر عمل کے طریقے سکھلائے جاتے تھے، کبھی موقع ہوتا تو ارد گرد کے ماحول پر بھی نقد وتبصرہ ہوتا، حالاتِ حاضرہ پر بھی اظہارِ خیال ہوتا اور طلبہ کے مسائل پر بھی گفتگو ہوتی، کبھی اندازِ بیان اس قدر پر جوش اور ولولہ انگیز کہ پورے جسم میں سنسناہٹ دوڑ جاتی، اور جذبات کے سمندر میں طوفان برپا ہوجاتا، کبھی اس قدر سنجیدگی کہ دل بے چین ہوجاتا اور آنکھیں بھیگ جاتیں، کبھی اس قدر شوخی اور ظرافت کہ گنگنانے اور خوشی سے جھومنے کو جی چاہتا، وہ سحر طراز شخصیت کے مالک تھے، لفظوں سے جادو جگاتے سننے والے کو اپنی آواز کے جادو سے ایسا مسحور کرتے کہ دیر تک اس کا اثر برقرار رہتا۔

جن لوگوں نے انہیں دارالعلوم کے ماحول میں چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے علمی سرگرمیوں میں مصروف، درس گاہ میں سبق پڑھاتے ہوئے، طلبہ کے اجتماعات میں بیٹھے ہوئے، یا تقریر کرتے ہوئے، اپنے کمرے میں طلبہ سے باتیں کرتے ہوئے، یا النادی کے دفتر میں طلبہ کی دلچسپی کے امور میں حصہ لیتے ہوئے، یا کسی تعلیمی یا انتظامی کمیٹی کے جلسے میں شرکت کرتے ہوئے یا کسی خاص مسئلے پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے دیکھا ہے، وہ یہ کہنے پر مجبور ہوں گے کہ دارالعلوم نے گذشتہ ایک سو پچاس سال کے عرصے میں ایسا ہمہ گیر اور مکمل، ایسا مخلص اور صاف باطن، ایسا جاں نثار اور وفا شعار، ایسا بے لوث اور بے غرض، ایسا متواضع اور منکسر المزاج، ایسا شائستہ اور باوقار، ایسا محنتی اور جفاکش، ایسا صاف گو اور بے باک انسان پیدا نہیں کیا، دارالعلوم اپنے اس لائق فرزند پر جس قدر بھی ناز کرے، جس قدر بھی فخر کرے کم ہے، وہ ایک فرد نہیں تھے ایک انجمن تھے، ایک مکمل ادارہ تھے، ان کی زندگی کا ہر لمحہ عربی زبان کی خدمت کے لئے وقف تھا، وہ اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے دارالعلوم کے بارے میں سوچا کرتے تھے، انہیں ہر وقت یہ فکر ستاتی تھی کہ وہ اپنے شاگردوں کو مکمل انسان کیسے بنائیں، ایک ایسا انسان جو نہ صرف عربی زبان پر مکمل عبور رکھتا ہو، بلکہ وہ دوسرے علوم میں بھی اپنے ہم عصروں پر فائق ہو، بول چال میں، چال ڈھال میں، لباس میں عادات واخلاق میں، تہذیب وشائستگی میں، اسلامی تعلیمات کا مکمل نمونہ ہو، اپنے شاگردوں کی فلاح کے لئے، ان کے بہتر حال اور شان دار مستقبل کے لئے ہر وقت متفکر رہنے والا، ہمہ وقت سوچنے والا انسان اس خود غرض اور مطلب پرست دنیا میں ڈھونڈھے نہیں ملتا، لیکن ہمیں فخر ہے کہ ہماری ان آنکھوں نے ایک ایسا شخص دیکھا ہے اگر آج ہم اپنے چھوٹوں کو مولانا کی عظمتوں کی ایک جھلک دکھلانا چاہیں تو شاید وہ ہمیں جھٹلا دیں کیونکہ وہ آج خود اپنی آنکھوں سے جو کچھ دیکھ رہے ہیں اس کی موجودگی

میں انہیں ہماری باتیں ناقابل یقین لگتی ہیں۔

جس طرح حضرت الاستاذ کو طلباء سے محبت تھی، اور جس طرح وہ انہیں اپنے بچوں کی طرح پیار کرتے تھے اور جس طرح وہ ان کی ہر ادا پر، ہر حرکت پر نظر رکھتے تھے، اور جس طرح وہ ان کی خوشی سے خوش اور ان کے رنج وغم سے غم زدہ وملول ہو جاتے تھے، اسی طرح طلبہ کو بھی ان سے والہانہ عقیدت اور محبت تھی، اسی طرح طلبہ ان کو اپنا مشفق اور مہربان باپ سمجھتے تھے، اسی طرح وہ ان کی نگاہ کے ہر زاویئے پر نظر رکھتے تھے، اور ان کے اشارے کے منتظر رہتے تھے، اسی طرح وہ ان کی راحت سے راحت اور دُکھ سے دُکھ محسوس کرتے تھے، آج بھی جب کہ یادوں کا کارواں ماضی کے غبار میں اوجھل ہوتا جا رہا ہے آنکھوں کے سامنے سیکڑوں مناظر روشن ہیں، طلبہ کے ساتھ ان کے گہرے تعلق کے اور ان کے ساتھ طلبہ کی گہری عقیدت کے، اگر لکھنے بیٹھوں تو رات کا سفر تمام ہو جائے اور داستان ادھوری رہے، دور کیوں جائیں، یہ انقلاب جو ۱۹۸۰ء کے بعد برپا ہوا کیا خود بہ خود برپا ہو گیا، کیا کسی شخص میں یہ حوصلہ تھا کہ وہ ان گنت ذہنوں کی سوچ کا رخ تبدیل کرتا، یا ان کو وقت کا دھارا بدلنے پر آمادہ کرتا، حالات کی یہ تبدیلی اسی ایک شخص کی رہین منت ہے جس نے اپنے خونِ جگر سے وفا کی تاریخ لکھی اور بدلے میں بے وفائی کے زخم کھائے۔

آج حضرت الاستاذ کی سالہا سال کی محنتوں کا ثمر ''القاموس الوحید'' کی شکل میں ہمارے سامنے ہے یہ خوشی کا موقع ہے مگر دل رنج وغم سے بے قابو ہو رہا ہے، کسی مصنف کی سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی تصنیف کو جسے اس نے تخلیق کیا ہو، جسے اپنا خونِ جگر پلایا ہو، اپنی رگِ جاں سے لہو کا ایک ایک قطرہ نچوڑ کر جس کے صفحات رنگین کیئے ہوں اس کی زندگی میں زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچے، مگر افسوس! آج جب ان کے خواب کو تعبیر کا پیرہن مل رہا ہے تو اسے

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

چھونے اور دیکھنے کے لئے وہ اس دنیا میں نہیں ہیں، کاش مصنف کو حیات مستعار کے چند سال اور نصیب ہو جاتے اور وہ اپنی محنت کے شجر پر گلاب کھلتے دیکھ لیتے، مگر تقدیر کون بدل سکتا ہے، خدا کی خدائی میں کس کو دخل ہے۔

دارالعلوم دیوبند کے محدث کبیر، حضرت علامہ سید انور شاہ کشمیریؒ سماعِ موتی کے قائل تھے، قادیانیوں کے خلاف ریاست بھاولپور کی عدالت میں ایک مقدمہ چلا جس میں اکابر دیوبند کے بیانات ہوئے، علامہ کشمیریؒ نے اس موقع پر اکتالیس صفحات پر مشتمل ایک بیان کمرۂ عدالت میں ریکارڈ کرایا، اس مقدمے کے فیصلے کا حضرت کو بڑی بے چینی کے ساتھ انتظار تھا، مگر آپ کی وفات تک اس کا فیصلہ نہ ہوسکا اسلئے آپ نے مرض الموت میں اپنے بعض شاگردوں کو یہ وصیت فرمائی کہ اگر میرا انتقال ہو جائے اور اس مقدمے میں قادیانیوں کو کافر تسلیم کر لیا جائے تو فیصلے کی اطلاع میری قبر پر آکر دے دی جائے تاکہ میری روح کو سکون مل جائے، دل چاہتا ہے کہ ہم سب مل کر آج استاذ محترم کی قبر پر جائیں اور یہ اطلاع دیں کہ آپ نے اپنی زندگی کے آخری ماہ و سال اور شب و روز جس کتاب کی تالیف میں گذارے وہ شاہ کار تالیف آج منظر عام پر آ گئی ہے، آپ کے تلامذہ، آپ کے چاہنے والے، آپ کے عشاق اس کتاب کے لئے چشم دل فرش راہ کئے بیٹھے ہیں، وہ اس شمع علم و آگہی سے جس کو آپ نے خونِ جگر جلا کر روشن کیا تھا اکتساب نور کے لئے بے چین ہیں، مجھے یقین ہے کہ ہمارے استاذ محترم کو اس خبر سے بے پایاں سکون اور بے پناہ خوشی حاصل ہوگی۔

میں اس شعر پر اپنا یہ مضمون ختم کرتا ہوں

ویراں ہے مے کدہ خُم و ساغر اداس ہیں
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

ایک عظیم فقیہ، ایک عظیم مرشد

فقیہ الامت حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہیؒ

بعض رشتے خونی رشتوں پر بھاری پڑ جاتے ہیں، یہ بات فقیہ الامت حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہیؒ اور ان کے خلیفۂ خاص حضرت مولانا ابراہیم صاحب پانڈور کے رشتے پر پوری طرح صادق آتی ہے، غالباً ۱۹۷۰ء کے آس پاس کی بات ہوگی کہ ایک دبلا پتلا سا افریقی طالب عالم چھتہ مسجد سے دارالعلوم کی قدیم مسجد کے اوپر بنے ہوئے دارالافتا آتے جاتے حضرت مفتی صاحب کے پیچھے پیچھے چلا کرتا تھا، اس وقت تک نہ مفتی صاحب کی اتنی شہرت ہوئی تھی اور نہ ان کی طرف کچھ زیادہ رجوع تھا البتہ ان کا علم، فقاہت، بذلہ سنجی اور حاضر جوابی کا بڑا شہرہ تھا، یہ وہی افریقی طالب علم ہے جو پہلے ابراہیم افریقی تھا اور اب مولانا ابراہیم پانڈور افریقی ہیں، اور حضرت فقیہ الامت کے تمام عقیدت مندوں اور ارادت مندوں کے محبوب ہیں، یہ مقام ومرتبہ انھوں نے اپنے استاذ اور پیر ومرشد کی خدمت سے حاصل کیا ہے، حضرت بھی اُن پر جان چھڑکتے تھے، وہ جہاں چاہتے حضرت کو لے جاتے، جب چاہتے لے آتے، ایک طرح سے وہ حضرت کی اولاد کی طرح تھے، بڑھاپے میں بوڑھے ماں باپ اپنے بچوں کی مرضی کے تابع ہوجاتے ہیں، بالکل یہی صورت حال یہاں تھی، جس وقت ۱۸/اپریل ۱۹۹۶ کو حضرت سب سے مل ملا کر رخصت ہو رہے تھے تو سب کو اندازا

ہوگیا تھا کہ یہ حضرت کی آخری رخصتی ہے، عمر بھی اچھی خاصی ہے، کمزوری ہے، نقاہت ہے، مختلف امراض ہیں، بغیر سہارے کے چلنا پھرنا مشکل ہے، ایسی حالت میں واپسی کی امید کم ہی ہے، خود حضرت اس مرتبہ جانے سے پہلے جس طرح مل ملا کر جارہے تھے اس سے بھی ایسا لگ رہا تھا کہ حضرت خود بھی اپنی واپسی کے لئے پُر امید نہیں ہیں اس سال حضرت نے دورۂ حدیث شریف کے طلبہ کو نسائی شریف کا درس دیا، اور ذی قعدہ کے اوخر تک کتاب کو مجوزہ نصاب تک پہنچا دیا، کتاب کے اختتام والے دن دور دور تک شہرت ہوگئی، دارالحدیث کھچا کھچ بھر گئی، حضرت نے بڑی الحاح وزاری کے ساتھ دُعا فرمائی، اگر چہ حضرت کو کتاب ختم کرانے میں تعب بہت اٹھانا پڑا، کئی کئی طالب علم حضرت کو پکڑ کر دارالحدیث میں لے جا کر ان کی مسند پر بٹھلایا کرتے تھے بعض اوقات پڑھاتے پڑھاتے حضرت پر کھانسی کا دورہ پڑتا، کبھی کبھی نیم بے ہوشی کی سی کیفیت طاری ہوجاتی، کبھی ہچکیاں لگ جاتیں، مگر حضرت سبق پڑھا کر ہی دم لیتے پورے گھنٹے پڑھاتے رہتے، پڑھنے والے بھی سمجھ رہے تھے بس اب یہ چراغ سحر بجھا ہی چاہتا ہے، اور حضرت تو خود اپنی حالت کو زیادہ بہتر جانتے تھے، اسی لئے خود حضرت کی بھی یہ خواہش تھی کہ کسی طرح یہ کتاب نصاب تک پوری ہوجائے اور یہ آخری سال بھی حدیث کی خدمت میں گزر جائے اور طلبہ بھی متمنی تھے کہ ہماری یہ کتاب حضرت ہی کے پاس پوری ہو، کتاب کے اختتام کے بعد حضرت نے آس پاس کے مدارس کا دورہ کیا، بزرگوں کی خانقاہوں پر پہنچے، ان کی قبروں پر حاضری دی، دارالافتا تشریف لے گئے، اپنے پرانے رفقا سے ملاقات کی، دارالاہتمام تشریف لے گئے، مہتمم دارالعلوم حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب سے ملے، صاف لگ رہا تھا کہ یہ آخری ملاقاتیں ہیں، بس اب یہاں سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہورہے ہیں، ہر شخص کی تمنا تھی کہ حضرت یہیں پر رہیں، یہاں ان کے مریدین متوسلین کا بڑا حلقہ ہے، شاگرد

ہیں، رشتہ دار ہیں، مگر وہی بات جو میں نے شروع میں عرض کی، بعض رشتے خونی رشتوں پر بھاری پڑ جاتے ہیں، مولانا ابراہیم نے ایک حقیقی بیٹے سے بڑھ کر ان کی خدمت کی اور سگی اولاد سے زیادہ حضرت سے محبت کی، حضرت ان کی خواہش ٹھکرا نہ سکے، اس طرح حضرت اپنے آخری سفر پر افریقہ روانہ ہو گئے، یہ احساس سب کو تھا کہ شاید حضرت اب ہندوستان واپس نہیں آسکیں گے، صحت دن بہ دن زوال کی طرف جا رہی ہے، اسی لئے جب ان کی روانگی کا دن آیا تو دارالعلوم کے درودیوار پر اداسی طاری تھی، ہوسکتا ہے یہ میرا احساس ہو، مگر ان آنسوؤں کو کیا کہیں گے جو عین رخصت کے وقت طلبۂ عزیز کی آنکھوں سے جاری تھے، اور ان بے قراریوں کو کیا نام دیں گے جو ان کے چہروں سے عیاں تھیں، وہی ہوا جس کا ڈر تھا ۲۱/اپریل ۱۹۹۶ کو حضرت جوہانسبرگ پہنچے اور پانچ ماہ مختلف امراض میں مبتلا رہ کر ۲/ستمبر ۱۹۹۶ء کو انتقال فرما گئے۔

حضرت کے انتقال کی خبر دیوبند میں بجلی بن کر گری، اگر چہ ہر شخص اس خبر کو متوقع سمجھ رہا تھا، کیوں کہ افریقہ سے لگاتار اس طرح کی خبریں مل رہی تھیں کہ حضرت شدید طور پر علیل ہیں، اب غفلت میں ہیں، اب آپریشن ہو رہا ہے، اب افاقہ ہے اس طرح کی متواتر خبروں سے یہاں تشویش پیدا ہو رہی تھی، دعاؤں کا سلسلہ بھی چل رہا تھا، اس کے باوجود انتقال کی خبر سُن کر ہر شخص سکتے میں پڑ گیا، متعلقین اور منتسبین کی تمنا یہ تھی کہ حضرت کی میت دیوبند لائی جائے اور یہیں تدفین ہو، لیکن قضا وقدر کے فیصلوں کے سامنے کس کی چلی ہے، ابھی میت لائے جانے یا نہ لائے جانے کے متعلق قیاس آرائیاں چل ہی رہی تھیں کہ یہ اطلاع بھی آگئی کہ نماز جنازہ حضرت کے خلیفۂ خاص حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم بنارسی نے پڑھائی، اور تقریباً دس ہزار افراد کی موجودگی میں الیسبرگ کا قبرستان حضرت کی آخری آرام بن گیا، لیجئے قصّہ ختم ہوا۔

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

فقیہ الامت حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہیؒ کی پیدائش مشہور ومعروف قصبہ گنگوہ میں ۱۹۱۶ھ میں ہوئی حضرت اس قصبے کے اس خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں جس کا سلسلہ مشہور صحابی رسول حضرت ابو ایوب انصاریؓ پر جاکر منتہی ہوتا ہے، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کا تعلق بھی اسی خاندان سے تھا، اس خاندان میں علم بھی رہا ہے اور زہد وتقویٰ بھی، حضرت مفتی صاحب کے دادا حاجی خلیل احمد نیک صالح انسان تھے اور والد مولانا حامد حسن تو عالم بھی تھے اور صاحب نسبت بزرگ بھی دارالعلوم سے فارغ تھے، حضرت شیخ الہند کے خاص شاگردوں میں ان کا شمار ہوتا تھا حضرت شیخ الہندؒ ہی نے انھیں ضلع بجنور کے قصبہ نہٹور میں مدرس بنا کر بھیجا، مدت العمر اسی مدرسے میں تدریسی خدمت دیتے رہے، انتقال بھی نہٹور میں ہوا، اور یہیں دفن کیئے گئے، حضرت کی بسم اللہ حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ نے مشترکہ طور پر کرائی، ناظرہ کلام پاک حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کی رابعہ صفت بیٹی حضرت صفیہؒ کے گھریلو مکتب میں ان ہی سے پڑھا، حفظ کا آغاز اسی مکتب میں حافظ کریم بخش کے پاس ہوا، اور تکمیل حفظ جامع مسجد گنگوہ کے امام حافظ عبدالکریم کی خدمت میں رہ کر کی، درس نظامی کی ابتدائی تعلیم نہٹور میں ہوئی، فارسی کتابیں مولانا امتیاز حسین سے پڑھیں اور عربی کی ابتدائی کتابیں اپنے والد محترم سے پڑھیں، جن کا طرز تعلیم بالکل منفرد تھا، وہ ایک دن قواعد پڑھاتے اور ہفتے کے باقی پانچ دن ان قواعد کا اجرا کراتے، اس طرح میزان جیسی مختصر سی کتاب بھی پورے سال ختم نہ ہو پاتی لیکن قواعد پر طالب علم کی پکڑ انتہائی مضبوط ہو جاتی، درس نظامی کے سال اوّل کی تعلیم کے بعد حضرت مفتی صاحب کو مظاہر علوم سہارن پور بھیجد یا گیا، اکثر تعلیم حضرت کی اسی مدرسے میں ہوئی ہے، صرف ونحو کی ابتدائی کتابوں سے لے کر جلالین تک کے درجات کی تعلیم یہیں مکمل کی، سات سال مظاہر علوم میں گزارنے کے بعد حضرت

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

دارالعلوم دیوبند آ گئے، مشکوۃ شریف اور دورۂ حدیث شریف کے سال کی کتابیں حضرت نے دارالعلوم ہی میں رہ کر پڑھیں، کئی نامی گرامی اساتذہ سے فیض اٹھایا جن میں سے کچھ حضرات کے نام ہیں شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ، حضرت علامہ ابراہیم بلیاویؒ، حضرت مولانا غلام رسول خاں صاحبؒ، حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ وغیرہ، ۱۳۵۰ھ میں دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد دوبارہ مظاہر علوم واپسی کا خیال دامن گیر ہوا، اس سلسلے میں انھوں نے اپنے استاذ مکرم شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا کاندھلویؒ کو لکھا کہ میں آپ سے حدیث پڑھنے کی خواہش رکھتا ہوں حضرت شیخ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ اگر تمہیں دورہ پڑھنا ہی ہے تو حضرت شیخ مدنی ہی سے دوبارہ پڑھ لو، لیکن حضرت مفتی صاحب کا اصرار جاری رہا، آخر حضرت شیخ نے سہارن پور واپسی کی اجازت مرحمت فرمادی، اس طرح حضرت مفتی صاحب نے دو بڑے مدرسوں میں دورۂ حدیث شریف پڑھا، حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کو والہانہ شغف تھا، حضرت شیخ الحدیث کی ذات گرامی سے سے بھی بڑی محبت اور عقیدت تھی، زمانۂ طالب علمی میں بھی اور بعد میں بھی یہاں تک کہ دیوبند آنے کے بعد بھی حضرت ہر سال معمولاً مسلسلات کے ختم میں سہارن پور تشریف لے جایا کرتے تھے، کسی نے پوچھا آپ نے حضرت شیخ سے مسلسلات کتنی مرتبہ پڑھی ہے فرمایا چھتیس مرتبہ۔

تعلیم سے فراغت کے بعد حضرت مفتی صاحب ۱۳۵۱ھ میں مظاہر علوم میں مفتی بنادئے گئے، کچھ اسباق بھی آپ کے متعلق رہے، یہ سلسلہ ۱۳۷۳ھ تک جاری رہا، اسی سال اہل کان پور کی خواہش اور درخواست پر ذمہ داران مظاہر علوم نے حضرت مفتی صاحب کو اس شہر کے معروف دینی ادارے جامع العلوم میں صدر مدرس بنا کر بھیج دیا، یہ وہ مدرسہ ہے جہاں برسہا برس تک حکیم الامت حضرت تھانویؒ کا قیام رہا

ہے، حضرت کے بعد سے اب تک مدرسے کو کوئی ایسا لائق استاذ اور مربی نہیں مل سکا تھا، اہل مدرسہ کی نگاہ انتخاب حضرت مفتی صاحب پر پڑی جو انتہائی نیک نامی کے ساتھ لگ بھگ بائیس سال سے مظاہر علوم میں افتا اور تدریس دونوں طرح کی ذمہ داریاں انجام دے رہے تھے حضرت نے اس اجڑے ہوئے مدرسے کو دوبارہ آباد کیا اس کا نظم ونسق چست درست کیا، تعلیمی نظام میں اصلاحات کیں، اور اپنی صلاحیتوں سے یہ ثابت کر دیا کہ اہل مدرسہ نے ان کا انتخاب غلط نہیں کیا تھا، جامع العلوم کو وہ دن واپس مل گئے جب حکیم الامت حضرت تھانوی یہاں مقیم تھے، حضرت مفتی صاحب اس مدرسے میں ۱۳۸۵ھ مطابق ۱۹۶۵ء تک مقیم رہے، اسی دوران دارالعلوم دیوبند میں مسند افتا کے لئے ایک ایسے مفتی کی ضرورت محسوس کی گئی جو اس فن میں انتہائی پختہ کار ہو، مجلس شوریٰ دارالعلوم نے طے کیا کہ کان پور سے مفتی محمود حسن گنگوہی کو دارالعلوم بلا لیا جائے، لیکن اس کے لئے ضرورت تھی کہ حضرت شیخ الحدیث کی رائے اور رضامندی بھی ہو، چنانچہ اس مقصد کے لئے حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نے حضرت شیخ الحدیث کو خط لکھا کہ ”اس وقت دارالافتا میں ایک قابل مفتی کی سخت ضرورت محسوس کی جارہی ہے، قاضی مسعود صاحب وفات پا چکے ہیں، مولانا جمیل الرحمٰن لکھنے پڑھنے سے معذور ہو چکے ہیں، پورے شعبے کی ذمہ داری تن تنہا حضرت مولانا مفتی مہدی حسن پر ہے، اس سلسلے میں حضرت مولانا مفتی محمود حسن کے اسم گرامی پر پوری مجلس شوریٰ مجتمع ہے، اوران کو دارالافتاء کے منصب افتا کے لئے نہایت موزوں سمجھ رہی ہے، احقر پہلے ہی سے ان کا معتقد ہے، مگر چوں کہ ممدوح کان پور میں عرصے سے کام کر رہے ہیں اور کسی قدیم جگہ سے ہلنا طبعاً دشوار ہوتا ہے جب تک کوئی قوی محرّک نہ ہو اور وہ بھی معتقد فیہ، اس لئے آں محترم سے درخواست ہے کہ دارالعلوم کی اس اہمیت والی ضرورت کو پیش نظر رکھ کر انھیں نہ صرف

مشورہ دیں بلکہ امر فرمادیں کہ وہ مرکز کی ضرورت کو فروعی ضروریات پر مقدم رکھیں'' اس طرح حضرت مفتی صاحب دارالعلوم کی ضرورت اور اپنے شیخ کے حکم کی تعمیل میں دیوبند تشریف لے آئے، اہل کان پور نے بہت چاہا کہ حضرت مفتی صاحب یہاں سے نہ جائیں، ان لوگوں نے دیوبند اور سہارن پور خطوط بھی لکھے، وہاں سے وفود بھی آ کر ملے مگر اللہ کی مرضی اسی میں تھی کہ حضرت مفتی صاحب اب اپنی مادر علمی کو رونق بخشیں، ۱۹۶۰ء سے تادم آخر حضرت مفتی صاحب کا قیام دارالعلوم دیوبند میں رہا، البتہ اجلاس صد سالہ کے بعد جو حالات پیش آئے اس سے بد دل ہو کر حضرت کچھ دن مظاہر علوم میں ضرور مقیم رہے، بعد میں واپس تشریف لے آئے، منصب افتا سے انھوں نے فقہ وفتاوی کی وقیع خدمات انجام دیں، بخاری شریف جلد ثانی کا درس بھی سالہا سال تک دیا درمیان میں دوسری کتابیں بھی پڑھائیں، راقم السطور نے بھی بخاری شریف جلد ثانی حضرت مفتی صاحبؒ ہی سے پڑھی ہے۔

حضرت مفتی صاحب دارالعلوم دیوبند اور مظاہر علوم سے فارغ ہوئے تو اس وقت اکابرین دیوبند کی کئی خانقاہیں مرجع خلائق بنی ہوئیں تھیں، تھانہ بھون میں حکیم الامت حضرت تھانویؒ، دیوبند میں شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ، رائے پور میں حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری، اور سہارن پور میں شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب کے دم سے یہ خانقاہیں آباد تھیں، حضرت مفتی صاحب کا میلان طبع اوّل دن سے حضرت شیخ الحدیث کی طرف رہا، انھی سے بیعت واصلاح کی درخواست کی، حضرت شیخ الحدیث نے مفتی صاحب کو ان کے جذبۂ صادق اور طلب صادق کو آزمانے پرکھنے کے بعد اپنے سلسلۂ بیعت میں شامل فرمالیا، ۱۳۴۹ء میں جو تعلق قائم ہوا تھا، وہ حضرت شیخ الحدیث کی وفات تک قائم رہا بلکہ اس میں دن بہ دن وارفتگی اور والہانہ پن محسوس کیا گیا، اور یہ بات کسی ایک جانب نہیں بلکہ دونوں طرف تھی، اگر مرید کو اپنے پیر سے عشق کی حد تک عقیدت تھی

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

تو پیر کو بھی اپنے مرید سے انتہائی درجے کی محبت تھی، اس کا ثبوت وہ سینکڑوں خطوط ہیں جو ادھر سے اُدھر لکھے گئے، ان مکاتیب سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت مفتی صاحب اپنے شیخ کی محبت میں اس درجے پر پہنچ چکے تھے جسے اصطلاح تصوف میں فنافی الشیخ کہتے ہیں۔

ارشاد و تلقین کا یہ سلسلہ لگ بھگ تیرہ چودہ برس تک چلتا رہا، ۱۳۶۲ھ میں حضرت شیخ نے اجازت وخلافت مرحمت فرمائی، حضرت شیخ الحدیث کی وفات تک تو حضرت مفتی صاحب نے اس میدان میں کچھ زیادہ دلچسپی نہیں دکھلائی اور نہ لوگوں کو بڑی تعداد میں بیعت کیا لیکن حضرت شیخ کی وفات کے بعد بیعت وارشاد کا سلسلہ خوب چلا، یہاں تک کہ مسجد چھتہ جہاں سے دارالعلوم کا آغاز ہوا اور جس کے حجروں میں اکابرین دارالعلوم فروکش رہا کرتے تھے مرکز رشد وہدایت بن گئی، حضرت کے جو آخری چند سال یہاں گزرے ہیں ان میں عوام تو عوام، خواص بلکہ اخص الخواص بھی حضرت مفتی صاحب کے دست حق پر بیعت کرنا اپنی سعادت سمجھتے تھے، حضرت نے بھی کسی کو محروم نہیں کیا، آج دنیا بھر میں ان کے لاکھوں مرید ہوں گے، خلفا کی تعداد بھی ایک سو تینتیس ہے، یہ خلفا ہندوستان پاکستان، بنگلہ دیش، سعودی عرب، افریقہ فرانس، انگلینڈ، ویسٹ انڈیز وغیرہ ممالک میں پھیلے ہوئے ہیں، حضرت مفتی صاحب کے تقریباً تمام خلفاء دینی درس گاہوں سے فارغ شدہ علمائے دین ہیں، اللہ تعالیٰ ان حضرات کے ذریعے بڑا کام لے رہا ہے، اپنے اپنے علاقوں میں یہ حضرات مدارس اور خانقاہوں کے ذریعے اپنے مرشد کے فیوض وبرکات عام کرنے میں مصروف ہیں۔

حضرت مفتی صاحب کے انتقال سے مسجد چھتہ تو سونی ہوگئی، ایک زمانہ تھا جب یہاں رمضان المبارک کا مہینہ پوری رونقوں کے ساتھ جلوہ افروز ہوتا تھا، پنج وقتہ نمازوں میں مسجد نمازیوں سے بھری رہتی تھی، خاص طور پر تراویح کی نماز میں مسجد سے باہر بھی صفیں بن جایا کرتی تھیں، آخری عشرے میں معتکفین کے ہجوم کی وجہ سے

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

مسجد کے اندر تِل دھرنے کی جگہ بھی نہیں ملتی تھی، بڑی تعداد اہل علم کی ہوتی تھی جو اپنے احوال کی اصلاح کے لئے مفتی صاحب کی خدمت میں آکر پڑ جاتے تھے، یہ ساری رونقیں حضرت مفتی صاحب کے دم سے تھیں، اور انہی کے ساتھ رخصت بھی ہوگئیں۔

حضرت مفتی صاحب کا اہم علمی کمال ان کی وہ شان فقاہت ہے جو ان کے ہزاروں فتاویٰ سے جھلکتی ہے، حضرت کو الزامی جواب دینے میں بڑی مہارت تھی اور یہ مہارت دوران تدریس تو نمایاں ہوتی ہی تھی فتاویٰ میں بھی پوری طرح نمایاں نظر آتی ہے حضرت زاہدِ خشک نہیں تھے، ان کے مزاج میں مزاح کا رنگ غالب تھا، حضرت حاضر جواب بھی بہت تھے، حضرت کی مجلس دل چسپ قصّوں اور لطیفوں سے زعفران زار بنی رہتی تھی، اسی دوران وعظ ونصیحت کا سلسلہ بھی جاری رہتا، عربی اردو، فارسی کے ہزاروں اشعار نوک زبان تھے، حافظہ غضب کا تھا، عربی کی لمبی لمبی عبارتیں اس طرح سنا دیا کرتے تھے گویا ابھی حفظ کر کے آئے ہوں، طالب علمی کے زمانے میں میبذی کا دس مرتبہ تکرار کرایا، جس کی وجہ سے میبذی جیسی خشک کتاب کی عبارات ازبر ہوگئی تھی جس شخص کو میبذی یاد ہوگئی ہو اس کو حدیث اور تفسیر کی کتابیں کس طرح یاد نہ ہوں گی خود بھی شاعر تھے، اجلاس صد سالہ سے پہلے حضرت نے اساتذۂ دارالعلوم کی تعریف وتوصیف پر مشتمل ایک فارسی قصیدہ کہا تھا اور کسی موقع پر وہ خود حضرت نے سنایا بھی تھا، ایک دفعہ آنکھ کا آپریشن ہوا، کسی نے عرض کیا آنکھ کے آپریشن کے بعد حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نے ایک طویل نظم ''آنکھ کی کہانی'' لکھی تھی آپ بھی کوئی نظم ارشاد فرمادیں، فرمایا بھئی ان کی آنکھ کی شان بلند ہے، میری آنکھ تو ان کی آنکھ کے مقابلے میں خاک کے برابر ہے، دوسرے میں شاعر بھی نہیں، وہ ہر طرح قادر الکلام ہیں، اس عذر واعتذار کے بعد حضرت نے پچاس اشعار پر مشتمل ایک نعت کہی، جس کے ہر شعر میں کئی کئی معجزات کا ذکر

ہے، اس نظم سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت نہ صرف یہ کہ قادر الکلام شاعر تھے بلکہ وقائع سیرت پر بھی ان کی گہری نظر تھی اور استحضار بھی زبردست، یہ نظم بستر پر لیٹے لیٹے فی البدیہہ کہی۔

افسوس ان جیسا عالم فقیہ اور مرشد اب ڈھونڈے نہیں ملتا، یوں اللہ کے یہاں کسی چیز کی کمی نہیں، وہ چاہے تو ایک سے بڑھ کر ایک عالم، فقیہ اور مرشد پیدا کرسکتا ہے، خدا کرے ایسا ہی ہو۔

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

ہمارے زمانے کے جنید وشبلی اور بایزید بسطامی

حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد باندویؒ

حضرت مولانا قاری صدیق احمد باندویؒ کی وفات سے علم وعمل کی جو مجلس خالی ہوئی ہے وہ جلد پُر ہونے والی نہیں ہے، حضرت قاری صاحب بزرگوں کی آخری نشانی اور آخری یادگار تھے، اپنی بعض خصوصیتوں کے لحاظ سے قرن اوّل کے بزرگ معلوم ہوتے تھے، تواضع، انکساری، سادگی، للّٰہیت، اخلاص یہ تمام وہ اوصاف ہیں جو حضرت قاری صاحب میں بدرجۂ اتم موجود تھے اور جنھوں نے قاری صاحب کو بزرگوں کی محفل کا شہ نشین بنادیا تھا، حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے حالات زندگی میں ہم نے پڑھا ہے کہ علم وعمل میں ان کا مقام ومرتبہ نہایت بلند تھا مگر اتنے سادہ اور بے نفس انسان تھے کہ اگر کوئی انھیں نہ جانتا تو اسے یہ یقین ہی نہیں آسکتا تھا کہ یہ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ ہیں، بالکل یہی کیفیت حضرت باندویؒ کی تھی، نہ عالمانہ کرّ وفر نہ واعظانہ شان وشوکت، نہ جبہ ودستار، نہ خدم وحشم، عام سا لباس، سادہ سی طبیعت قریب سے گزر جائیں تو پتہ بھی نہ چلے کہ کوئی جنید وشبلی اور بایزید بسطامی گزرا ہے انھوں نے دین کے لئے خود کو بالکل مٹالیا تھا، صحیح ہے جو اللہ تعالیٰ کے لئے تواضع اختیار کرتا ہے اللہ اسے بلندی اور رفعت عطا کرتا ہے، ہمارے زمانے میں اس فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا حقیقی مصداق حضرت باندویؒ تھے۔

حضرت باندوی کی ولادت ان کے آبائی وطن ہتھورا میں ۱۹۲۳ء میں ہوئی، ہتھورا ضلع باندا میں سادات کی ایک چھوٹی سی بستی ہے جو حضرت باندوی کے آبا واجداد کی بسائی ہوئی ہے، حضرت کا خاندان اگرچہ علم کی دولت سے مالا مال نہ تھا مگر اس گھرانے کا ہر فرد متقی اور پرہیزگار تھا، حضرت کے نانا اور دادا اور دوسرے عزیز واقارب میں امانت ودیانت اور تقویٰ وپرہیزگاری پائی جاتی تھی، یہاں تک کہ بچے بھی اپنے آبا واجداد کے نقش قدم پر چلتے تھے، بچپن نہایت تنگ دستی میں گزرا، والد کا سایہ عہد طفولت میں ہی سر سے اٹھ گیا تھا، والدہ صاحبہ محنت کر کے گھر کا خرچ چلاتی تھیں، بعض اوقات چراغ میں تیل ڈالنے کے لئے پیسے نہ ہوتے، چاند کی چاندنی میں چرخا چلاتیں اور سوت کات کر فروخت کیا کرتی تھیں، کبھی کبھی گھر میں کھانے کو کچھ نہ ہوتا تو قاری صاحب جنگل سے جھاڑی کے بیر توڑ کر لے آتے، یا کھیتوں سے کپاس کے دانے لے آتے اور انھیں اُبال کر کھا لیتے، بعض اوقات فاقہ بھی ہو جاتا، حضرت کی دو بہنیں فقر وفاقے کی وجہ سے بچپن ہی میں رخصت ہو گئیں، دادا حافظ قرآن تھے، جیّد قاری بھی تھے، والد کے انتقال کے بعد انھوں نے حضرت باندوی کی تعلیم وتربیت کا سلسلہ شروع کیا، قرآن کریم کے کچھ پارے حفظ کرائے، ابھی قرآن کریم مکمل بھی نہ ہوا تھا کہ دادا بھی چل بسے حضرت کے دادا نے گھر والوں سے سختی کے ساتھ فرمایا تھا کہ صدیق کی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھنا، خواہ کچھ بھی ہو جائے ورنہ میں قیامت کے روز دامن پکڑوں گا، والدہ نے بڑے مجاہدے کئے، حضرت کی پرورش کے لئے بڑی مشقتیں برداشت کیں، تعلیم کے لئے خود سے جدا کر کے کان پور بھیجا، حضرت نے کان پور کے زمانۂ تعلیم میں بھی بڑی بے چارگی اور مفلوک الحالی کا وقت گزارا ہے، ایسے حالات بھی آئے کہ کھانے کو کچھ نہ رہا، جس مدرسے میں پڑھتے تھے اس میں امداد تو کیا ملتی الٹی فیس دینی پڑتی تھی، بعض اوقات کھانے کو کچھ نہ ہوتا، رات کے اندھیرے میں سبزی کی دکانوں پر جاتے اور وہاں سے پتے اٹھا کر لے

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

آتے اور دھو کر کھا لیتے، حضرت کی سوانح میں ایک بڑا اسبق آموز واقعہ لکھا ہے، وہ واقعہ پڑھا تو دل لرز گیا، اور آنکھوں میں آنسو آ گئے، فرماتے تھے کہ کان پور کے مدرسہ تکمیل العلوم میں داخلہ تو ہو گیا لیکن کھانے کا کوئی انتظام نہ تھا، مدرسے کے ایک بڑے استاذ نے پیش کش کی کہ اگر تم میرے گھر کے کام کر دیا کرو تو ایک وقت کا کھانا میرے ذمے حضرت باندوی صاحب ان کے ساتھ چلے جاتے، گھر کے کام کر کے واپس آ جاتے ان کاموں میں ایک کام پانی بھرنا بھی تھا، استاذ صاحب کا گھر اوپر کی منزل پر تھا نیچے سے پانی بھر کر لے جاتے، جگہ جگہ سیڑھیوں پر برتن رکھ کر بیٹھنا پڑتا، کچھ نوعمری اور کچھ مسلسل فاقہ کشی سے ضعف، کبھی کبھی بے بسی کے عالم میں رونے بھی لگتے، لیکن ایک وقت کی دو روٹیوں کی وجہ سے یہ مشقت برداشت کرنی بھی ضروری تھی، ابھی ایک ہی مہینہ گزرا تھا کہ وطن سے ایک غریب ساتھی اور آ گئے، ان کے حالات بھی اچھے نہیں تھے حضرت نے انھیں بھی اپنی روٹی میں شریک کر لیا، ایک روٹی خود کھاتے اور ایک ساتھی کو دے دیتے، اس طرح پڑھا ہے حضرت باندویؒ نے، واقعی کیا لوگ تھے، علم کے راستے میں انھوں نے کس قدر قربانیاں دی ہیں اور کتنی مشقتیں برداشت کی ہیں، حضرت کی ابتدائی زندگی کے واقعات پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور اصحاب صفہ کا خیال آ جاتا ہے جو علم کے حصول کے شوق میں صفہ چبوترے پر بھوکے پیاسے پڑے رہا کرتے تھے، مگر شوق ہر مشکل کا حل ہے، اگر دل میں کچھ حاصل کرنے کا جذبہ ہو تو راستے کی تمام صعوبتیں آسانی کے ساتھ برداشت ہو جاتی ہیں، اس واقعے کا سب سے زیادہ تکلیف دہ پہلو یہ ہے کہ جس وقت حضرت یہ مجاہدے کر رہے تھے اس وقت ان کی عُمر صرف تیرہ چودہ سال تھی۔

کان پور سے یہ مسافر راہ شوق: منزل کی جستجو اور طلب میں پانی پت پہنچا

پانی پت سے حضرت کو بڑا گہرا تعلق تھا، بار بار یہ نام کانوں میں پڑا تھا، اپنے بزرگوں سے پانی پت کے متعلق بہت کچھ سن رکھا تھا، مشہور قاری اور محدث حضرت مولانا عبدالرحمٰن

پانی پتی کسی زمانے میں ہتھورا تشریف لائے تھے، بلکہ اکثر تشریف لایا کرتے تھے اور جس جگہ آج حضرت کا مدرسہ ہے وہیں فروکش ہوا کرتے تھے، فرمایا کرتے تھے کہ مجھے اس جگہ سے علم کی خوشبو آتی ہے، ہتھورا میں حضرت کے دادا نے قاری عبدالرحمٰن پانی پتی سے علم تجوید پڑھی تھی، اور قرأت کی مشق بھی کی تھی، بعد میں حضرت کے دادا حصول علم کی غرض سے پانی پت بھی تشریف لے گئے تھے، پانی پت میں حضرت باندوی نے دو سال گزارے، لیکن دو سالوں میں حضرت نے کئی سال کی تعلیم حاصل کرلی، عربی درسیات بھی پڑھتے تھے، اور اپنے شوق سے سبعہ کا سبق بھی پڑھنا شروع کردیا تھا، آداب المعلمین میں حضرت باندوی نے خود لکھا ہے کہ سبعہ پڑھنے والے طلبہ قاری عبدالرحمٰن پانی پتی کے پوتے قاری عبدالحلیم پانی پتی کے مکان میں سویا کرتے تھے، حضرت قاری صاحب تہجد کی نماز کے بعد فجر کی نماز تک سبعہ پڑھاتے اور قرآن کریم سے قواعد تجوید کا اجرا کراتے، یہ ساری محنت طلبہ کے ساتھ شفقت کی بنا پر تھی، کبھی مدرسے سے اس کی تن خواہ نہیں لی، اس وقت حضرت باندوی سولہ برس کے تھے۔

پانی پت کے بعد اس تعلیمی سفر اگلا پڑاؤ مظاہر علوم سہارن پور تھا، یہ ۱۳۵۸ھ کا سال ہے، محنت سے پڑھا تھا اس لئے داخلہ امتحان میں کامیابی سے ہم کنار ہوئے مطلوبہ کتابیں مل گئیں، حضرت باندوی نے یہاں کئی سال گزارے، دورۂ حدیث شریف بھی مظاہر علوم میں پڑھا، شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا کاندھلویؒ سے بخاری شریف پڑھی، اسی دوران حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی کے خلیفۂ مجاز حضرت مولانا اسعد اللہ سے بیعت وارادت کا تعلق بھی قائم کیا، اور انہی سے خلافت بھی حاصل کی، حضرت مولانا اسعد اللہ نہایت متقی پرہیزگار انسان تھے، ان کی تکبیر اولیٰ بھی کبھی فوت نہ ہوتی تھی، ایسے عظیم المرتبت اور صاحب نسبت بزرگ کی خدمت میں رہ کر حضرت کی شخصیت مزید نکھر گئی تھی، صلاح وتقویٰ پہلے سے موجود تھا اب جو حضرت

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

مولانا اسعد اللہ کا دست شفقت اور سایۂ عاطفت نصیب ہوا تو یہ اوصاف خوب نمایاں ہو گئے، حضرت باندوی کے پیر و مرشد کبھی خوش ہوتے تو فرطِ محبت میں یہ فرمایا کرتے تھے، کہ اگر کل قیامت میں اللہ تعالیٰ پوچھے گا کہ کیا لائے ہو تو میں صدیق کو پیش کر دوں گا۔

فراغت کے بعد بھی حضرت باندوی نے حصول علم کا سلسلہ جاری رکھا اور دوسرے علوم وفنون کی تکمیل کے لئے سفر تک کئے، ان کے سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ حضرت نے معقولات کی کتابیں پڑھنے کے لئے الہ آباد، لکھنؤ، مظفر پور، دہلی مراد آباد مئو اور ٹونک کا سفر کیا، کچھ کرنے اور بننے کی دھن تھی، یہ طے کر چکے تھے کہ مجھے علم میں ہی لگنا ہے، جو کچھ میں نے پڑھا ہے اُسے دوسروں کو پڑھانا ہے، ہر کتاب کو اسی نقطۂ نظر سے پڑھتے، ہر فن کے حصول کے پیچھے یہی ایک جذبہ کارفرما تھا، معاشی حالات قدرے بہتر تھے، کھانے کو مل رہا تھا، اگر چہ جیب خرچ کی تنگی اب بھی تھی، کبھی کبھی مٹھائی کھانے کو دل چاہتا تو دل مسوس کر رہ جاتے، کبھی مٹھائی کا ریٹ معلوم کر کے خاموش رہ جاتے اور سوچتے مٹھائی میں فضول خرچی کی کیا ضرورت ہے، اس پیسے سے کوئی کتاب کیوں نہ خرید لی جائے، طلب علم میں حضرت باندوی کے انہماک، اور حصول علم کی خاطر حضرت کے مجاہدات کے واقعات پڑھ کر قرون اولیٰ کے ان بزرگوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جنھوں نے اس راستے کی ہر مشقت برداشت کی، سفر کئے، صعوبتیں اٹھائیں، معاشی تنگ دستی میں وقت گزارا، فقر و فاقہ تک کی نوبت آئی لیکن کبھی اپنے مقصد سے سرِ مو انحراف نہیں کیا، حضرت باندوی اگر چہ ہمارے دور میں پیدا ہوئے تھے مگر وہ اس دور کے انسان نہیں تھے، ان میں تمام خصلتیں، عادتیں، ادائیں، انداز سب پرانے بزرگوں کے تھے۔

حضرت باندویؒ کی تعلیمی زندگی پر تفصیل کے ساتھ اس لئے لکھ رہا ہوں تا کہ ہماری نئی نسل کو پتہ چلے کہ ماضی قریب میں بھی ایسی شخصیتیں گزری ہیں جنھوں نے حصول علم کہ خاطر بڑی بڑی مصیبتیں جھیلی ہیں، کیا حضرت باندوی پیٹ بھرنے کی

خاطر دست سوال دراز نہیں کر سکتے تھے، کیا وہ جھوٹ سچ بول کر کافی کچھ جمع نہیں کر سکتے تھے، یہ بھی نہ کرتے تو کم از کم اتنا تو ضرور کرتے کہ پڑھائی چھوڑ کر کسی کام میں لگ جاتے ،مگر انھوں نے ایسا کچھ بھی نہیں کیا، ایک عظیم مقصد کے لئے خود کو وقف کر دیا اور جب تک وہ مقصد حاصل نہیں کر لیا اس وقت تک سکون سے نہ بیٹھے۔

تعلیم سے فراغت کے بعد وہ ایک ایسے چمکتے دمکتے ہیرے کی طرح مدارس کی دنیا سے باہر نکلے جسے کسی جوہری نے تراش خراش کر دیدہ زیب اور بیش قیمت بنا دیا ہو، کچھ دنوں تک وہ اِدھر اُدھر مدرسوں میں رہے، بالآخر اس جگہ پہنچ گئے جہاں انھیں جانا تھا، مستقبل کی علمی اور روحانی سرگرمیوں کے لئے انھوں نے خود اپنے گاؤں ہتھورا کا انتخاب کیا، یہاں بھی حضرت باندوی کے حسنِ تخیّل ،عزم محکم ،اور جذبۂ خدمت کی داد دینی چاہئے کہ انھوں نے کسی مدرسے کی مدرسی کے بجائے فرہاد بننا پسند کیا، خود پتھر کی چٹانیں تراشیں اور راستے پیدا کئے ،حالاں کہ انھیں مظاہر علوم سہارن پور میں درس وتدریس کی پیش کش کی گئی تھی ، مظاہر علوم جیسے بڑے مدرسے میں مدرس بننا ہر اعتبار سے مفید تھا، مگر وہ اپنے وطن کے بے آب وگیاہ صحرا میں علم کے پھول کھلانا چاہتے تھے اور اس ظلمت کدۂ ویراں میں دین کی روشنی پھیلانا چاہتے تھے جو عرصہ ہوا اس روشنی سے محروم ہو چکا تھا، بس یہی خواہش اور یہی جذبہ انھیں ہتھورا واپس لایا، جہاں انھوں نے مدرسہ رحمانیہ قائم کیا، جو آج اس علاقے کا مرکزی مدرسہ بن چکا ہے، لیکن یہ چھوٹا سا مدرسہ ایک مرکزی مدرسے میں کس طرح تبدیل ہوا، بے سروسامانی کی حالت میں چھپروں میں قائم ہونے والا یہ مکتب سر بہ فلک عمارتوں کا مجموعہ کیسے بن گیا، اس کی بھی ایک طویل داستان ہے جس کا لفظ لفظ عبرت انگیز ہے، اس داستان سے پتہ چلتا ہے کہ اگر کوئی مردِ دُرویش اور ولیِ کامل کوئی خیال دل میں ٹھان لیتا ہے تو وہ اپنے جذبۂ صادق اور اخلاص نیت کے سہارے راستے کی تمام مشقتوں کو انگیز کرتا ہوا منزل مقصود

تک رسائی حاصل کرلیتا ہے، ایسا ہی کچھ یہاں بھی ہوا، زمین کی خریداری سے لے کر طلبہ کی آمد اور تعلیم کے آغاز تک حضرت باندویؒ نے جو محنت کی ہے اور جو تکلیفیں اٹھائی ہیں وہ آج کے بانیان مدرسہ کے لئے مرقّعِ عبرت ہیں، اپنے ایک ملفوظ میں حضرت باندویؒ نے مدرسوں کے ابتدائی دور کے حالات کی منظر کشی کرتے ہوئے فرمایا تھا ''شروع کا دور کتنا اچھا تھا، ہر وقت لکھنے پڑھنے کا کام تھا، طلبہ بھی اس وقت محنت سے پڑھتے تھے، چلا گیا وہ دور، کیسے طلبہ تھے کہ اپنے ہاتھ سے چکّی پیستے، جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاتے، اپنے ہاتھ سے روٹی پکاتے، ایک وقت پکالی دونوں وقت کھالی، ہر وقت پڑھنے پڑھانے کا معمول تھا، کسی دن سبق کا ناغہ نہ ہوتا تھا'' یہ ان محنتوں ہی کا ثمرہ ہے اور بانی مدرسہ کے اخلاص کا نتیجہ ہے کہ آج وہ مدرسہ ہر طرح کی سہولتوں سے آراستہ ہے، سچ ہے اللہ تعالیٰ کسی کی محنت رائے گاں نہیں کرتا۔

حضرت باندویؒ نے سادگی اور جفاکشی کے ساتھ اپنی زندگی کا آغاز کیا، اور سادگی اور جفاکشی کے ساتھ پوری زندگی گزاری، اُن کے مدرسے کو اللہ تعالیٰ نے ہر طرح کی مادّی ترقیات سے نوازا، چاہتے تو وہ بھی آرام دہ اور پُر آسائش زندگی گزار کر ماضی کی تمام تکلیف دہ یادوں سے اپنا پیچھا چھڑا سکتے تھے، مگر انھوں نے اپنے لئے اسی راستے کا انتخاب کیا جس پر وہ عہد طفولت سے چل کر عہد کہولت تک پہنچے تھے، یہ رہ گزارِ شوق کانٹوں سے بھری رہ گزر تھی، انھوں نے آخرت کی راحت و آرام کے لئے اسی راہ کی آبلہ پائی پسند کی، اپنی حیات مستعار کے آخری پڑاؤ پر پہنچنے کے بعد انھوں نے اپنے بیٹوں کو جو چند اہم نصیحتیں فرمائیں ان میں ایک نصیحت یہ بھی تھی ''دنیا کے پیچھے مت پڑو، اب تو بس ہر وقت ہاتھ میں کتاب ہونی چاہئے، زندگی بالکل سادی ہو، رکھ رکھاؤ، کرّ و فروالی زندگی مجھے پسند نہیں، وہ زمانہ تم بھول گئے جب چٹنی روٹی بھی نصیب نہ ہوتی تھی ساگ کھا کر بسر کرتے تھے اپنی پہلی حالت نہ بھولنی چاہئے

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

حضرت مولانا علی میاں صاحب کو دیکھو ان میں کس قدر سادگی ہے، ان کا کھانا بالکل سادہ ہوتا ہے ناشتے میں باسی روٹی کھالی جاتی ہے، کوئی کروفر والی زندگی نہیں ہے، یہی میں تم لوگوں سے کہتا ہوں کہ اپنی پرانی حالت نہ بھولو، کھانے پینے، رہن سہن ہر چیز میں سادگی اختیار کرو، فقر وفاقہ اور سادگی سادات کی شان ہے۔'' اور واقعی انھوں نے سادات کی شان کے مطابق فقر وفاقہ اور سادگی سے زندگی بسر کی، ایک بزرگ عالم دین سے احقر نے خود سنا ہے کہ جب وہ حضرت باندویؒ کے مدرسے میں مہمان گئے تو حضرت نے بڑا اہتمام فرمایا، عمدہ عمدہ کھانے بنوائے، اور بڑی شان دار ضیافت کی مگر خود ہمارے ساتھ کھانے میں شرکت نہیں فرمائی، بعد میں ہم نے دیکھا کہ حضرت اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے گھر سے آیا ہوا کھانا کھارہے ہیں، قربان جایئے اس حوصلے پر، اس تقویٰ پر، اس نیک نفسی پر، اس جفا کشی پر۔

حضرت باندویؒ اپنے مدرسے کے مہتمم تھے، عموماً مہتمم حضرات سیاہ سفید کے مالک ہوتے ہیں، جہاں چاہتے ہیں اور جتنا چاہتے ہیں خرچ کرتے ہیں، لیکن حضرت نے اس منصب پر رہ کر زہد وتقویٰ کی ایک ایسی مثال قائم کی ہے جس کے نمونے سلف میں تو مل سکتے ہیں لیکن اس دور میں تلاش کرنے کے باوجود نہیں مل سکتے، مدرسے کے ایک ایک پیسے کا حساب رکھا، جو کچھ آیا اس کے مصرف پر خرچ کیا، مدرسے کے مطبخ سے واجبی قیمت پر بھی چیزیں حاصل کرنے کے روادار نہ تھے حتیٰ کہ نمک جیسی معمولی چیز بھی گھر سے منگواتے یا کسی استاذ سے مانگ لیتے ایک مرتبہ فرمایا! میں نے بہت احتیاط کی ہے پھر بھی میں سوچتا ہوں کہ اللہ اس پر نہ کچھ نہ دے اور نہ مواخذہ کرے۔''

حضرت باندویؒ مجموعہ صفات وکمالات تھے، ان کی زندگی کے جتنے واقعات پڑھنے میں آرہے ہیں ان سے یہ بات کھل کر عیاں ہورہی ہے کہ اگرچہ ہم نے صحابۂ کرام کو نہیں دیکھا مگر ان کے بارے میں پڑھا بہت کچھ ہے، ان قدسی صفت نفوس کی کچھ جھلک

آج کے دور کے انسانوں میں بھی مل سکتی ہے، ہمیں فخر ہے کہ ہماری گنہ گار آنکھوں نے ایک ایسا شخص دیکھا ہے جس میں اخلاص وللّٰہیت، تقویٰ وخشیت، تواضع وانکسار، استغنا وبے نیازی توکل اور قناعت، غیرت وخودداری، اتباع سنت، شہرت سے نفرت، اور فکر آخرت جیسی صفات اپنی پوری معنویت کے ساتھ موجود تھیں، اخلاص کا یہ عالم کہ ہر کام میں اللہ کی خوش نودی پیش نظر رہتی، ہر قدم اٹھانے سے پہلے یہ سوچتے کہ میرا یہ قدم اللہ کے لئے اٹھ رہا ہے یا نہیں، دنیاوی طمع اور مادی نفع کی حرص کا تو شائبہ تک دل میں نہ تھا سب سے مشکل کام خودکو معاصی، محرّمات اور منکرات سے بچا کر چلنا ہے، حضرت باندویؒ نے اپنی پوری زندگی اس طرح گزاری کہ تقویٰ کی اعلیٰ مثال قائم کردی، ہر بات میں یہ خوف کہ کہیں آخرت میں پکڑ نہ ہوجائے، ہر مصیبت پر یہ فکر کہ میری معصیت اس مصیبت کا سبب ہے، ہر فیصلے سے پہلے آخرت کی جواب دہی کا احساس، یہی تو وہ صفت ہے جسے خشیت اور خوف کہتے ہیں، جس کا نام پرہیزگاری اور تقویٰ ہے، وہ جائز طریقے سے بھی مال دولت کما سکتے تھے اور کوٹھیاں بنا سکتے تھے، مریدین اور معتقدین کا بڑا وسیع حلقہ تھا، نذرانے، ہدایا اور تحفے بن مانگے ملا کرتے، لیکن اللہ نے بے نیازی اور استغنا کی دولت سے بھی نوازا تھا، کوئی کتنا ہی بڑا ہدیہ کیوں نہ دیتا یا تو نرمی سے انکار کردیتے یا مدرسے میں داخل کردیتے، یا اس وقت دل رکھنے کے لئے رکھ لیتے لیکن فوراً ہی کسی دوسرے کو دے دیتے، افریقہ کے سفر کے دوران کسی شخص نے ایک خوب صورت قیمتی گھڑی تحفے میں دی، حضرت نے لینے سے انکار کیا، مگر دینے والا اصرار کرتا رہا بالآخر حضرت نے گھڑی لے لی، مگر اس شخص کے نظروں سے اوجھل ہوتے ہی ایک ایسے شخص کو جو قریب سے گزر رہا تھا یہ گھڑی دے کر کہا اسے رکھ لو مگر کسی کو بتلانا نہیں، یہ استغنا اور بے نیازی ہی ہمارے بزرگوں کا رأس المال ہے حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے واقعات پڑھ پڑھ کر حیرت ہوتی تھی، اور موجودہ حالات کو دیکھ دیکھ کر وہ واقعات کچھ

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

نا قابل یقین سے لگتے تھے، لیکن حضرت باندوی کے شان استغنا نے ثابت کر دیا کہ وہ واقعات حیرت انگیز ضرور تھے مگر نا قابل یقین نہیں تھے، حضرت باندویؒ نے مدرسے کے معاملات میں حکیم الامت کا طور طریقہ اپنایا، از خود چندے کی تحریک نہ فرماتے، کوئی دیتا تو پہلے معذرت کرتے، منع کرتے، واپس کرتے، پھر قبول فرماتے، غیر ملکی اسفار بھی ہوئے، میزبان حضرات سے جاتے ہی فرما دیتے چندے کی تحریک مت کرنا، آج سو سو جتن کر کے اور طرح طرح کے حیلوں بہانوں سے چندہ وصول کیا جاتا ہے۔

اصل استغنا اور بے نیازی کا منبع غیرت اور خودداری ہے، اگر آدمی بے غیرت ہے تو اس کا کوئی معیار ہی نہیں ہوتا، مال و دولت کے پیچھے اس طرح بھاگتا دوڑتا ہے کہ شاید یہی اصل سرمایۂ حیات ہے اور غالباً اسی کے لئے دنیا میں آیا ہے، حضرت باندویؒ میں غیرت اور خودداری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، اپنی ذات کے متعلق تو خیر کبھی سوال ہی نہیں کیا، مدرسے کی ضروریات بیان کرنے میں بھی جھجکتے تھے، کوئی کچھ پیش کرتا تو لینے سے پہلے سو بار سوچتے، اصل میں حضرت باندویؒ میں توکل اور اللہ پر اعتماد کی کمی نہیں تھی، یہ دو چیزیں ہوں تو انسان بڑے سے بڑا کام کر سکتا ہے، غیب سے تمام انتظامات ہوتے چلے جاتے ہیں، لوگ خود چل کر آتے ہیں اور دیتے ہیں کسی امیر کبیر کے سامنے دست سوال دراز کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی، یہ تمام اوصاف اسی شخص میں پیدا ہوتے ہیں جسے فکر آخرت کا ''مرض'' لاحق ہو، دینا دکھلاوے کو لوگ خوددار بن جاتے ہیں استغنا اور بے نیازی کا مظاہرہ بھی کر بیٹھتے ہیں، مگر دل میں لالچ کا سانپ پھن اٹھائے کھڑا رہتا ہے، حضرت باندویؒ کے یہاں فکر آخرت بہت تھی، اٹھتے بیٹھتے بس یہی سوال زبان پر رہتا آخرت میں کیا ہوگا، ملنے جلنے والوں کو یہی نصیحت یہی تلقین کہ آخرت کی فکر و، جس شخص کے دل میں آخرت ہو نگاہ میں آخرت ہو، زبان پر آخرت ہو، وہ ان صفات کا حامل نہیں ہوگا تو کیا ہوگا۔

مضمون طویل ہو چکا ہے، اصل میں حضرت باندویؒ کی زندگی کا ہر پہلو اس قدر دل چسپ اور سبق آموز ہے کہ اسے دراز کرنے میں لطف ملتا ہے، مجھے یہ بھی لکھنا تھا کہ حضرت محض مہتمم ہی نہیں تھے بلکہ ایک قابل ترین استاذ بھی تھے، میزان سے بخاری تک تمام کتابیں پڑھائیں، مجھے یہ بھی لکھنا تھا کہ حضرت نے کئی مشکل کتابوں کی شرحیں بھی لکھی ہیں، حضرت کو تدریس اور اہتمام کا طویل تجربہ تھا، حضرت نے اپنی دو مختصر کتابوں آداب المعلمین اور آداب المتعلمین میں یہ تمام تجربات سمودئے ہیں اور ایک طرح سے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے، میری رائے تو یہ ہے کہ ان دونوں کتابوں کو مدارس میں داخل نصاب کیا جانا چاہئے، حضرت ایک بہترین شاعر بھی تھے، حضرت نے جو نعتیہ شاعری کی ہے، وہ دل کے تاروں کو جھنجوڑ کر رکھ دیتی ہے، مجھے کچھ اور بھی لکھنا تھا مگر یہ مضمون ہے، کتاب نہیں ہے، ابھی تو حضرت اس محفل رنگ و بو سے اٹھ کر گئے ہیں، لکھنے والے بہت کچھ لکھیں گے، مجھے صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ ۲۸/اگست ۱۹۹۷ء کو لکھنؤ میں حضرت باندویؒ کی وفات کی صورت میں جو حادثہ پیش آیا ہے اس نے لاکھوں کروڑوں دلوں کی دنیا تہہ و بالا کر دی ہے، ان ہی میں سے ایک میں ہوں، جس نے حضرت کی بہ مشکل دو چار مرتبہ زیارت کی ہوگی لیکن حضرت کے متعلق اتنا سنا ہے اور اتنا پڑھا ہے کہ دل میں حضرت کے لئے عقیدت اور محبت پیدا ہوگئی ہے، اس حادثۂ وفات سے میرا یہ حال ہے تو ان لوگوں کا کیا حال ہوگا جو ان سے قرب رکھتے تھے، ان کی صلبی اولاد تھے، یا شاگرد تھے، ان کے مرید تھے یا معتقد تھے، وہ اس حادثۂ وفات پر کس قدر آزردہ خاطر اور شکستہ دل ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ حضرت کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے، ان کے پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے اور امت میں پھر کوئی صدیق پیدا فرمادے۔ ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

رائدِ علم، قائدملّت

مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں ندویؒ

۲۲ رمضان المبارک ۱۴۲۰ھ ۳۱ دسمبر ۱۹۹۹ء کی تاریخ، جمعہ کا دن، ہم لوگ بعد نماز جمعہ دیوبند کی ایک بزرگ خاتون کی تدفین سے فارغ ہوکر قبرستان سے لوٹ رہے تھے کہ کسی نے کہا اس نے ابھی یہ خبر سنی ہے کہ حضرت مولانا علی میاں ندوی انتقال فرما گئے، ایک لمحے کے لئے تو ایسا محسوس ہوا کہ شاید کہنے والا غلط کہہ رہا ہے لیکن اس کی سنجیدگی اور افسردگی زبان حال سے کہہ رہی تھی کہ واقعہ ہو چکا ہے، میں یہ سنتے ہی ٹیلی فون کی طرف دوڑا، اپنے دوست مولانا عتیق احمد بستوی استاذ دارالعلوم ندوۃ العلما کو فون لگایا، انھوں نے میری آواز سنتے ہی خبر کی تصدیق کردی، یہ بھی بتلایا کہ انتقال جمعہ کی نماز سے کچھ پہلے تکیہ رائے بریلی میں جہاں حضرت کا جدی مکان واقع ہے ہوا ہے اور تدفین نماز تراویح کے بعد ہوگی، خیال تھا کہ اگر تدفین صبح کو نو، دس بجے تک متوقع ہوتو شرکت کی تیاری کی جائے، نماز جنازہ میں محرومی پر افسوس ہوا حضرت موالانا کے سانحۂ وفات کی خبر برق رفتاری کے ساتھ چہاردانگ عالم میں پھیل گئی لوگ ملک اور بیرون ملک میں اپنے واقف کاروں کو اس حادثے کی اطلاع دے رہے تھے، اس طرح یہ خبر پہلے ٹیلی فون کے ذریعے، پھر ریڈیو، ٹی وی اور اخبارات کے ذریعے ہر اس شخص کو معلوم ہوگئی جس کو علم وادب اور دین واخلاق سے ذرا بھی تعلق

اور مناسبت ہے۔

حضرت مولانا عالمی شخصیت کے مالک تھے، اس لئے ان کی جدائی کا غم بھی عالمی پیمانے پر محسوس کیا گیا، عالم اور جاہل، امیر اور غریب، شاہ اور گدا ہر شخص اس واقعے سے ملول اور غم زدہ نظر آیا، واقعی ملت اسلامیہ نے ایک ایسا قائد کھو دیا ہے جس نے اپنی تحریروں اور تقریروں سے ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ دینا بھر کے اسلام پسندوں میں بہ طور خاص عالم عرب میں فکری انقلاب برپا کیا تھا، ہندوستان کے مسلمان تو اپنی محرومی پر زیادہ ماتم کناں نظر آتے ہیں بلاشبہ وہ اس ملک میں مسلمانوں کی ڈوبتی کشتی کے آخری ناخدا تھے، اب یہ کشتی کون پار لگائے گا، اس وقت ہندوستان کے بیس کروڑ مسلمانوں کی مایوس آنکھوں میں یہ سوال صاف پڑھا جارہا ہے اور کسی کے پاس اس کا جواب نہیں ہے۔

حضرت مولانا علی میاں ندوی قابل رشک زندگی گزارنے کے بعد قابل رشک موت سے ہم کنار ہو کر رخصت ہوئے، ضعف ونقاہت تو پہلے سے تھی، حال ہی میں ان پر فالج کا شدید حملہ بھی ہوا تھا جس سے وہ چلنے پھرنے سے معذور ہوگئے تھے، ان کے عزیز واقارب تلامذہ اور خدام ہر لمحہ اُن کی خبر گیری اور خدمت پر مستعد نظر آتے، انھیں سر آنکھوں پر بٹھاتے اور ہاتھوں پر اٹھا کر لئے پھرتے، اس رمضان کے ابتدائی ایام انھوں نے اپنے معالجین کے مشورے سے ندوۃ العلما میں گزارے، بیماری کی اس سنگین حالت میں بھی نہ کوئی روزہ چھٹا اور نہ کوئی فرض نماز قضا ہوئی، فرض نماز تو کجا انھوں نے سنن ومستحبات بھی پورے اہتمام کے ساتھ ادا کئے، جس دن انتقال ہوا جمعہ کا دن تھا حسب معمول صبح نو بجے نیند سے بیدار ہوئے، ضروریات سے فارغ ہو کر نوافل پڑھے، قرآن کریم کی تلاوت کی، خط بنوایا، غسل کیا، لباس تبدیل کیا، شیروانی پہنی اس کے بعد حاضرین سے فرمایا تم لوگ بھی نماز کی تیاری کرو، ہم سورۂ کہف پڑھیں گے، جمعہ کے دن سورۂ کہف پڑھنے کا معمول آٹھ سال کی عمر سے تھا، بستر پر بیٹھے اور سورۂ کہف

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

پڑھنے کے بجائے سورۂ یٰسین کی تلاوت شروع کردی، ابھی دس بارہ آیتیں ہی پڑھی تھیں اور زبان پر یہ آیت جاری تھی " فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ وَّاَجْرٍ كَرِيْم " خدام نے محسوس کیا کہ حضرت تھوڑا پیچھے کہ طرف جھک گئے ہیں، یہ دیکھ کر ایک صاحب نے تخت پر لٹا دیا، ابتدائی طبی امداد فراہم کی گئی، لیکن وقت موعود آ پہنچا، اور چند لمحوں میں یہ عظیم شخص کبھی نہ آنے کے لئے رخصت ہوگیا، کیا اس سے بڑھ کر قابل رشک موت ہوسکتی ہے، رمضان کا مہینہ، روزے کی حالت، جمعہ کا دن، نماز جمعہ کی مکمل تیاری قرآن کریم کی تلاوت میں مشغول، زبان پر مغفرت اور اجر کریم کی بشارت کے الفاظ اور روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی۔

یہ تو انتقال کے وقت کی قابل رشک حالت اور کیفیت تھی، بلاشبہ ایسی موت نصیب ہو تو کروڑوں لوگ اپنی زندگی قربان کرسکتے ہیں، انتقال کے بعد اقصائے عالم میں جس طرح ان کے سانحۂ وفات کا غم محسوس کیا گیا وہ بالکل ایک منفرد واقعہ ہے شاید ہی کسی عالم دین کی رخصتی پر اتنی آنکھیں روئی ہوں اور اتنے دل اُداس ہوئے ہوں، ہندوستان میں کوئی شہر کوئی قصبہ اور کوئی گاؤں ایسا نہیں تھا جہاں مسلمان ہوں اور انھوں نے رنج وغم کی کیفیت کے ساتھ ایصال ثواب کا تحفہ نہ بھیجا ہو، ہزاروں جگہوں پر غائبانہ نماز جنازہ ادا کی گئی، خود حرم مکی اور حرم نبوی زادہما اللہ عزا وشرفا میں خادم الحرمین الشریفین کے حکم پر سرکاری طور پر ۲۷/رمضان المبارک کو تراویح کی نماز کے بعد نام لے کر حضرت مولانا کی وفات کا اعلان کیا گیا اور غائبانہ نماز جنازہ ادا کی گئی، اس موقع پر ایک محتاط اندازے کے مطابق دونوں حرموں میں پچاس لاکھ افراد موجود تھے مکہ مکرمہ مدینہ منورہ اور سعودی عرب کے دوسرے شہروں کی ہزاروں مساجد میں بھی یہ عمل دوہرایا گیا، اس کے علاوہ دبئ، کویت، مصر، انڈونیشیا، ملیشیا، پاکستان، بنگلہ دیش برطانیہ، جنوبی افریقہ وغیرہ بے شمار ممالک کی لاکھوں مسجدوں میں غائبانہ نماز جنازہ

ادا کی گئی، تعزیتی جلسے ہوئے، قرآن خوانی ہوئی، مغفرت کی دعائیں کی گئیں، کتنے لوگوں نے دل سوزی کے ساتھ دعائے مغفرت کی، کتنے ہاتھ رفع درجات کی دعاؤں کے لئے بلند ہوئے، ذرائع ابلاغ کی تمام تر سہولتوں کے باوجود ان کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا، صحیح تعداد اللہ ہی کو معلوم ہے، ہم تو صرف اتنا جانتے ہیں کہ اتنی قابل رشک موت کسی بادشاہ کو بھی نصیب نہیں ہوسکتی، صرف اسے نصیب ہوسکتی ہے جو علم دین کی ہفت اقلیم کا بے تاج بادشاہ ہو، اور جو جسموں پر نہیں بلکہ دلوں پر حکومت کرتا ہو، لوگوں نے دیکھا کہ انتقال کی خبر عام ہونے کے بعد تکیہ رائے بریلی پہنچنے کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا وہ رات کے آخری پہر تک جاری رہا، حالاں کہ موسم انتہائی سرد تھا اور فضا میں کہرے کی چادر تنی ہوئی تھی، گاڑیاں دو کلومیٹر کے فاصلے پر روک دی گئیں تھیں، موسم کی سختی اور وقت کی قلت کے باوجود روزے کی حالت میں سفر کرکے پہنچنے والوں کی تعداد دو لاکھ سے تجاوز کرگئی تھی، یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے باجماعت نماز ادا کی، اور جو لوگ وقت پر نہ پہنچ سکے اور جنھوں نے مٹی کے ڈھیر پر کھڑے ہوکر فاتحہ پڑھی ان کی تعداد اس سے الگ ہے، **ذٰلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء.**

دل چاہتا ہے آج کی صحبت میں حضرت مولانا کی زندگی کے کچھ پہلوؤں پر گفتگو ہوجائے، ویسے تو حضرت مولاناؒ کی حیات اور خدمات پر خود ان کی زندگی میں بے شمار مضامین اور کتابیں شائع ہوچکی ہیں، اور انتقال کے بعد تو بہت کچھ لکھا جائے گا، پوری دنیا میں لاکھوں لوگوں نے ان سے فیض اٹھایا ہے، ان کی کتابیں پڑھی ہیں، ان کی تقریریں سنی ہیں، ان میں سے اگر چند سو افراد نے بھی قلم اٹھایا تو کئی ضخیم جلدیں بھی ان کے رشحات قلم کے لئے ناکافی ہوں گی، اس کے باوجود دل چاہتا ہے کچھ لکھوں، اور حسن یوسف کے خریداروں میں ایک بے بضاعت بڑھیا کی حیثیت سے شامل ہوجاؤں، جس شخصیت کو خراج عقیدت پیش کرنے والوں میں ایک سے بڑھ کر اصحاب علم وفضل اور ارباب قلم

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

ہوں ان کے ہجوم میں ایک فرو مایہ شخص خراج عقیدت کے نام پر چند سطریں لکھ کر کیا تیر مار سکتا ہے، ماسوا اس کے کہ اپنی جبین عقیدت خم کر کے خود اپنی سعادتوں میں اضافہ کرے اور اپنے دل کے نہاں خانوں کو ان کی روشن اور تابناک زندگی کے نور سے روشن کر لے۔

حضرت مولانا کا تعلق سلسلۂ سادات کے ایک ایسے گھرانے سے ہے جس نے علم اور روحانیت دونوں میدانوں میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں، یہ سلسلہ حضرت سید شاہ علم اللہ قدس سرہ کے نام سے معروف ہے، حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ جیسی عظیم علمی او رروحانی شخصیت نے حضرت سید شاہ علم اللہ کے کمال فضل کا اعتراف کیا ہے، حضرت مولانا علی میاں ندوی اسی سلسلے کے ایک خاندان کے فرد فرید حضرت مولانا سید حکیم عبدالحی کے گھر واقع تکیہ کلاں رائے بریلی میں ۱۹۱۴ء میں پیدا ہوئے ، حکیم عبدالحی کا شمار برصغیر ہندو پاک کے ممتاز علما میں کیا جاتا ہے، ان کی معرکۃ الآراء تاریخی تصنیف ''الإعلام عمن فی تاریخ الہند من الأعلام'' (نزہۃ الخواطر) آٹھ ضخیم جلدوں میں چھپ کر اہل علم سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہے، دارالعلوم ندوۃ العلما کے ناظم بھی رہے، مولانا علی میاں ندویؒ کی عمر اس وقت نو سال تھی جب وہ سایۂ پدری سے محروم ہو گئے تھے، اصلاًان کی دینی تربیت ان کی والدہ ماجدہ سیدہ خیر النساء نے کی ، جو اپنے زمانے کی نہایت نیک اور صالح خاتون تھیں، برادر معظم ڈاکٹر سید عبدالعلیؒ نے بھی ان کی شخصیت سازی میں نمایاں رول ادا کیا، یہ حضرت مولانا کی نیک بختی رہی کہ انھیں ہر قدم پر نمایاں اہل علم کی سرپرستی حاصل رہی، اپنے ایک قریبی عزیز حضرت مولانا عزیز الرحمٰن الحسنی سے ابتدائی نحو وصرف کی کتابیں پڑھیں اپنے پھوپھا مولانا سید طلحہ حسنی سے انھوں نے بہت زیادہ استفادہ کیا، اور عربی نحو وصرف کی بڑی کتابیں ان سے پڑھیں یا ان کی نگرانی میں ان کتابوں کا مطالعہ کیا، علامہ تقی الدین

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

ہلالی مراکشی سے عربی زبان سیکھی، اپنے برادر معظم کے ساتھ دارالعلوم دیوبند تشریف لائے اور شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ سے حدیث کی کتابیں پڑھیں، اسی زمانے میں شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ سے بھی استفادہ کیا، تفسیر کا ذوق بچپن سے تھا، لاہور میں قیام کے دوران شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوری کی خدمت میں حاضر رہ کر ترجمہ وتفسیر قرآن کے اسباق میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی اور اس طرح مولانا کے ذوق تفسیر کو ان صحبتوں سے خوب جلا ملا، فرماتے ہیں اگر مولانا احمد علی صاحب سے ملاقات نہ ہوتی تو میری زندگی اچھی یا بری بہ ہر حال موجودہ زندگی سے بہت مختلف ہوجاتی اور شاید اس میں ادب وتاریخ اور تصنیف وتالیف کے سوا کوئی ذوق اور رجحان نہ پایا جاتا (پرانے چراغ: ۱۳۴)

دارالعلوم دیوبند کے تعلیمی اثرات کا بھی حضرت مولانا علی میاں نے کھل کر اعتراف کیا ہے، یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اس ایک سالہ قیام دارالعلوم کے دوران انھوں نے حضرت مدنیؒ سے جو کچھ پڑھا یا جتنا کچھ استفادہ کیا اس نے ان کے فکرونظر کی تعمیر وتشکیل میں نمایاں رول ادا کیا ہے، ہماری طالب علمی کے زمانے میں غالباً ۱۹۷۲ء میں حضرت مولانا ہم طلبہ کی دعوت پر دارالعلوم دیوبند تشریف لائے، اور دارالعلوم دیوبند کے دارالحدیث تحتانی میں انھوں نے طلبۂ دارالعلوم سے نہایت طویل اور بصیرت افروز خطاب فرمایا، اس خطاب کے الفاظ کی گونج آج تک میں اپنے کانوں میں محسوس کررہا ہوں، حضرت کا پرجوش انداز بیان، دارالحدیث کا پُرسکون ماحول اور طلبہ کی خاموش سماعت یہ وہ تین عناصر تھے جنھوں نے اس خطاب کو جاوداں بنادیا تھا، عرصے تک اس خطاب کا لفظ لفظ دارالعلوم کی فضاؤں میں گونجتا رہا اور رس گھولتا رہا، انھوں نے فرمایا تھا ''میں اس سعادت وتوفیق پر بھی اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدۂ شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے یہاں حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ کی زندگی

میں طالب علمانہ اور نیاز مندانہ حاضری اور ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنے کی توفیق عطا فرمائی، میں اس کو اپنے لئے سرمایۂ سعادت سمجھتا ہوں اور اس سے اللہ تعالیٰ کے یہاں بڑی امیدیں رکھتا ہوں، میں اس بات پر جتنا فخر کروں کم ہے، لیکن میری نیاز مندی کی تاریخ اس سے زیادہ وسیع وطویل ہے، کئی پشتوں سے میرا تعلق اس درس گاہ عالی مقام سے رہا ہے، یہاں کی زمین ان لوگوں کے آنسوؤں سے نم اور یہاں کی فضا ان کی دعاؤں اور آہوں سے اب بھی معطر ہوگی جو قافلہ بنا کر اس سرزمین سے گزرے (پا جا سراغ زندگی: ۱۲۵)

دارالعلوم دیوبند میں کی گئی یہ تقریر نہایت فکر انگیز اور جوش اور ولولوں سے بھرپور تھی اس کا لفظ لفظ کانوں سے گزر کر کے دل میں اُتر رہا تھا، کسی طالب علم نے اس کو ٹیپ ریکارڈ کی مدد سے نقل کر کے حضرت کو نظر ثانی کے لئے پیش کیا، حضرت کی نظر ثانی کے بعد مجلس تحقیقات ونشریات سے یہ تقریر ''عصر جدید کا چیلنج اور اس کا جواب'' کے نام سے چھپی دارالعلوم دیوبند کے طلبہ کے لئے اس کے کئی سو نسخے آئے اور مفت تقسیم ہوئے، دارالعلوم دیوبند کی اثر پزیری کے تعلق سے حضرت مولانا نے اس تقریر میں جو کچھ ارشاد فرمایا تھا وہ دارالعلوم دیوبند کے صد سالہ اجلاس کی سہ روزہ تقاریب کے پہلے دن اپنے نقطۂ عروج کو پہنچا، لاکھوں فرزندان توحید کے سامنے جن میں ہزاروں کی تعداد میں دارالعلوم دیوبند کے فضلا اور علما بھی تھے انھوں نے فرمایا کہ ''اس درس گاہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے اختلافی مسائل کے بجائے توحید وسنت پر اپنی توجہ مرکوز کی، دوسری خصوصیت اتباع سنت کا جذبہ اور فکر، تیسری خصوصیت تعلق مع اللہ کی فکر اور ذکر وحضوری اور ایمان اور احتساب کا جذبہ، چوتھا عنصر ہے اعلاء کلمۃ اللہ کا جذبہ اور کوشش، یہ چار عناصر مل جائیں تو دیوبند بنتا ہے (زندہ رہنا ہے تو میر کارواں بن کر رہو: ۲۳۱)

علمائے دیوبند سے حضرت مولانا کی عقیدت ومحبت کے جگنو دیکھنے ہوں تو وہ

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

پرانے چراغ اور کاروان زندگی کے صفحات پر چمکتے دمکتے نظر آئیں گے، حضرت دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن رکین تھے، اپنے برادر معظم مولانا ڈاکٹر عبدالعلی کی وفات کے بعد ۱۹۶۲ء میں رکن منتخب کئے گئے اور تا وفات اس منصب پر رہے، اس دوران انھوں نے ندوہ اور دیوبند دونوں کو فکری جہتوں سے ایک دوسرے کے قریب لانے کی جو سعی کی ہے اس کا اعتراف نہ کرنا ناانصافی ہوگی، دارالعلوم دیوبند کی شوریٰ کے رکن کی حیثیت سے حضرت مولانا کو دارالعلوم دیوبند کے مسائل سے بہ طور خاص دل چسپی رہی ہے، آخر میں تقسیم دارالعلوم دیوبند کا جو قضیۂ نامرضیہ پیش آیا اس میں بھی حضرت کا موقف اعتدال اور غیر جانب داری پر مبنی تھا، جب کہ شوریٰ کے اکثر ممبر عملی طور پر دو گروہ بن چکے تھے، خود ان کے دیرینہ رفیق حضرت مولانا منظور نعمانیؒ الفرقان کے صفحات پر برسر اقتدار گروپ کی مخالفت میں مضامین لکھ رہے تھے، ان حالات میں حضرت مولانا کی رائے تھی کہ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ اس دنیا سے اس حالت میں تشریف نہ لے جائیں کہ ان کو دارالعلوم سے اور دارلعلوم کو ان سے جدا کردیا گیا ہو، اس سلسلے میں حضرت مولانا نے کوشش بھی بہت کی، لیکن یہ کوشش بہ قول حضرت مولانا کے اس گروہ نے کامیاب نہیں ہونے دی جس کو قاری صاحب کا وقار ان کا سکون خاطر، اور دارالعلوم سے ان کا ارتباط سب سے زیادہ عزیز ہونا چاہئے تھا (کاروان زندگی: ۳۱۳/۲)

مولانا کو علمائے دیوبند سے جو غایت درجے کا تعلق تھا اس کا اظہار انھوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں بار بار کیا ہے، اسی تعلق نے انھیں شیخ المشائخ حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری، شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا کاندھلوی، حضرت مولانا شاہ وصی اللہ آلہ آبادی کی مجلسوں میں حاضری دینے اور ان کے مواعظ ملفوظات سے استفادہ کرنے پر مجبور کیا، ان بزرگوں سے حضرت مولانا کو اتنا تعلق اور اتنی عقیدت تھی

کہ کبھی آپ ان کے ملفوظات احاطۂ تحریر میں لاتے اور کبھی ان کے حالات زندگی مرتب فرماتے، حضرت مولانا نے اپنے پیر و مرشد حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ کی سوانح حیات بھی لکھی جو ساڑھے تین سو صفحات پر مشتمل ہے، حضرت شیخ الحدیثؒ کے حالات زندگی بھی تحریر فرما کر کتابی شکل میں شائع فرمائے، خود ان حضرات اکابر کو بھی حضرت مولانا سے بے حد تعلق تھا، اُن کے نہ آنے پر انتظار رہتا، تشریف لاتے تو اپنی مجلسوں میں انھیں اپنے قریب بٹھلاتے، اعزاز و اکرام کا پورا پورا معاملہ فرماتے، حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا کاندھلوی تو حضرت مولانا کے بے حد مدّاح و معترف تھے، ایک دفعہ حضرت شیخ الحدیث نے اپنے والا نامے میں تحریر فرمایا، ''بلا تصنع و بلا مبالغہ عرض کرتا ہوں کہ آپ کے تعلق کو اپنے لئے وسیلۂ نجات سمجھتا ہوں'' حضرت مولانا کو مشاہیر علما کرام اور مشائخ عظام سے خواہ وہ ہم عصر ہی کیوں نہ ہوں ملنے کا بے حد شوق تھا، اسی طرح وہ ان سے مسلسل خط و کتابت بھی کرتے تھے، ضرورت پڑتی تو علمی استفادے سے بھی دریغ نہ فرماتے۔

دارالعلوم ندوۃ العلما میں ان کا دور نظامت اس ادارے کا نہایت روشن اور تابناک دور ہے، ندوہ نے اس دور میں بے مثال مادّی اور علمی ترقی کی ہے، اس کی شہرت ہندوپاک کی حدود سے نکل کر مصر و حجاز تک پہنچی، یہاں تک کہ اس ادارے نے ۱۹۷۵ء میں اپنا پچاسی سالہ جشن تعلیمی منعقد کیا جس میں خود حضرت مولانا کی محبت اور عقیدت میں ساری دنیا سے مشاہیر علما اور زعما کشاں کشاں ندوہ میں جمع ہوئے، اس جشن تعلیمی نے ندوۃ العلما کو شہرت کے ساتویں آسمان پر پہنچانے میں کلیدی رول ادا کیا ہے، دیکھنے والوں نے یہ منظر دیکھا ہے کہ دنیا بھر کے مشاہیر علم و فضل و کمال جمع ہیں اور حضرت مولانا پر اس طرح نثار ہو رہے ہیں جس طرح پروانے شمع پر نثار ہوتے ہیں۔

حضرت مولانا علی میاں کی زندگی کا امتیازی پہلو ان کی تصنیفی و تالیفی زندگی

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

ہے، حضرت مولانا کی تصانیف کی کل تعداد پونے دوسو کے قریب بتلائی جاتی ہے، اس میں چھوٹے چھوٹے رسائل بھی ہیں اور تاریخ دعوت وعزیمت جیسی ضخیم کتاب بھی ہے جو پانچ جلدوں پر مشتمل ہے، مولانا کا اصل موضوع تاریخ ہے، وہ بار بار اپنی کتابوں میں خود کو تاریخ کا طالب علم کہتے ہیں، بلاشبہ تاریخ اسلامی میں انھیں اختصاص حاصل تھا، اس موضوع پر ان کی سب سے پہلی تصنیف ''انسانی دنیا میں مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر'' ہے جس نے عرب وعجم میں اپنی مقبولیت کے ریکارڈ توڑے ہیں عربی میں یہ کتاب ''ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین'' کے نام سے ۱۹۵۰ء میں شائع ہوئی تھی اور اب تک اس کے ستر سے زائد قانونی ایڈیشن چھپ چکے ہیں، غیر قانونی ایڈیشنوں کی تعداد اللہ ہی جانتا ہے، اس کتاب کے اُردو ایڈیشن سے حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ نے اپنی خودنوشت سوانح ''نقش حیات'' میں بے شمار اقتباسات نقل کئے ہیں، عربی ایڈیشن پر مشہور عرب عالم اور مصنف سید قطب شہیدؒ کا مقدمہ ہے جس میں انھوں نے کھلے دل سے کتاب کے محاسن کا اعتراف کیا ہے جب یہ کتاب چھپ کر آئی تو ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی نے اس کو صدی کی بہترین کتاب قرار دیا، حضرت مولانا کے بعض رسائل نے جو اگر چہ قامت میں کمتر ہیں لیکن بہ قیمت بہتر کے مصداق عالم عرب کی فکری صورت حال کو زبردست طریقے پر متأثر کیا ہے ایسا ہی ایک رسالہ تھا'' **ردة ولا ابابكر لها**'' حضرت مولانا کا یہ رسالہ عالم عرب میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور لاکھوں کی تعداد میں چھپ کر تقسیم ہوا، اسی طرح کا ایک رسالہ تھا'' **اسمعوها منی صریحة ایها العرب**'' یہ رسالہ بھی عرب نوجوانوں نے لاکھوں کی تعداد میں چھپوا کر گھر گھر پہنچایا حضرت مولانا کی متعدد کتابیں ہندوستان کے مدارس میں بھی داخل درس ہیں، اور ہر سال لاکھوں کی تعداد میں چھپتی ہیں، عالم عرب کے کالجوں اور یونی ورسٹیوں میں بھی پڑھائی جاتی ہیں، اگر ہم یہ کہیں تو غلط نہ ہوگا کہ ماضی قریب میں کسی عجمی عالم نے

عربوں کے ذہن وفکر کو اس قدر متاثر نہیں کیا جس قدر حضرت مولانا نے اپنے افکار سے متاثر کیا ہے، اسی لئے انھیں عربوں میں جو عزت اور شہرت ملی وہ کسی دوسرے عالم اور مصنف کے حصّے میں نہیں آئی۔

مضمون طویل ہوتا جارہا ہے، لیکن ابھی حضرت مولانا کی زندگی کے بہت سے پہلو باقی رہ گئے ہیں جن پر مجھے لکھنا چاہئے، خاص طور پر ہندوستانی مسلمانوں کی قیادت وسیادت کے باب میں حضرت مولانا کے مضبوط اور فعال کردار کے متعلق کچھ نہ لکھنا سخت ناانصافی ہوگی، یہ باب حضرت مولانا کی زندگی کا سب سے زیادہ درخشاں باب ہے، حضرت مولانا نے ہندوستان کے مسلمانوں کے مسائل کے سلسلے میں اپنی سرگرمیوں کا آغاز مسلم مجلس مشاورت کے پلیٹ فارم سے کیا جس کا آغاز دسمبر ۱۹۶۳ میں ہوا تھا، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ، ڈاکٹر سید محمود مرحوم، مولانا منظور نعمانیؒ، مولانا ابواللیث اصلاحیؒ اور دوسرے کئی حضرات اس ملّی سفر میں حضرت مولانا کے ہم رکاب تھے، یہ دور ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ کا نہایت نازک دور تھا، کئی مسائل سر ابھارے کھڑے تھے، ان میں سب سے خطرناک مسئلہ فرقہ وارانہ فسادات کا تھا، ملک کی فضا ان فسادات کی وجہ سے انتہائی مسموم ہوچکی تھی، اور ملک میں مسلمانوں کے لئے نفرتیں بڑھتی جارہی تھیں، ان حالات میں مسلم مجلس مشاورت نے اپنی ولولہ انگیز سرگرمیوں کا آغاز کیا، حضرت مولانا کے سحر انگیز خطبات نے جادو کا کام کیا اور بہت جلد ان خطبات کی گونج عوامی حلقوں سے گزر کر سرکار کے ایوانوں میں سنائی دینے لگی، ان سرگرمیوں نے حضرت مولانا کے سر پر مستقبل کی مسلم قیادت کا سنہرا مگر کانٹوں بھرا تاج رکھا اور وہ حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب کی وفات کے بعد ۱۹۸۳ء میں مسلمانوں کے متحدہ پلیٹ فارم مسلم پرسنل لا بورڈ کے متفقہ صدر قرار پائے، مسلم پرسنل لا بورڈ کے ذریعے اور اپنے حلقۂ پیام انسانیت کے ذریعے جس کا آغاز ۱۹۷۴ء

میں ہوا تھا انھوں نے ایک طرف مسلمانوں کی بے مثال قیادت کا فریضہ انجام دیا دوسری طرف اہل وطن میں اسلام کا آفاقی پیغام پہنچا کر ملک کی فضا میں رواداری کی روح پیدا کرنے کی کوشش کی، حضرت مولانا اپنی عملی زندگی میں کئی سماجی ، علمی اوراصلاحی تحریکوں سے وابستہ رہے ہیں، دینی تعلیمی کونسل اور رابطۂ ادب اسلامی کی دو تحریکیں بھی حضرت مولانا کی عملی زندگی کا اہم عنوان ہیں۔

راقم السطور نے عربی زبان وادب کی تعلیم دارالعلوم دیوبند میں رہ کر حاصل کی ہے، اپنی درسی مصروفیات کے بعد راقم کو اگر کوئی شغف تھا تو وہ حضرت مولانا کی عربی کتابوں کے مطالعے کا شغف تھا، تکمیل ادب اور تخصص کے دو سال ایسے گزرے کہ میں عصر کے بعد پیدل تفریح کے دوران حضرت مولانا کا کوئی عربی مقالہ کوئی عربی رسالہ یا کوئی عربی تحریر ہاتھ میں لے لیتا اور اسے پڑھتا پھرتا تھا، اس زمانے میں حضرت مولانا کی بہت سے عبارتیں مجھے حفظ یاد ہوگئی تھیں، میں حضرت مولانا کے عربی اسلوب نگارش کا زبردست عاشق تھا، ان کی تحریریں بار بار پڑھتا اور لطف اٹھاتا آج حضرت مولانا ہم میں نہیں ہیں لیکن ان کی تصانیف، ان کی خدمات عالیہ کے روشن نقوش سرہ گزر روشن ہیں جو ہم جیسے عاشقان اَبی الحسن "طالبان علوم نبوت" کی رہنمائی کرتے رہیں گے۔

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

عالم، مصنف، صحافی

مولانا محمد عثمان معروفی اعظمیؒ

ہم اپنے بزرگوں کی پرانی نسل کی زیارت نہیں کر سکے البتہ ہم نے اپنے بڑوں سے ان بزرگوں کی سادگی، تواضع، بے نفسی اور انکساری کے بے شمار واقعات سنے بھی ہیں اور ان کی کتابوں میں پڑھے بھی ہیں، بہ ظاہر یہ واقعات ناقابل یقین لگتے ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے گویا ہم قرون اولیٰ کے بزرگوں کے واقعات سن یا پڑھ رہے ہیں، لیکن جب ہم مولانا محمد عثمان معروفی جیسے لوگوں کو دیکھتے تو ہمیں احساس ہوتا ہے واقعی ابھی کچھ لوگ زندہ ہیں جو ہمیں ہمارے بزرگوں کی یاد دلاتے رہتے ہیں، مولانا عثمان معروفی سادگی اور تواضع کا ایک ایسا پیکر تھے جس کی مثال آج کے دور میں مشکل سے ملتی ہے اپنے کسی عمل سے انھوں نے کبھی یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ لائق مدرس رہ چکے ہیں متعدد کتابوں کے مصنف ہیں اور بہترین ادیب ہیں، دیوبند میں ان کی آمد ورفت باقاعدگی کے ساتھ تھی، تقریباً تمام کتب خانوں میں تشریف لے جاتے، دارالکتاب کو بھی اپنی تشریف آوری سے بہرہ مند فرماتے، میں عرض کرتا کہ اب آپ ضعیف ہو چکے ہیں، تشریف آوری میں دقت ہوتی ہے، حساب کتاب کے لئے کسی کو بھیج دیا کریں مگر وہ بڑی انکساری کے ساتھ فرماتے اس بہانے آپ سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ افسوس! کتنے اچھے لوگ کس قدر تیزی کے ساتھ رخصت ہو رہے ہیں۔

مولانا محمد عثمان ۴/نومبر ۱۹۲۸ء کو مئو کے مردم خیز قصبے پورہ معروف میں پیدا ہوئے، مختلف مدرسوں میں ابتدائی تعلیم حاصل کی، ۱۹۴۹ء میں دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہوئے، اور ایک سال یہیں رہ کر فتویٰ نویسی اور خوش نویسی کی مشق کی اسی دوران لکھنؤ یونیورسٹی سے ''فاضل ادب عربی'' کا امتحان پاس کیا، مختلف جگہوں پر بہ سلسلۂ ملازمت مقیم رہے، مدرسہ معروفیہ پورہ معروف میں ۱۹۵۰ئسے ۱۹۶۹ء تک تقریباً ۱۹/سال صدر مدرس کے منصب پر فائز رہے، بعد میں وہ احیاء العلوم مبارکپور منبع العلوم گلاؤٹھی، جامعہ اسلامیہ کلکتہ، جامع العلوم کوپا گنج، جامعہ اسلامیہ سلطانپور ضیاء العلوم پورہ معروف وغیرہ سے وابستہ رہے، ان کی خدمات کا سلسلہ بڑا طویل ہے۔ اب آخری پڑاؤ ان کا سہارنپور میں تھا، جہاں وہ مشہور دینی درس گاہ مدرسہ مظاہر علوم جدید کے ماہ نامہ ترجمان ''مظاہر العلوم'' کے شعبۂ ادارت سے وابستہ تھے اور یہیں انھوں نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

مولانا محمد عثمان معروفی ایک اچھے صحافی، صاحب قلم اور مصنف تھے، ان کی تقریباً اکیس کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں، جن میں سے ''حالات المصنفین'' ''ایک عالمی تاریخ'' اور محاسن التواریخ وغیرہ کتابیں علمی حلقوں میں خاص طور پر مدارس کے طلبہ میں بے حد مقبول ہیں۔ وہ خود ہی کتابیں لکھتے تھے اور خود ہی چھاپتے تھے، دیوبند میں ان کی آمد کا ایک بڑا سبب یہی کتابیں تھیں، جنہیں وہ مختلف کتب خانوں میں دیا کرتے تھے۔ راقم السطور سے مولانا مرحوم کی واقفیت کو بیس سال کا عرصہ ہونے کو ہے، میں نے اس دوران انہیں نہایت خلیق، متواضع، حلیم، بردبار اور ایمان دار پایا، ہم ان سے جو رعایت بھی چاہتے حاصل کر لیتے، کبھی کوئی ضد یا اصرار ان کی طرف سے دیکھنے میں نہیں آیا۔

مولانا اعلیٰ پائے کے کاتب اور خطاط بھی تھے، اس سلسلے میں انہیں جمعیۃ علما ہند کے

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

کل ہند اجلاس ہائے عام منعقدہ میرٹھ (۱۹۶۳ء) گیا (۱۹۶۹ء) دہلی (۱۹۷۲ء) کے موقعوں پر بورڈ اور بینر وغیرہ کی کتابت کے لئے خاص طور پر مدعو کیا گیا اور خصوصی انعامات سے نوازا گیا، تاریخ ہائے وفات وغیرہ لکھنے میں انھیں زبردست مہارت حاصل تھی اس موضوع پر ان کی ایک مختصر مگر محققانہ کتاب ''محاسن التواریخ'' بازار میں دستیاب ہے، ''ایک عالمی تاریخ'' کے نام سے انھوں نے جو گراں قدر کتاب لکھی اسے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ، حضرت مولانا سید محمد میاں دیو بندیؒ اور حضرت مولانا قاضی اطہر مبارکپوریؒ جیسے نام ور محققین نے سراہا ہے اور معارف، برہان اور تجلی جیسے رسالوں نے اس کی افادیت تسلیم کی ہے۔

''ترجمانِ دیوبند'' پر ابھی حال ہی میں انہوں نے اپنے رسالے ''مظاہر العلوم'' میں بڑا وقیع تبصرہ کیا تھا، افسوس میں ان کا شکریہ بھی ادا نہ کر سکا۔

۶؍جون کی شام تک وہ بالکل تن درست تھے، نماز مغرب کے لئے وضو کے بعد وہ حجرے سے باہر نکل رہے تھے کہ دماغ کی رگ پھٹ جانے کے باعث گر پڑے ہسپتال لے جایا گیا اور ۹ بجے شب اپنے مالک حقیقی سے جا ملے، اگلے روز سہارن پور کے مشہور حکیموں والے قبرستان میں دفنکئے گئے، مدرسہ مظاہر علوم (جدید) کے صدر المدرسین حضرت مولانا محمد عاقل صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی، اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے، اعلیٰ علّیین میں بلند درجات عطا فرمائے اور پس ماندگان کو صبر کی دولت سے نوازے۔

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

مدرسہ شاہی مرادآباد کے مہتمم

حضرت مولانا رشید الدین حمیدیؒ

مدرسہ قاسمیہ شاہی مرادآباد شمالی ہند کا ایک معروف اور مقتدر دینی ادارہ ہے، اس ادارے کا شمار ہندوستان کے چند بڑے مدارس میں ہوتا ہے، اپنی خدمات کے لحاظ سے اس ادارے کو عوامی اور علمی حلقوں میں بڑی عقیدت واحترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ مؤرخہ ۲/جون ۲۰۰۱ء کو اس درس گاہ کے مہتمم حضرت مولانا رشید الدین حمیدی نے مدینہ منورہ (زادھا اللہ شرفًا وعزًا) میں طویل بیماری کے بعد داعیٔ اجل کو لبیک کہا، انا للہ وانا الیہ راجعون، دیکھا جائے تو مولانا کی وفات صرف اہل خاندان اور مدرسہ شاہی مرادآباد کے اساتذہ، طلبہ اور ملازمین ہی کا حادثہ نہیں ہے بلکہ ملک کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے ہزاروں مدارس کے اساتذہ، طلبہ اور منتظمین حضرات کے لئے بھی یہ سانحہ زبردست رنج والم کا باعث ہے کہ ان کے درمیان سے ایک ممتاز عالم، ایک قابل منتظم، ایک لائق مہتمم اور ذی فہم قائد چلا گیا، اچھے لوگ بڑی تیزی کے ساتھ رخت سفر باندھ رہے ہیں اور اپنے پیچھے ایک ایسا خلا چھوڑ کر جارہے ہیں جو جلد پُر ہونے والا نہیں ہے۔

مولانا کا تعلق ہنسور فیض آباد، یوپی کے ایک علمی خاندان سے تھا، ان کے والد ماجد

حضرت مولانا حمید الدین فیض آبادی ممتاز عالم دین اور قابل مدرس تھے، مدرسہ عالیہ کلکتہ میں مدتوں شیخ الحدیث کے منصب پر فائز رہے، کلکتہ میں وہ اس قدر مقبول تھے کہ ایک مرتبہ ان کا تقرر بہ سلسلۂ تدریس دارالعلوم دیوبند میں ہوگیا تو کلکتے والے انھیں کسی قیمت پر چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہوئے اور واپس ہی لے کر گئے، مولانا دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن بھی تھے، مولانا رشید الدین کی پیدائش ۱۳۵۲ھ مطابق ۱۹۳۲ء میں ہوئی، دارالعلوم دیوبند میں حضرت مدنی نوراللہ مرقدہ کی وفات کے ایک سال بعد ۱۹۵۸ء میں شیخ الحدیث حضرت مولانا فخر الدینؒ سے بخاری شریف وغیرہ کتابیں پڑھی، دارالعلوم سے فراغت کے بعد انھوں نے مدرسہ فرقانیہ گونڈہ میں ۱۹۶۱ء سے ۱۹۶۳ء تک، پھر زید پور بارہ بنکی میں ۱۹۶۶ء تک تدریسی خدمات انجام دیں، یہاں سے سبک دوش ہونے کے بعد ۱۹۷۵ء تک دارالرشاد بنکی میں مہتمم اور مدرس رہے اور ۱۹۷۵ء سے تاحیات مدرسہ شاہی میں مہتمم کے منصب پر فائز رہے۔

مہتمم کی حیثیت سے وہ مدرسہ شاہی میں بے حد مقبول تھے، اس کا اندازہ وہاں کے مدرسین اور ملازمین کے ان تعزیتی بیانات سے ہوتا ہے جو انہوں نے تعزیتی جلسوں میں دیئے ہیں اور جن کا سلسلہ ہنوز جاری ہے، مدارس سے ان کا رابطہ بے حد مضبوط تھا، ان کے انتقال کے بعد بے شمار مدارس میں ایصالِ ثواب کا اہتمام کیا گیا اور خصوصی تعزیتی جلسوں میں ان کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا۔ مرحوم اچھے صاحب قلم تھے، ان کی ۳ کتابیں مطبوعہ ہیں (۱) حضرت مدنی کے واقعات وکرامات (۲) مکتوبات مدنی سے ماخوذ معارف وحقائق (۳) حضرت شیخ الاسلام نقش حیات کے آئینے میں، ماہنامہ ندائے شاہی میں ''درسِ حدیث'' کا سلسلہ بھی شروع فرمایا تھا جو غالبًا ملی، سیاسی اور انتظامی مصروفیات کے باعث جاری نہ رہ سکا۔

مولانا رشید الدین حمیدیؒ اس سال عمرہ کے لئے تشریف لے گئے تھے، عمرہ

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

کے بعد واپسی کا قصد تھا کہ اچانک شدید بیمار ہو گئے "مستشفیٰ ملک فہد" میں پھیپھڑوں اور گردوں کے علاج کے لئے داخل بھی رہے بیماری کے باعث اس سال حج بھی نہ کر سکے، حج کے بعد صحت یاب ہو گئے تھے، اور یہ ارادہ تھا کہ ہندوستان واپس جائیں مگر دوبارہ بیمار پڑ گئے اور اسی ہسپتال کے انتہائی نگہہ داشت والے شعبے میں رکھے گئے اور وہیں انتقال فرمایا، حق مغفرت کرے، بہ ظاہر سب کچھ آثار مغفرت کے ہیں ان شاء اللہ، طویل بیماری، عمرہ کی ادائیگی، مدینہ منورہ میں قیام، اور اسی پاک سرزمین پر انتقال کی سعادت، حرم نبوی کے امام صاحب کی امامت میں نماز جنازہ، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جنت البقیع میں تدفین ہوئی جو ازواجِ مطہرات، بنات مکرّمات، صحابۂ کرام تابعین عظام، علما، فقہا اور محدثین کا مدفن ہے اور جہاں شب و روز رحمت حق کا نزول رہتا ہے، ان کی وفات الم ناک سانحہ تو ہے ہی لیکن یہ ایک قابل رشک واقعہ بھی ہے اور اس میں پس ماندگان کے لئے تسلی کا بہت کچھ سامان ہے۔

سب سے بڑھ کر یہ واقعہ ہم جیسوں کے لئے نہایت قابل رشک ہے کہ وہ صحت یاب ہو کر مدینہ منورہ سے ہندوستان واپسی کے لئے تیار ہو گئے تھے، اگر چہ ان کے صاحبزادے مولانا اخلد (جو مدینہ منورہ میں مقیم ہیں) مصر تھے کہ حج تک مدینہ منورہ ہی میں قیام کریں، مگر مولانا کو اہتمام کی ذمہ داری کی وجہ سے واپسی کا تقاضا تھا اسی دوران شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مہاجر مدنیؒ کے خلیفۂ خاص حضرت مولانا عبد المنان ملتانی (مقیم مدینہ منورہ) نے خواب میں دیکھا کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں: مولانا رشید الدین سے کہہ دو ان کا سلام ہم تک پہنچتا ہے اور ان کے اقامے (سعودی عرب میں قیام کا اجازت نامہ) کا انتظام کیا جا رہا ہے جب مولانا رشید الدین صاحب کو یہ خوش خبری پہنچی تو انھوں نے مزید قیام کا فیصلہ فرما لیا، اور اس طرح یہ مزید قیام مستقل قیام کی صورت اختیار کر گیا، اللہ تعالیٰ

ہر مسلمان کو ایسی ہی قابل رشک موت سے نوازے۔ ''ترجمانِ دیوبند'' کے ذریعے ہم مولانا مرحوم کے پس ماندگان، تلامذہ اور مدرسہ شاہی کے اساتذہ وطلبہ کو دل کی گہرائیوں سے تعزیت پیش کرتے ہیں اوران کے لئے صبر جمیل کی دعاء کرتے ہیں۔

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

قابل اعتماد اور لائق استناد مفتی

حضرت مولانا عبدالرحیم لاجپوریؒ

مشہور مفتی اور عالم دین ''فتاویٰ رحیمیہ'' کے مؤلف حضرت مولانا عبدالرحیم لاجپوریؒ ۲؍رمضان المبارک ۱۴۲۲ھ مطابق ۱۸؍نومبر ۲۰۰۱ء بہ روز یک شنبہ خالقِ حقیقی سے جا ملے، ان کی وفات کا سانحہ اچانک پیش نہیں آیا بلکہ وہ نہایت ضعیف ہو چکے تھے اور عرصے سے صاحب فراش تھے، انھوں نے کم وبیش سو برس کی عمر میں وفات پائی علمی حلقوں میں یہ خبر رنج وغم کے ساتھ سنی گئی، وہ ایک ممتاز عالم، قابل اعتماد اور لائق استناد مفتی اور محقق تھے، انھوں نے اپنی علمی سرگرمیوں سے یہ ثابت کردیا کہ کچھ بننے کے لئے، یا کچھ کر دکھانے کے لئے کسی بڑی دینی درس گاہ یا کسی مرکزی ادارے سے وابستہ ہونا ضروری نہیں ہے، وہ زندگی بھر گجرات کے مشہور شہر سورت کے قریب واقع راندیر کی ایک مسجد میں خطیب رہے اور وہیں رہ کر انھوں نے درس وتدریس اور فتویٰ نویسی کی خدمت انجام دی۔ ساٹھ ستر سال تک انھوں نے جو قیمتی فتاوے لکھے وہ ''فتاویٰ رحیمیہ'' کے نام سے دس جلدوں میں چھپ کر قبولِ عام حاصل کر چکے ہیں۔

حضرت مفتی صاحب گجرات کے ایک قصبے نوساری میں ۱۳۲۱ھ مطابق ۱۹۰۳ء کو پیدا ہوئے، ان کا سلسلۂ نسب چھبیس پشتوں کے بعد حضرت سیدنا شاہ عبدالقادر جیلانیؒ سے جا ملتا ہے، ابتدائی تعلیم قصباتی طرز کے مطابق اپنے جدامجد

مولانا سید ابراہیم سے اور ان کی وفات کے بعد اپنے والد مولانا سید عبدالکریم سے حاصل کی، اپنے چچا مولانا سید حسام الدین سے کلام پاک حفظ کیا، فارسی تعلیم اپنے والد کے قائم کردہ مدرسے ''مدرسہ محمدیہ'' میں حاصل کی، نوعمری ہی میں بستی کے لوگوں کو آپ پر اعتماد ہوگیا تھا پہلے محلے کی مسجد کا امام مقرر کیا گیا، پھر جامع مسجد کا امام بنادیا گیا، عنفوانِ شباب میں شادی بھی ہوگئی تھی، کچھ گھریلو الجھنیں اور مشکلات بھی تھیں، بہ ظاہر ایسا نہیں لگتا تھا کہ یہ نوجوان حفظ اور فارسی کی تعلیم کے بعد اپنا سلسلۂ تعلیم آگے بھی جاری رکھ سکے گا، لیکن اللہ تعالیٰ نے مدد فرمائی اور راندیر کے مرکزی مدرسہ جامعہ حسینیہ راندیر کے بانی حضرت مولانا محمد حسین راندیری نے آپ کو راندیر بلالیا ویسے تو آپ اس مدرسے میں اپنی خوش الحانی کی وجہ سے امام مقرر ہوکر آئے تھے لیکن اس مدرسے کے تعلیمی ماحول نے آپ کے دل میں حصولِ علم کے لئے طلب صادق کا شعلہ بھڑکایا، چنانچہ پہلے آپ نے تجوید وقرأت کے لئے حضرت مولانا محمد عمر تھانویؒ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا، پھر درسِ نظامی کی تکمیل کی، اس طرح ۱۳۴۹ھ مطابق ۱۹۳۱ء میں بعمر اٹھائیس سال سند فراغت حاصل کی اس موقع پر محدث عصر حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ کی زیر صدارت جامعہ کا سالانہ جلسہ منعقد ہوا، جس میں شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہٗ بھی تشریف فرما تھے۔ اس جلسۂ عام میں جامعہ کے بانی مہتمم حضرت مولانا محمد حسین صاحب نے جو رپورٹ پیش کی اس میں اس طالب علم کے متعلق نہایت وقیع الفاظ استعمال کئے گئے ہیں، رپورٹ ہے:

''مولوی سید حافظ عبدالرحیم لاجپوری چھ سال سے اس مدرسے میں تعلیم حاصل کررہے ہیں، ان کی از ابتداء تا انتہاء عربی تعلیم اسی مدرسے میں ہوئی، نیز سند قرأت بھی اسی مدرسے سے حاصل کرچکے ہیں، نہایت صالح اور ذہین طالب علم ہیں حق تعالیٰ ان کے علم اور عمر میں برکت دے کر اہل گجرات کو ان سے فیض یاب فرمائیں''۔

مزاج میں استقلال اس قدر تھا کہ نوساری سے راندیر جس مسجد میں امام بنا کر لائے گئے تھے مدۃ العمر اسی منصب پر فائز رہے، یہاں تک کہ انتقال سے دس بارہ سال پہلے تک پابندی کے ساتھ یہ ذمہ داری ادا کرنے کے لئے تشریف لے جاتے تھے، جب کثرتِ امراض اور ضعف کی وجہ سے آنا جانا دشوار ہو گیا تب اس منصب سے دست بردار ہوئے۔

یہ مسجد صرف ان کی امامت کا مرکز ہی نہیں تھی بلکہ ایک طرح سے ان کا دارالافتاء بھی تھی جہاں سے پورے گجرات میں فتاویٰ روانہ کئے جاتے تھے، اور لوگ گھر بیٹھے ان سے استفادہ بھی کرتے تھے، آپ فطری طور پر فقہ وفتاویٰ سے مناسبت رکھتے تھے اور طالب علمی ہی کے زمانے سے آپ نے فتاویٰ لکھنے شروع کر دیئے تھے۔ عمر کے ساتھ ساتھ فقہ میں بصیرت اور فتاویٰ نویسی میں مہارت حاصل ہوتی چلی گئی، ایک وقت ایسا آیا کہ فقہ وفتاویٰ میں ان کی شخصیت نے مرکزی حیثیت اختیار کر لی۔

طالب علمی کے زمانے میں بھی اور بعد کے دور میں بھی انھوں نے اپنے زمانے کے مشہور علما سے برابر علمی رابطہ قائم رکھا، اور علمائے کرام بھی ان کے فتاویٰ کی تصدیق وتصویب فرماتے رہے۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ العزیز سے بار بار مراسلت کرتے رہے۔ حکیم الامت حضرت تھانویؒ کو اس مراسلت سے حضرت مفتی صاحب کے وسعت مطالعہ، ذوقِ تحقیق اور فتویٰ نویسی کی صلاحیت سے آگاہی ہوتی رہی، یہی وجہ ہے کہ ۱۳۵۰ء میں جب ایک ایسے شخص کی معرفت جو تھانہ بھون جا رہے تھے مفتی صاحب نے بیعت کے لئے تحریری درخواست پیش کی تو حضرت تھانویؒ نے جواب میں لکھا کہ :

”خدمت سے عذر نہیں، مگر مخدومیت کی صلاحیت اپنے اندر نہیں پاتا اور نفع اس پر موقوف بھی نہیں، اصل چیز اتباع ہے احکام کا اور مشورے کا، سو احکام آپ مجھ

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

سے زیادہ جانتے ہیں اور مشورے کے لئے میں حاضر ہوں جب آپ فرمائیں‘‘۔

حکیم الامت حضرت تھانویؒ سے استفادے کا تعلق برقرار رہا، یہاں تک کہ حضرت تھانویؒ وفات پاگئے۔ آپ کے بعد شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ سے شرفِ بیعت حاصل کیا، اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ مفتی عبدالرحیم صاحب میں تھانوی اور مدنی دونوں خصوصیتیں جمع تھیں۔ احکامِ فقہ پر مضبوط گرفت رکھتے تھے مطالعہ بے حد وسیع تھا۔ مآخذ اور مراجع پر گہری نظر تھی۔ آپ ’’فتاویٰ رحیمیہ‘‘ کا کوئی بھی مسئلہ لے لیجئے اس میں تعمق اور گہرائی نظر آتی ہے۔ جابجا حوالے ملتے ہیں، مسئلے کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہوتا جسے تشنہ چھوڑا گیا ہو، وہ صرف سوال کا جواب ہی نہیں دیتے بلکہ زیرِ بحث مسئلے سے متعلق اس قدر تحقیق وتدقیق کرتے ہیں کہ بعض جوابات دسیوں بیسیوں صفحات پر پھیل جاتے ہیں اور اچھے خاصے رسالے کی شکل اختیار کرلیتے ہیں۔

اکابر علمائے دیوبند نے ان کے ذریعے دیئے گئے فتاویٰ کی ہمیشہ تصدیق اور توثیق فرمائی ہے، چنانچہ ایک مرتبہ آپ نے حضرت تھانویؒ کی خدمت میں لکھا کہ زید کی رائے یہ ہے کہ اگر نماز پڑھنے والے کے سامنے مقبرہ ہو تو نماز میں کوئی مضائقہ نہیں، کیوں کہ یہاں مصلّی اور قبر کے درمیان مقبرے کی دیوار حائل ہے اگر دیوار حائل نہ ہوتی تو نماز مکروہ ہوتی، مگر میرا خیال یہ ہے کہ مقبرہ کی چاروں دیواریں بہ وجہ اتصال قبر کے تابع ہیں، چنانچہ مبتدعین قبر کی طرح جدارِ مقبرہ کو بھی قابلِ تعظیم سمجھتے ہیں، پس اگر کوئی آدمی مقبرہ کی طرف نماز پڑھے گا تو دیکھنے والے کو ضرور شبہ ہوگا کہ یہ شخص شاید تعظیماً اس جگہ نماز پڑھتا ہے، لہٰذا تعظیم کے اشتباہ سے بچنے کے لئے ایسے موقع پر نماز پڑھنے کی ممانعت کرنی چاہیئے‘‘۔ اس کے جواب میں حضرت تھانویؒ نے اپنے مخصوص انداز میں تحریر فرمایا کہ ’’میں بھی اس خیال سے متفق ہوں‘‘۔

یہ سوال وجواب طالب علمی کے دور کے ہیں، معلوم ہوا ہے کہ اس طرح کے

لاتعداد مسائل میں مفتی صاحب نے حضرت تھانویؒ سے مراسلت کے دوران اپنی رائے رکھی اور حضرت تھانویؒ کی طرف سے تائید حاصل کی۔ اسی طرح طالب علمی کے زمانے میں فخر المحدثین حضرت علامہ سید انور شاہ کشمیریؒ سے بھی برابر مراسلت رہی بلکہ حضرت کشمیری سے تو بہ زمانۂ قیام راندیر شرف تلمذ بھی حاصل کیا۔ دارالعلوم دیوبند سے سبک دوشی کے بعد جب پہلی مرتبہ علامہ کشمیریؒ راندیر تشریف لے گئے تو وہاں تقریباً ایک ماہ قیام کیا، اس موقع پر حضرت کشمیریؒ نے جامعہ حسینیہ راندیر کے مہتمم صاحب کی درخواست پر نور الانوار اور شرح وقایہ کے دو سبق پڑھانے منظور کئے اور پندرہ روز تک متواتر درس بھی دیا۔

حضرت مفتی کفایت اللہ دہلویؒ سے بھی برابر رابطہ رہا اور جب بھی کوئی اہم معاملہ ہوتا یا کوئی متنازعہ استفتاء آتا تو اس کا جواب لکھ کر تصدیق کے لئے مفتی کفایت اللہ دہلویؒ کی خدمت میں ضرور ارسال کرتے، چنانچہ ایک مرتبہ مفتی عبدالرحیم صاحبؒ سے دریافت کیا گیا کہ ''حافظ بلا اُجرت تروایح پڑھانے والا نہیں ملتا اور اُجرت لینا دینا جائز نہیں تو پھر ہم تراویح میں قرآنِ مجید کیوں کر سنیں؟''۔ اس کے جواب میں مفتی صاحب نے جو کچھ تحریر فرمایا وہ ان کی فقہی بصیرت کا آئینہ دار ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ''بلاشبہ طاعت پر اجرت لینا اور دینا جائز نہیں، فقہائے متاخرین نے اس حکم سے جن امور کو مستثنیٰ فرمایا ہے ان میں تراویح میں قرآن سنانے پر اُجرت لینے کا مسئلہ شامل نہیں ہے، لہٰذا تراویح میں اُجرت پر قرآن سنانا ناجائز ہے، اس پرفتن دور میں جب کہ لوگوں کو دینی تعلیم سے ایک قسم کی نفرت پیدا ہو رہی ہے حفاظ کی تعداد گھٹتی نظر آتی ہے اور جو ہیں وہ بھی برائے نام حافظ ہیں کیوں کہ تراویح میں سنانا چھوڑ رکھا ہے کہ سنانے میں نہ روپیہ ملتا ہے نہ عزت دیکھتے ہیں، اگر روپیہ ملتا ہے تو مطعون ہونا پڑتا ہے لہٰذا میرے نزدیک اجرت لینے کے لئے جواز کی شکل یہ ہے کہ رمضان کے لئے

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

حافظ کو ثانی امام یا نائب امام اُجرت (تن خواہ) پر متعین کرلیا جائے اور اس کے ذمے تراویح کے علاوہ عشاء وغیرہ ایک دو وقت کی نماز لازم کردی جائے اور چندہ کر کے یا پھر مسجد سے تن خواہ پوری کردی جائے‘‘۔

اس جواب پر حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحبؒ نے لکھا کہ یہ صورت جواز کی ہے کیوں کہ امامت کی اجرت کی فقہاء نے اجازت دی ہے۔ مدرسہ مظاہر علوم کے سابق مفتی حضرت مولانا مفتی محمود گنگوہیؒ نے تحریر فرمایا کہ اصل مذہب تو عدم جواز ہی ہے لیکن حالت مذکورہ میں حیلۂ مذکورہ کی گنجائش ہے۔

ایک زمانے میں بچوں کی دینی تعلیم کے لئے ’’تعلیم الاسلام‘‘ کے نام سے حضرت مولانا کفایت اللہ دہلویؒ نے چار چھوٹے چھوٹے رسالے تحریر فرمائے اور وہ بے حد مقبول ثابت ہوئے مگر مولوی سید جعفر سورتی نے اس سے اختلاف کیا اور اس سلسلے کے مقابلے میں تعلیم المسلمین کے نام سے چار حصے تصنیف کئے، مولانا محمد حسین صاحب راندیری نے تعلیم المسلمین کے مندرجات کا جائزہ لینے اور اس پر نقد کرنے کے لئے مفتی عبد الرحیم لاجپوری کا انتخاب کیا، جنہوں نے اس کا مدلل اور فیصلہ کن جواب لکھا، مگر ساتھ ہی تعلیم الاسلام کی ایک عبارت پر بھی نقد کیا جس سے کچھ ایسا مفہوم ہو رہا تھا کہ اگر مسافر دو رکعت کے بجائے قصداً چار رکعت پڑھ لے اگر اس نے دوسری رکعت پر قعدہ کرلیا ہے تو سجدۂ سہو کر لینے سے نماز ہو جائے گی، تعلیم المسلمین میں جواز صراحتاً مذکور ہے اور تعلیم الاسلام میں پڑھنے والے کو گنہ گار قرار دیا گیا ہے مگر اعادہ کا حکم مذکور نہیں ہے جس سے یہ اشتباہ ہوتا ہے کہ شاید نماز ہو جائے گی، اس سلسلے میں مفتی عبد الرحیم صاحب نے مفتی کفایت اللہ کی خدمت میں اپنا اشکال تحریر فرمایا جواب میں مفتی صاحب نے لکھا ’’تعلیم الاسلام کی عبارت میں سجدۂ سہو کر لینے کے باوجود عمد کی صورت میں گنہ گار ہونے کا حکم موجود ہے جس کا مطلب یہی ہے کہ نماز

واجب الاعادہ ہے اگرچہ وجوب اعادہ کی تصریح سے وہ عبارت بھی قاصر ہے تاہم جتنی عبارت ہے وہ غلط نہیں ہے''۔

راندیر کی کسی مسجد میں صحن مسجد اور فناء مسجد کا تنازعہ کھڑا ہوا تو شہر کے مفتی ہونے کی حیثیت سے مفتی عبدالرحیم صاحب سے استفتاء کیا گیا، ان کے جواب کو اسی شہر کے دوسری مفتی صاحب نے مسترد کردیا، معاملہ سنگین ہوگیا، لوگوں نے دوسرے مفتیانِ کرام کی خدمت میں استفتاء اور دونوں جواب روانہ کردیئے، تمام حضرات مفتیانِ کرام نے مفتی عبدالرحیم صاحب کے جواب کی توثیق فرمائی ان میں مفتی کفایت اللہ دہلویؒ، مفتی سید مہدی حسن سابق مفتی دارالعلوم دیوبند، شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، حضرت مولانا ظفر احمد تھانویؒ وغیرہ حضرات کے نام شامل ہیں۔

مفتی عبدالرحیم صاحب نے کم وبیش ستر برس تک فقہ وفتاویٰ کی خدمت انجام دی ہے، ابتدا میں وہ گجراتی ماہنامہ ''پیغام'' میں قارئین کے سوالات کے جواب دیا کرتے تھے، تقریباً بارہ سال تک یہ سلسلہ جاری رہا اور اس عرصے میں جو فتاویٰ لکھے گئے ان کو ''فتاویٰ رحیمیہ'' کے نام سے دو جلدوں میں شائع کردیا گیا، بعد میں فتاویٰ کا یہ ذخیرہ اس قدر بڑھا کہ اس کے لئے دس ضخیم جلدیں بھی ناکافی رہ گئیں، آج فتاویٰ کی یہ ضخیم کتاب ہر مفتی کے الماری کی زینت ہے اور مأخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ مفتی صاحب نے اختصار سے کام نہیں لیا، بلکہ سوال کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے، حوالے میں صرف کتاب کا نام اور صفحہ ہی نہیں دیا گیا بلکہ اصل عبارت دینے کا التزام بھی کیا گیا ہے، بسا اوقات کسی قول کی تائید کے لئے مختلف کتابوں سے عبارتیں نقل کرکے مفتی حضرات کو بہت سی کتابوں کی ورق گردانی سے مستغنی کردیا ہے، بعض جوابات اتنے تفصیلی ہیں کہ بجائے جواب کے کتاب بن گئے

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

ہیں، جو لوگ کسی ایک موضوع پر بہت کچھ پڑھنا چاہتے ہیں ان کے لئے یہ مجموعہ فتاویٰ بے حد مفید ہے۔

''فتاویٰ رحیمیہ'' کی پہلی جلد ہی سے حضرات علمائے کرام نے کتاب کی اہمیت کا اندازہ لگا لیا تھا، حضرت مولانا مفتی مہدی حسن صدر مفتی دارالعلوم نے پہلی جلد کے مطالعہ کے بعد فرمایا کہ فتاویٰ رحیمیہ صرف عوام ہی کے لئے نہیں بلکہ اہل علم کے لئے بھی بغیر محنت کے مفید ہے، حضرت مولانا سید محمد میاں دیو بندی نے لکھا کہ یہ کتاب محض فتاویٰ نہیں بلکہ مجموعہ رسائل ہے، جو کچھ لکھا گیا ہے وہ پوری تحقیق سے لکھا گیا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کا ذہن فقہ احناف کے سانچے میں ڈھل گیا ہے حضرت مولانا منظور نعمانیؒ نے لکھا کہ اس میں بہت سی مفید چیزیں جمع ہوگئی ہیں، میں اس سے کافی مستفید ہوا، محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نے بھی اس مجموعے کی دل کھول کر تعریف کی، جن حضرات علمائے کرام نے فتاویٰ رحیمیہ کو بہ نظر تحسین دیکھا ان میں حضرت مولانا زکریا کاندھلویؒ اور حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ سمیت بہت سے نام ہیں، جس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ مفتی صاحب کے فتاویٰ نہ صرف عوام میں بلکہ خواص میں بھی مقبول تھے اور پسند کئے جاتے تھے۔

مفتی صاحب نے عمر کا بڑا حصہ راندیر میں گزارا لیکن خاموشی کے ساتھ دین کی خدمت کرتے ہوئے گذارا، اس زمانے میں سورت، نوساری اور دوسرے مقامات پر بہت زیادہ بدعتیں مروّج تھیں جیسے صحن مسجد میں نماز جنازہ پڑھنا، تراویح میں اجتماعی طور پر دعا کرنا، خطبۂ عید کے بعد مل کر دعا مانگنا، انھوں نے ثبات قدمی کے ساتھ لوگوں کی اصلاح کی اور ان کو صحیح راستہ دکھلایا اگرچہ تکلیفیں بھی برداشت کیں مگر استقامت کے ساتھ کام میں لگے رہے، افسوس یہ عظیم شخصیت، موجودہ دور میں فقہ حنفی کا مرجع، اب اس دنیا میں نہیں ہے، راندیر کا قبرستان اب اس کی آخری آرام گاہ بن چکی

ہے جہاں راندیر اور قرب وجوار کے ہزاروں لوگوں نے انھیں بھیگی آنکھوں کے ساتھ ۲؍رمضان المبارک کو نصف شب کے قریب سپردخاک کیا، مگر ''فتاویٰ رحیمیہ'' کی شکل میں جو چراغ انھوں نے روشن کیا تھا وہ اسی طرح نور پھیلاتا رہے گا اور ان کی یادوں کو زندہ رکھے گا۔

اس مقبولیت اور شہرت کے باوجود سادگی اور تواضع میں بزرگوں کے نقش قدم پر تھے۔تقریباً چھ سات سال پہلے گجرات کے ایک سفر کے دوران سورت میں تھا خیال آیا کہ یہاں قریب ہی راندیر میں مفتی عبدالرحیم صاحب رہتے ہیں ان سے ملاقات کرنی چاہیے، جمعہ کا دن تھا، میں جمعہ سے کچھ پہلے مکان پر پہنچا، معلوم ہوا کہ غسل کررہے ہیں، میں ان کے کمرے میں بیٹھ گیا جہاں ہر طرف کتابیں ہی کتابیں بکھری ہوئی تھیں، اتنے میں مفتی صاحب اس شان کے ساتھ زنان خانے میں سے تشریف لائے کہ ان کے دونوں ہاتھوں میں چائے کی ٹرے تھی، نہ میرا ان سے کوئی تعارف تھا اور نہ اس تکلف کا وقت تھا مگر اس کے باوجود وہ محبت اور شفقت سے ملے اور بہ اصرار چائے سے تواضع کی، یہ مہمان نوازی اور ملنے کا یہ متواضعانہ انداز آج تک دل پر نقش ہے، یہ مفتی صاحب سے پہلی اور آخری ملاقات تھی۔

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

بے باک صحافی، پُر جوش قائد

جناب مولانا سید احمد ہاشمیؒ

مولانا سید احمد ہاشمی بھی رخصت ہو گئے ۔۲۲/نومبر ۲۰۰۱ء کی صبح انھوں نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا، وہ ہندوستان کے مسلمانوں کے ممتاز قائدین میں شمار کئے جاتے تھے، وفات سے پہلے کافی دنوں تک بیمار رہے اس طرح ان کی سیاسی سرگرمیاں معطل رہیں، ورنہ وہ ہمیشہ فعال اور متحرک رہنے کے عادی تھے اور جب تک آتش جواں رہا فعال و متحرک رہے۔

مولانا سید احمد ہاشمی ۱۸/جنوری ۱۹۳۲ء میں بہ مقام غازی پور پیدا ہوئے والدین کا انتقال بچپن ہی میں ہو گیا تھا اس لئے آپ کی پرورش بڑے بھائی سید محمد ہاشمی نے کی غازی پور ہی میں انھوں نے مدرسہ دینیہ میں ابتدائی تعلیم حاصل کی، اس کے بعد کلکتہ چلے گئے اور مدرسہ عالیہ سے ممتاز المحدثین کی سند حاصل کی، دورۂ حدیث شریف کی تکمیل کے لئے دیو بند آئے اور دارالعلوم دیو بند سے فراغت پائی، زندگی کا بیشتر حصہ کلکتہ میں گذرا۔

دل میں صحافت اور سیاست کے جذبات موج زن تھے، کلکتے سے ایک ہفتہ واری اخبار ''ارمغان'' نکالا، اس میں نہایت بے باک مضامین اور تبصرے شائع ہوتے تھے بنگال گورنمنٹ نے بعض مضامین کی اشاعت کے خلاف کارروائی کرتے ہوئے اس کے شمارے ضبط کر لئے اور اس کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا۔ ''ارمغان'' پر پابندی کے بعد

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

مولانا ہاشمی نے ''سچ بات'' کے نام سے اخبار کی اشاعت شروع کی، سیاسی اور ملی کاموں نے انھیں جمعیۃ علما ہند کے قریب کیا، مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ سے ذہنی ہم آہنگی تھی اور یہی ذہنی ہم آہنگی کلکتے سے دہلی میں انتقالِ مکانی اور قیام کا سبب بنی، شروع میں جمعیۃ علما ہند کے ایک ورکر اور رضا کار کی حیثیت سے کام کرنے والے شخص نے جنرل سکریٹری کے عہدے تک ترقی کی، یہ منصب انھیں ان کی انتھک محنت، لگن اور ملی کاموں سے انتہائی دلچسپی کے باعث حاصل ہوا، ان کی نظامت کے زمانے میں جمعیۃ علما نے کئی اہم کارنامے انجام دیئے خاص طور پر فرقہ وارانہ فسادات کے بعد مسلمانوں کے زخموں کو مندمل کرنے اور انہیں مالی، مادی اور اخلاقی تعاون فراہم کرنے کے سلسلے میں ان کے رول اور سرگرمِ عمل رہنے کی ہمیشہ تعریف کی جاتی رہی ہے۔

جمعیۃ علما ہند ایک زمانے میں کانگریس کی ذیلی شاخ بن کر رہی ہے، غالباً اسی وجہ سے مولانا ہاشمی بھی سیاسی زندگی کے آغاز میں کانگریس میں شامل رہے دو مرتبہ راجیہ سبھا کے ممبر چنے گئے، پہلی مرتبہ کانگریس کے ٹکٹ پر، دوسری مرتبہ لوک دل کے امیدوار کی حیثیت سے راجیہ سبھا میں آئے۔ ۱۹۷۷ء میں جنتا حکومت کے دور میں دہلی وقف بورڈ کے چیئرمین بنائے گئے، راجیہ سبھا کے رکن کی حیثیت سے مولانا ہاشمیؒ نے اقلیتوں بالخصوص مسلمانوں کے مسائل پر زوردار تقریریں کیں اور مسلم نمائندہ ہونے کا ثبوت فراہم کیا، کاش ان کی وہ تقریریں الجمعیۃ کی فائلوں سے نکل کر کتابی صورت میں چھپ جائیں، اس سے ہمارے زمانے کے بہت سے ممبرانِ پارلیمنٹ کو سبق مل سکتا ہے۔

مولانا ہاشمیؒ سابق وزیر ریلوے جناب جعفر شریف کے دست راست رہے ہیں ان کے دورِ وزارت میں مولانا ہاشمی نے بہت مصروف زندگی گذاری ہے، اس دوران وہ مرکزی ریلوے بورڈ کے ممبر بھی رہے اور بعد میں اس بورڈ کے چیئرمین بھی بنائے گئے۔

مولانا نے بیرونِ ہند کے بھی متعدد اسفار کیے، وہ سرکاری وفود کے ہمراہ سعودی

عرب، کویت، روس، چیکوسلوا کیہ اور یوگوسلاویہ کے دوروں پر تشریف لے گئے۔

میں نے انھیں طالب علمی کے دوران بارہا دارالعلوم میں دیکھا، کئی جلسوں میں ان کی تقریریں سنیں، ایک مرتبہ وہ دارالعلوم میں کسی وفد کے قائد بن کر تشریف لائے، یہ ۱۹۸۰ء کے بعد کا ہنگاموں سے بھرپور زمانہ تھا، دارالعلوم میں تعلیمی سلسلہ ختم ہو چکا تھا، تنازعہ عروج پر تھا، اس وقت وہ دہلی سے ایک وفد لے کر چلے، وفد نے طلبہ، اساتذہ اور دوسرے لوگوں سے ملاقاتیں کیں، مغرب کے بعد دارالحدیث میں ایک جلسہ بھی رکھا گیا جس سے مولانا ہاشمی نے خطاب بھی فرمایا۔

طالب علمی کے بعد مولانا سے چند ملاقاتیں تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند کی مجلس عاملہ کی میٹنگوں میں ہوئیں جس کے وہ بھی رکن رہے ہیں اور راقم السطور بھی رکن ہے، مولانا اس زمانے میں بہت مصروف تھے لیکن گاہے بہ گاہے مجلس عاملہ کے جلسوں میں شرکت فرمالیا کرتے تھے۔

مولانا کی زندگی کا سب سے مایوس کن لمحہ وہ تھا جب وہ اپنی طویل قربانیوں کے باوجود جمعیۃ علما ہند کے ناظم عمومی کے منصب سے معزول کر دیئے گئے، اس کے بعد انھوں نے حضرت مولانا وحید الزماں کیرانویؒ کی صدارت میں ملی جمعیۃ علما ہند قائم کی، مگر ملی جمعیۃ افراد کی کمی کے باعث زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی اور آہستہ آہستہ ختم ہوگئی، اپنی زندگی کے آخری ایام مولانا ہاشمی نے بیماری کے دوران یک سوئی اور خاموشی کے ساتھ گزارے، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے بہت سی خوبیوں کے انسان تھے ملت کے لئے انھوں نے جو خدمات انجام دی ہیں ان کے صلے میں اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں ان کو اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

مفسّر قرآن، شارح حدیث

حضرت مولانا محمد عاشق الٰہی بلندشہریؒ

حضرت مولانا مفتی عاشق الٰہی بلندشہری نے مؤرخہ ۱۲؍ رمضان المبارک ۱۴۲۲ھ مدینہ منورہ میں وفات پائی، حضرت مولانا ہمارے بزرگوں کی صف اوّل میں شمار کیے جاتے تھے، ان کی بزرگی، ان کا تقویٰ، علم دین کی اشاعت سے ان کا شغف، اصلاحِ امت کے لئے ان کی فکر، مسلک دیوبند کے تحفظ کے لئے ان کی تحریری جدوجہد یہ ان کی زندگی کے روشن وتابناک پہلو ہیں، اب پرانی شخصیتیں آہستہ آہستہ رخصت ہوتی چلی جارہی ہیں، جو باقی ہیں وہ بھی رختِ سفر باندھے بیٹھے ہیں، جانا سب کو ہے، لیکن بعض شخصیتیں جاتے جاتے ایسا خلا چھوڑ جاتی ہیں جو کبھی بھرتا ہی نہیں ہے یا مدتوں بعد بھرتا ہے، حضرت مولانا بلندشہری کا شمار بھی ایسی ہی شخصیات میں ہوتا ہے، مولانا اگرچہ ہم میں نہیں رہے مگر ان کی کتابیں، ان کے مضامین، ان کی تالیفات وتصنیفات سب ان کی یادیں زندہ رکھنے کے لئے کافی ہیں۔

حضرت مولانا مفتی محمد عاشق الٰہی بلندشہر کے قصبے بسی کے رہنے والے تھے برنی اس ضلع کا مشہور علمی خاندان ہے، بعض اوقات مولانا اپنے نام کے ساتھ بلندشہری اور بعض اوقات برنی لکھتے تھے۔ ۱۳۴۲ھ میں بسی میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم وطن میں حاصل کی، بعدازاں ۱۳۵۶ھ میں مرادآباد کے مشہور مدرسے "مدرسہ امدادیہ" میں

حصول علم کے لئے تشریف لے گئے، عربی کے ابتدائی درجات کی تعلیم کے بعد علی گڑھ میں ہدایہ اوّلین تک پڑھا، ۱۳۶۰ھ میں مظاہر علوم سہارنپور میں داخلہ لے لیا اور ۱۳۶۴ھ میں دورۂ حدیث شریف سے فراغت پائی۔

فراغت کے بعد ہند وپاک کے متعدد مدرسوں میں تدریسی خدمات انجام دیں، جن میں سے ہندوستان کے چند مدارس یہ ہیں: مدرسہ آثار ولی انبالہ، مدرسہ اسلامیہ کھٹور میرٹھ، مدرسہ کاشف العلوم کلکتہ، مدرسہ حیات العلوم مرادآباد۔ ۱۳۸۴ھ میں پاکستان چلے گئے اور مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع عثمانی کے قائم کردہ مدرسے دارالعلوم کراچی میں مدرس مقرر ہوئے، یہاں تقریباً بارہ تیرہ برس کی تدریسی خدمات کے بعد ۱۳۹۷ھ میں مدینہ منورہ ہجرت فرما گئے۔

مولانا کی تصنیفی خدمات کا دائرہ بڑا وسیع ہے، مختلف موضوعات پر کم وبیش سو کتابیں تالیف فرمائیں جن میں سے بہت سی کتابیں بے حد مقبول ہیں خاص طور پر تبلیغی کتابیں ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں چھپتی ہیں اور پڑھی جاتی ہیں، مثال کے طور پر ''مرنے کے بعد کیا ہوگا'' ایک عام اصلاحی تبلیغی کتاب ہے دنیا کی کئی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے، اس کے مختلف ابواب الگ الگ اور یک جا ہر طرح چھپتے ہیں اُردو زبان میں ہندوپاک وبنگلہ دیش کے کم وبیش پچاس ادارے اس کے دسیوں بیسیوں ایڈیشن ہر سال فروخت کرتے ہیں، اسی طرح ایک چھوٹی سی کتاب ''مسنون دعائیں'' ہے جس کے لاکھوں نسخے اُردو ہندی میں چھپتے ہیں اور عام مسلمان بڑے ذوق وشوق سے اس کتاب میں لکھی گئی دعائیں یاد کرتے ہیں اور پڑھتے ہیں۔

عورتوں کی تعلیم وتربیت کے لئے ان کی متعدد کتابیں ہیں، ابتدائی دور میں انھوں نے ''خواتین کے بیس سبق'' تصنیف کی، جو مدارس کے نصاب میں داخل کی گئی اور بے حد مقبول ہوئی، پاکستان تشریف لے جانے کے بعد ماہنامہ البلاغ کراچی

میں ایک سلسلۂ مضامین شروع کیا جو خاص عورتوں سے متعلق تھا یہ سلسلۂ مضامین لگ بھگ دس بارہ برس جاری رہا بعد میں قارئین البلاغ کے اصرار پر ان مضامین کو کتابی شکل دی گئی۔ پہلے یہ مجموعۂ مضامین ’’تحفۂ خواتین‘‘ کے نام سے پاکستان میں چھپا اور اب ہندوستان میں بھی چھپ چکا ہے۔ ’’تحفۂ خواتین‘‘ بے حد مقبول کتاب ہے، خواتین کے متعدد مدارس میں داخل نصاب بھی ہے، لوگ اسے بہشتی زیور کے ساتھ اپنی بچیوں کو جہیز میں بھی دیتے ہیں، اس میں اسلامی عقائد، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج وغیرہ کے مفصل احکام مذکور ہیں، نکاح، طلاق، خلع اور عدت وغیرہ کے مسائل بھی ہیں، اولاد کی تربیت کے طریقے بھی تفصیل سے لکھے گئے ہیں، خواتین کی دینی اصلاح وتربیت کے لئے یہ بڑی جامع اور مفید کتاب ہے، حقیقت یہ ہے کہ ’’بہشتی زیور‘‘ کے بعد خواتین کے مسائل پر یہ واحد کتاب ہے جو نہایت جامع ہے اور جسے بلا تکلف خواتین کے نصاب کا جزء بنایا جاسکتا ہے۔

بعض کتابیں مولانا کی مدارسِ عربیہ کے نصاب میں بھی شامل ہیں جیسے ’’زاد الطالبین من کلام سید المرسلین‘‘ اور ’’ارشاد الطالبین من کلام رب العالمین‘‘ یہ دونوں کتابیں نہایت جامع اور مختصر ہیں اور ان میں وہ آیات اور احادیث جمع کی گئی ہیں جن کا تعلق اسلامی عقائد اور اخلاق واعمال سے ہے۔

عام مسلمانوں کے لئے بھی ان کی ایک کتاب ’’تحفۃ المسلمین‘‘ کے نام سے چھپ چکی ہے، حج کے موضوع پر بھی ان کے چند رسائل دستیاب ہیں جن میں سے دو کتابیں کتاب الحج اور کتاب العمرہ مشہور ومعروف ہیں، اُردو کے دینی جرائد ورسائل میں ان کے بے شمار مضامین چھپتے رہے ہیں، ہندوپاک کا شاید ہی کوئی ایسا معیاری جریدہ ہو جس میں مولانا کے تبلیغی واصلاحی مضامین نہ شائع ہوئے ہوں، حساس طبیعت کے مالک تھے، کسی بھی دینی معاملے میں کوئی خلافِ شرع بات دیکھتے تو

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

بلاخوف لومۃ لائم تحریر وتقریر کے ذریعہ اس کا رد کرنا ضروری سمجھتے تھے، رد بدعات اور منکرات پر ہمارے دور کی شخصیتوں میں سب سے زیادہ کام مولانا ہی کا ہے۔

آخر میں تفسیر ''انوار البیان'' کے نام سے نو جلدوں میں کلام پاک کی تفسیر لکھی جو ہند و پاک دونوں جگہوں سے شائع ہو چکی ہے، ابھی عوامی اور دینی حلقوں میں اس تفسیر کا مکمل تعارف نہیں ہوا، تفسیر لکھنے کا ارادہ ایک زمانے سے تھا، پہلی جلد کے ابتدائیے میں خود تحریر فرمایا ہے کہ ایک مرتبہ وہ شدید بیمار ہوئے، یہاں تک کہ زندگی کی اُمید بھی نہ رہی، اس عالم میں انھوں نے باری تعالیٰ سے دُعا کی! یا اللہ ابھی مجھے نہ بلائیں، ابھی تو مجھے قرآنِ کریم کی تفسیر بھی لکھنی ہے، اللہ تعالیٰ نے صحت دی، لیکن دوسری مشغولیتوں کی موجودگی میں تفسیر کا کام نہ ہو سکا یہاں تک کہ ستر سال کی عمر آ گئی خیال آیا کہ ابھی تو اللہ تعالیٰ سے کیا ہوا وعدہ پورا کرنا ہے چنانچہ عمر کی اس منزل پر پہنچ کر جہاں لوگ تھک جاتے ہیں انہوں نے تفسیر کا کام شروع کیا، اسے نو جلدوں میں مکمل کیا، خدا کے فضل وکرم سے وہ تمام جلدیں ان کی زندگی میں چھپ کر شائع ہو چکی تھیں۔

مدینہ منورہ میں وہ ہند و پاک سے تعلق رکھنے والے اردو داں مسلمانوں کا مرجع تھے، کسی کو کوئی پریشانی ہو، کوئی مسئلہ معلوم کرنا ہو وہ بلا تکلف ذاتی طور پر حاضر ہو کر یا ٹیلیفون کے ذریعے رابطہ قائم کر لیتا، مدینہ منورہ حاضری دینے والے علمائے کرام ان کے یہاں خاص طور پر مدعو کئے جاتے تھے، وہ عام زندگی میں بہت متواضع اور ملنسار انسان تھے، مہمان نوازی مزاج کا حصہ تھی، حج وعمرہ کے ایام میں شاید ہی کوئی وقت ایسا جاتا ہو جب ان کے دستر خوان پر کوئی مہمان مدعو نہ ہوتا ہو۔

میرے ایک عزیز بہ سلسلۂ ملازمت مدینہ منورہ میں مقیم ہیں، وہ مولانا بلند شہری کی بلند ہمتی، اعلاظرفی، وسیع القلبی اور خورد نوازی کے بے حد معترف اور مداح نظر آئے میرے یہ عزیز ایک بلڈنگ کے فرسٹ فلور پر رہتے ہیں جہاں تک پہنچنے کے لئے کوئی

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

لفٹ وغیرہ نہیں ہے صرف زینوں کے ذریعے اوپر جایا جاسکتا ہے، مگر اس کے باوجود وہ ان کے مکان پر آتے رہے، حالانکہ چلنے پھرنے میں تکلیف ہوتی ہے، کسی مضبوط سہارے کے بغیر چڑھنا ان کے لئے ممکن ہی نہیں ہے، پچھلے سال کسی موقع پر ہندوستان سے حضرت مولانا محمد سالم قاسمی مدینہ منورہ پہنچے تو میرے ان عزیز نے موقع سے فائدہ اُٹھا کر ان کا وعظ اپنے مکان پر رکھا جس میں کچھ ہندوستانی مرد وخواتین بھی جمع ہوگئے، مولانا بلندشہری کو پتہ چلا تو وہ جسمانی عوارض واعذار کے باوجود وعظ میں شرکت کے لئے تشریف لائے، یہ واقعہ علمائے دیوبند سے ان کی محبت کی دلیل اور معاصرانہ وسیع القلبی کا مظہر ہے۔

۱۹۹۴ء میں حج سے فراغت کے بعد مدینہ منورہ حاضری ہوئی، ایک روز فجر کی نماز کے بعد روضۂ مبارک کے باہر اقدامِ عالیہ کی جانب دیوار سے کچھ ہٹ کر ایک بزرگ وہیل چیئر پر بیٹھے کچھ پڑھتے نظر آئے، دل بے اختیار ان کی طرف کھنچا، ایک نوجوان سے جوان کے قریب کھڑے ہوئے تھے میں نے پوچھا کہ یہ بزرگ کون ہیں انھوں نے بتلایا کہ یہ مولانا عاشق الٰہی بلندشہری ہیں، بس یہ ایک جھلک تھی جو مجھے خوش قسمتی سے میسر آگئی، نام مدتوں سے سنا ہوا تھا زیارت سے ایک گونہ خوشی ملی مصافحے کا شرف حاصل نہ ہوسکا۔

مولانا بلندشہریؒ جیسے لوگ کم ہی پیدا ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو اصلاح کے ایک مخصوص کام کے لئے موفّق فرمایا تھا، انھوں نے یہ کام اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعے بہ خوبی انجام دیا، اللہ تعالیٰ غریق رحمت فرمائے، حرم نبوی میں نماز جنازہ پڑھی گئی، جنت البقیع میں مدفون ہوئے، یہ عظیم سعادتیں خوش نصیبوں اور نیک بختوں ہی کو حاصل ہوتی ہیں، اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان عظیم سعادتوں سے نوازے۔

دیوبند کے ایک نیک سیرت انسان

حافظ محمد اکرام الٰہی دیوبندیؒ

۹؍جنوری ۲۰۰۲ء کو حافظ محمد اکرام الٰہی دیوبندی نے میرٹھ کے قصبہ سٹھلہ میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے، حافظ صاحب بزرگوں کی اس نسل سے تعلق رکھتے تھے جس کے افراد اب آہستہ آہستہ اُٹھتے چلے جارہے ہیں، ابھی چند سال پہلے تک شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے شاگردوں اور عقیدت مندوں کی خاصی تعداد زندہ تھی اب اس میں سے بے شمار لوگ اللہ کو پیارے ہوگئے ہیں اور جو لوگ بہ قیدِ حیات ہیں وہ انگلیوں پر شمار کئے جاسکتے ہیں، حافظ صاحب مرحوم بھی حضرت مدنیؒ کے عقیدت مندوں میں سرفہرست تھے، ان کے انتقال سے علم وعمل کی دنیا میں ایک ایسی کمی پیدا ہوئی ہے جو عرصے تک محسوس کی جائے گی۔

حافظ محمد اکرام الٰہیؒ دیوبند کے شیوخ برادری کے عثمانی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے، اُن کے والد دیوبند کے معروف زمیندار نمبردار محمد منعم تھے حافظ صاحب کی پیدائش ۱۹۲۶ء میں ہوئی، دارالعلوم دیوبند میں پیر جی شریف احمد صاحبؒ کے یہاں حفظ قرآن کی تکمیل کی اور مزید علوم کی تحصیل میں مشغول ہوگئے دورانِ طالب علمی ہی شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے عقیدت مندوں میں شامل ہوگئے، یہ تعلق اتنا مربوط اور مضبوط تھا کہ ''فنا فی الشیخ'' ہوکر رہ گئے تھے

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

اپنے شیخ سے قریب تر رہنے کی غرض سے مدنی مسجد دیوبند میں امامت کے فرائض بھی انجام دینے لگے۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کو بھی اُن سے جو تعلق تھا وہ مثالی تھا، وہ انھیں اولاد کے مانند عزیز رکھتے تھے، نمازِ تہجد میں جب اُٹھتے تو حافظ صاحب مرحوم کو بھی اپنے ساتھ اُٹھا دیتے اور کبھی دورانِ نماز اور کبھی نماز سے الگ قرآن کا دور کراتے، اکثر و بیشتر ایک ایک رات میں آٹھ آٹھ دس دس پارے سنتے یا سناتے۔

حافظ اکرام صاحبؒ نے شیخ الاسلام سے والہانہ تعلق کی بنا پر اپنے گھر بار تک کو چھوڑ دیا تھا، ایک لحظہ بھی شیخ کی خدمت سے غافل نہ ہوتے تھے، شیخ کے حکم کو حرفِ آخر سمجھتے تھے، یہی وجہ ہے کہ جوانی کے بالکل ابتدائی ایام میں شیخ کے کہنے پر سٹھلہ جیسی دور اُفتادہ سرزمین سے وابستہ ہوگئے اور تادمِ حیات (باون سال) اس تعلق کو قائم رکھا اور مورخہ ۹ رجنوری ۲۰۰۲ء کو یہیں پر اپنی جان جان آفریں کے سپرد کردی، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے اور رحمتوں سے سیراب کرے۔ آمین

حافظ صاحب مرحوم واقعی طور پر نہایت نیک، شریف النفس اور اخلاص وعمل کے پیکر تھے، سٹھلہ ضلع میرٹھ میں پٹھان اکثریت بستی ہے، اب سے نصف صدی قبل اُس دور کے صاحب کرّ وفر، ذی اثر زمین دار شخصیات کے سامنے ان کی مرضی کے خلاف کوئی بات کرنا یا کسی حق بات کہنے کی جرأت کرنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں تھی۔

باشندگانِ سٹھلہ علم سے کوسوں دور تھے، اُن میں علم کی قندیل روشن کرنے کی ہمت ہر کوئی نہیں کرسکتا تھا، چنانچہ جب وہاں مولانا محمد اسلام قاسمی صاحبؒ نے مدرسے کی داغ بیل ڈالی تو انہوں نے اپنی مدد کے لئے مولانا مدنیؒ سے ایسے شخص کو مانگا جو مستقل مزاجی کے ساتھ اس بے آب وگیاہ زمین میں علم کی فصل اُگا سکے، اسکے لئے

مولانا مدنیؒ کی نگاہِ انتخاب حافظ صاحب پر پڑی، حافظ صاحبؒ نے شیخ کے حکم کی تعمیل میں اس فریضے کو بہ حسن وخوبی ادا کیا اور عمر عزیز اس بستی ہی کی نہیں بلکہ اطراف وجوانب کی اصلاح پر صَرف کردی، الحمد للہ آج اُن کے شاگردوں کا جال ملک وبیرونِ ملک تک پھیلا ہوا ہے جو شمع سے شمع جلا کر اس بستی کا نام روشن کئے ہوئے ہیں اور حافظ صاحب کے لئے صدقۂ جاریہ کا کام انجام دے رہے ہیں۔

اس دورِ حرص وہوس میں انہوں نے تقوے کے جو مظاہرے کئے وہ بھی اپنی مثال آپ ہیں، اپنی زندگی میں مدرسہ سے لی ہوئی تمام تنخواہوں اور دیگر مدات میں لی ہوئی رقومات کو لوٹانے کے لئے انہوں نے اپنے حصے کی زمین اور باغ فروخت کر کے مدرسہ کا تمام حساب بے باق کردیا تھا اور بقیہ زندگی بلا معاوضہ مدرسہ کی خدمت انجام دینے کے لئے وقف کردی تھی، اپنے دیرینہ رفیق مولانا سمیع اللہ قاسمی صاحبؒ صدر مدرس مدرسہ ہٰذا کے انتقال (اکتوبر ۹۹ء) کے بعد اُن کی ہمتیں پست ہوگئی تھیں اور اس صدمہ سے وہ اندرونی طور پر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوگئے تھے وہ اگرچہ زندگی کے آخری ایام میں مختلف امراض کے غلبے کی وجہ سے عملی جدوجہد کے قابل نہیں رہے تھے لیکن ہر ممکن حد تک اصلاح کا فریضہ انجام دیتے رہتے تھے۔ اپنے شاگردوں اور معتقدین کو علم وعمل کی تلقین کرتے رہتے تھے، معروفات کے حکم اور منکرات سے روکنے میں زندگی بھر وہ کسی مصلحت کے قائل نہیں رہے، وہ جب جہاں کوئی بات خلافِ شریعت دیکھتے اُس کو بَرملا کہہ دیتے۔

۹/جنوری ۲۰۰۲ء کو سرزمین سٹھلہ اس عظیم شخصیت سے ہمیشہ کے لئے محروم ہوگئی، لیکن اُن کے لگائے ہوئے تناور درخت کی چھاؤں انشاء اللہ تا قیامت باقی رہے گی، حقیقت یہ ہے کہ باشندگانِ سٹھلہ نے بھی ''حافظ جی'' مرحوم سے جس تعلق کا ثبوت دیا وہ بھی قابل تقلید ہے، اُن کا مدرسہ اس حیثیت سے اُن کی زندگی میں ممتاز رہا

کہ کبھی انھوں نے اس کا چندہ عوامی طور پر نہیں کیا، وہ صرف ایک سالانہ جلسہ کرتے اور اُس موقع پر جس سے جتنا چاہتے اُتنا چندہ لیتے، اہل بستی اور اُن کے معتقدین بہ رضا و رغبت یہ چندہ دیتے، اس طرح مدرسہ کے ایک سال کے اخراجات پورے ہو جاتے، اگر کبھی درمیان سال میں کچھ ضرورت پڑتی تو وہ اپنے شاگردوں کے پاس مختلف شہروں میں جاتے اور مدرسہ کی ضروریات کی تکمیل کی طرف توجہ دلاتے اور ان سے بہت ہی آسانی کے ساتھ جتنا چاہتے وصول کرلاتے۔

اُن کے انتقال سے جو خلا پیدا ہوا ہے اُس کا پُر ہونا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے، انہوں نے دو شادیاں کیں اولاد کی نعمت سے محروم رہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے روحانی اولاد میں بہت برکت دی، انشاء اللہ اُن کی یہ روحانی اولاد اُن کے جلائے ہوئے علمی دیئے کو روشن تر کرے گی جس کی وجہ سے اُن کی یاد اور اُن کی خدمت تادیر زندہ رہے گی۔

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

کتابِ زندگی کے آخری باب کا اختتام

حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ

یہ نظامِ قدرت ہے کہ اس کائنات میں کچھ خاص لوگ کسی نہ کسی خاص کام کے لئے پیدا کئے جاتے ہیں۔ شروع ہی سے ان کی طبائع اس مخصوص کام کے لئے موفّق ہوتی ہیں اور وہ اسے خدا کی مدد اور نصرت سے پایۂ تکمیل تک بھی پہنچاتے ہیں، ایسی ہی توفیق یافتہ شخصیات میں حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی کا بھی شمار ہوتا ہے جنھوں نے طویل بیماری کے بعد ۴؍اپریل ۲۰۰۲ء کی شام نئی دہلی کے اپولو ہاسپٹل میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا، قاضی صاحب کا سانحۂ ارتحال اچانک ہی پیش نہیں آیا وہ کئی سال سے بلڈ کینسر جیسے مہلک اور موذی مرض میں گرفتار تھے، کئی مرتبہ بیماری کا شدید حملہ ہوا، بچنے کی کوئی امید نہ رہی، مگر زندگی باقی تھی، مرض میں کچھ تخفیف ہوئی، سہارا لے کر چلنے پھرنے لگے، اور پہلے کی طرح ملّی اور علمی سرگرمیوں میں مصروف ہوگئے اس مرتبہ بیماری کا حملہ کچھ زیادہ ہی شدید تھا، تیمارداروں نے رات دن ایک کردیا بہت سے لوگوں نے موصوف کی بیش قیمت زندگی بچانے کے لئے اپنا قیمتی خون بھی پیش کیا لیکن قضاوقدر کے فیصلوں کے آگے ایک نہ چلی اور اس طرح ایک عظیم شخصیت کی سنہری اور روشن زندگی کی کتاب کا آخری باب تمام ہوا۔

اس وقت جب کہ ہندوستان کے مسلمان اپنی تاریخ کے نہایت نازک دور

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

سے گزر رہے ہیں ان کی ذات بڑی غنیمت تھی، وہ ایک ایسے درخت کی طرح تھے جس کی ٹھنڈی اور گھنی چاؤں میں مسائل کی حدت سے تپتے اور جھلستے لوگ دم لیا کرتے تھے، ماضی قریب میں ان جیسا متبحر عالم دین، وسیع النظر فقیہ، قادر الکلام مقرر، بے مثال مصنف اور محقق، بے لوث اور مخلص قائد نہیں گزرا، وہ اپنی ذات سے ایک انجمن تھے، ان کی وفات سے نہ صرف علمی دنیا میں خلا پیدا ہوا ہے بلکہ ملی سیاست میں بھی ایک ایسی کمی واقع ہوئی ہے جو عرصۂ دراز تک محسوس کی جائے گی، بہت سے لوگ جب دنیا چھوڑتے ہیں تو کوئی آنکھ نم نہیں ہوتی، بہت سے لوگوں کے مرنے پر صرف ان کے عزیز وقریب آہ وبکا کرتے ہیں مگر کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کی وفات کا دُکھ پوری قوم محسوس کرتی ہے، حقیقت یہ ہے کہ قاضی صاحب کے انتقال نے پوری ملت اسلامیہ کو سوگوار کردیا ہے، عام لوگ اس لئے بے چین ہیں کہ انہوں نے ایک عظیم مدبر، ایک مخلص رہنما اور ایک پرجوش قائد کھودیا ہے، اہل علم اس لئے بے قرار ہیں کہ ان کے درمیان سے ایک بے مثال عالم، اور عظیم المرتبت محقق اُٹھ کر چلا گیا ہے، ہر آنکھ نم ہے، ہر دل غم زدہ ہے، اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ قاضی صاحب کی رحلت کا غم دور دور تک محسوس کیا گیا ہے اور بلا اختلاف مسلک ومشرب سب نے محسوس کیا ہے۔

وہ ایک ایسے وقت رخصت ہوئے جب سب کو ان کی ضرورت تھی، ملک کی نازک اور پیچیدہ صورتِ حال سے سب بے چین وبے قرار تھے، اور سب کی نگاہیں اپنے قائدین کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ قاضی صاحب کی حیثیت ان سب میں ممتاز اور جداگانہ تھی۔ لوگ منتظر تھے کہ وہ کب اپنے لب کھولیں گے اور ملت کے زخموں پر لفظوں کا مرہم رکھیں گے مگر وہ تو گہرے سکوت میں تھے۔ طوفان آیا گزر گیا۔ شاید قاضی صاحب ۱۵/ مارچ کے اس طوفانِ بلاخیز سے بے خبر ہی رہے اور اسی حالت میں

دنیا سے رُخصت بھی ہو گئے۔

مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی دارالعلوم دیو بند کے ان مشاہیر علما میں سے تھے جو دین کی حفاظت واشاعت کے لئے اپنے مخلصانہ جذبے، ملت کی خدمت کے لئے اپنی بے پناہ جدو جہد اور اَن تھک محنت کے لئے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے، وہ اگرچہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں مگر انھوں نے اپنے عمل سے پیچھے آنے والوں کے لئے جو رہ گزر روشن کی ہے وہ ملک وملت کی خدمت کا جذبہ رکھنے والے مسافروں کو ہمیشہ ان کی یاد دلاتی رہے گی، وہ صرف نام کے مجاہد نہیں تھے بلکہ اسم بامسمیٰ تھے جدو جہد ان کی زندگی کا لازمی حصہ تھی، اور اسی مسلسل جدو جہد کی بہ دولت وہ بہت سے اعلا مناصب پر فائز ہوئے، یہاں تک کہ آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ جیسے باوقار ادارے کے صدر بنے، ان کا خاندانی پس منظر ایسا نہیں تھا جس کے حوالے سے لوگ اپنا کوئی مقام بنا لیتے ہیں ان کے پاس جو کچھ تھا، یا انھوں نے اپنی چھیاسٹھ سالہ زندگی میں جو کچھ حاصل کیا وہ اپنے فکر و عمل سے حاصل کیا، اپنی محنت، لگن، جذبے اور شوق سے پایا، بلاشبہ ان کی زندگی ان لوگوں کے لئے ایک مثال بن گئی تھی جو خاندانی بیساکھیوں سے محرومی کے باوجود اپنا کوئی مقام بنانا چاہتے ہیں۔

مولانا مجاہد الاسلام قاسمی ضلع دربھنگہ بہار کے ایک علمی گھرانے میں ۹/ اکتوبر ۱۹۳۶ء کو پیدا ہوئے، ان کے والد ماجد مولانا عبد الاحد قاسمی حضرت شیخ الہندؒ کے شاگرد اور دارالعلوم دیو بند کے فاضل تھے، علاقے کے ممتاز علما میں ان کا شمار کیا جاتا تھا ابتدائی تعلیم انھوں نے اپنے والد سے حاصل کی، پھر مدرسہ امدادیہ دربھنگہ اور مدرسہ محمود العلوم دَملہ میں پڑھا، متوسط درجات کی تعلیم کے لئے دارالعلوم مئوناتھ بھنجن میں داخل ہوئے پھر دارالعلوم دیو بند آئے اور یہاں حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ سے شرفِ تلمذ حاصل کیا اور ۱۹۵۵ء میں دورۂ حدیث سے فراغت پائی، دارالعلوم

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

دیوبند سے فراغت کے بعد پنجاب یونی ورسٹی سے عربی آنرز کا امتحان فرسٹ کلاس سے پاس کیا، اس زمانے میں پنجاب یونی ورسٹی نے دارالعلوم دیوبند کی سند کو بی، اے کے مساوی قرار دیا تھا، طالب علمی کے زمانے ہی میں اپنی علمی لیاقت اور صلاحیت کی بنیاد پر شہرت پا چکے تھے، اسی لئے جامعہ ازہر مصر میں داخلے کے لئے منتخب کئے گئے مگر جانہ سکے، حضرت شیخ الاسلامؒ کے حکم اور مولانا منت اللہ رحمانیؒ کی خواہش پر مونگیر جانا طے پایا، وہاں جامعہ رحمانی مونگیر میں شعبۂ عربی کے استاذ مقرر ہوئے، اس ادارے میں انھوں نے شعبۂ عربی کی ابتدائی کتابوں سے لے کر دورۂ حدیث شریف تک ہر فن کی کتابیں پڑھائیں۔ ۱۹۶۰ء میں امارت شرعیہ بہار واُڑیسہ کے قاضی مقرر ہوئے امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانی کو قاضی صاحب کی صلاحیتوں پر مکمل اعتماد تھا اس لئے انہوں نے قاضی صاحب کو نہ صرف امارت شرعیہ کا قاضی بنایا بلکہ اس کا ناظم اور خازن بھی مقرر کیا، اور اس طرح انھوں نے عملی میدان میں قدم رکھا اور سماجی خدمت کے لئے خود کو وقف کیا۔

امارت شرعیہ کے پیغام کو عام کرنے اور اس کی خدمت کا دائرہ وسیع کرنے میں قاضی صاحب کی مسلسل جدوجہد کو بڑا دخل ہے، جس وقت انہوں نے اس ادارے کی مختلف ذمہ داریاں سنبھالیں اس وقت اس کا دائرہ کار محدود اور وسائل مختصر تھے، لیکن قاضی جی نے اس کی توسیع میں زبردست حصہ لیا اور اس تحریک کو ایک ایسی قوت میں تبدیل کردیا جس نے بہار واُڑیسہ کے مسلمانوں کی سماجی زندگی کو شریعت کے ساتھ ہم آہنگ کرنے میں غیر معمولی کردار ادا کیا ہے۔ وہ اس اہم منصب پر لگ بھگ پینتیس برس تک فائز رہے اور اس عرصے میں انھوں نے نکاح، طلاق اور وراثت سے تعلق رکھنے والے بے شمار تصفیہ طلب امور میں شریعت کے مطابق فیصلے کئے اور فریقین کے لئے اسلامی قانون کے مطابق زندگی گزارنے کی راہ آسان کی۔

مولانا منت اللہ رحمانی کو قاضی صاحب کی اصابت رائے، صلابت فکر اور وسعت نظر پر پورا بھروسہ تھا، ایک طرح سے وہ ملّی اور سماجی کاموں میں ان کا دست و بازو سمجھے جاتے تھے، یہی وجہ ہے کہ جب ۱۹۷۲ء میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ قائم ہوا اور حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ اس کے پہلے صدر اور حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ اس کے اوّلین جنرل سکریٹری بنائے گئے تو قاضی صاحب بورڈ کے تاسیسی اور فعال رکن کی حیثیت سے اس میں شریک رہے اور انھوں نے اس کی خصوصی اور عمومی نشستوں میں مسلم پرسنل لا سے تعلق رکھنے والے مختلف فکری، فقہی اور سیاسی پہلوؤں پر اپنی بصیرت افروز تقریروں اور تحریروں کے ذریعے نمایاں مقام حاصل کیا، حضرت مولانا ابوالحسن علی میاں ندویؒ کی وفات کے بعد ۱۹۹۹ء میں ۱۵۱ رکنی بورڈ نے آپ کو اتفاقِ رائے کے ساتھ صدر منتخب کیا، افسوس مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر کی حیثیت سے ان کی مدتِ کار بے حد مختصر رہی مگر اس عرصے میں مختلف مسائل پر انہوں نے اپنی مضبوط گرفت برقرار رکھی، اور بورڈ کا وقار بحال رکھنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا خاص طور پر بابری مسجد کے متعلق مسلم پرسنل لا بورڈ کے نقطۂ نظر کو انہوں نے بار بار نہایت مدلل اور مضبوط طریقے پر قوم کے سامنے رکھا یہاں تک کہ وفات سے چند روز پہلے بھی پوری کے شنکراچاریہ کے ساتھ بابری مسجد کے موضوع پر بات چیت کی اور ان کے سامنے اسی موقف کا اعادہ کیا جو ملت اسلامیہ کا مشہور موقف ہے، یہ گفتگو اگرچہ ناکام رہی مگر اس ملک کی اکثریت کو ایک بار پھر یہ معلوم ہو گیا کہ مسلمان بابری مسجد کے تعلق سے کیا چاہتے ہیں اور کس طرح سوچتے ہیں۔

عالمی سطح پر بدلتے ہوئے حالات کے تناظر میں آپ نے محسوس کیا کہ جدید مسائل پر شریعت مطہرہ کی روشنی میں غور و غوض کرنے اور نتائج اخذ کرنے کے لئے اس ملک میں کوئی ایسا ادارہ ضرور ہونا چاہئے جس میں شریک مفتیانِ کرام جدید مسائل

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

کے شرعی حل کے دریافت کے لئے مسلسل کام کریں، اسی احساس نے ۱۹۸۹ء میں فقہ اکیڈمی کی بنیاد رکھوائی، آگے چل کر یہ ادارہ نہایت فعال اور کامیاب ثابت ہوا اور اس نے بہت سے مشکل مسائل میں شرعی نقطۂ نظر واضح کرنے میں اہم کردار ادا کیا فقہ اکیڈمی سے ملک کے قابل اور جیّد مفتیانِ کرام وابستہ رہے ہیں، اب تک اس ادارے نے ملک کے مختلف حصوں میں تیرہ سیمینار منعقد کئے ہیں جن میں چالیس عنوانات پر مقالات پڑھے گئے، ان کا تجزیہ کیا گیا اور اختتام پر تجاویز اور سفارشات مرتب کر کے وسیع پیمانے پر تبادلۂ خیال کے لئے پیش کی گئیں، ان تمام سیمیناروں میں جو مقالات پڑھے گئے ہیں وہ سب مطبوعہ شکل میں دستیاب ہیں ان کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ قاضی صاحب دورِ جدید کے تقاضوں سے پیدا شدہ مسائل کے حل کے لئے نہ صرف خود غور وفکر کرتے تھے بلکہ ملک بھر کے علما اور مفتیانِ کرام کو دعوت فکر بھی دیا کرتے تھے، فقہ اکیڈمی کے سیمیناروں میں نہ صرف ہندوستان کے دینی مدارس سے وابستہ علمائے کرام نے حصہ لیا بلکہ پاکستان، کویت، شام اور قطر کے اہل علم بھی گاہے بہ گاہے تشریف لائے اور انہوں نے فقہ اکیڈمی کے طریقۂ کار کی تحسین کی اور اس کے طرز پر اکیڈمیاں قائم کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔

فقہ اکیڈمی نے نوجوان مفتیانِ کرام اور طلبۂ مدارس کے لئے تربیتی کیمپوں اور فقہی مذاکروں کا انتظام بھی کیا اور بعض جدید موضوعات پر ماہرین فن حضرات کے لکچرس بھی کرائے جنہیں دہلی، بمبئی، بنگلور اور حیدرآباد وغیرہ جیسے بڑے شہروں میں دل چسپی کے ساتھ سنا گیا، اکیڈمی کے قیام کو صرف بارہ تیرہ برس گزرے ہیں لیکن اس ادارے نے تحقیق کی نئی راہیں کھولی ہیں اور بہت سے موضوعات پر زبردست مواد فراہم کر دیا ہے، فقہ اکیڈمی کا بڑا کارنامہ بہت سے ایسے نوجوان مفتیانِ کرام کو علم وتحقیق کے میدان میں نمایاں کرنا ہے جو سازگار ماحول دستیاب نہ ہونے کے باعث

گوشۂ گمنامی میں پڑے ہوئے تھے اور آج وہ تحقیق کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دے رہے ہیں۔

فقہ اکیڈمی کا ایک زبردست کارنامہ جو طباعت کے مراحل سے گزر رہا ہے وہ کویت سے شائع ہونے والے فقہی انسائیکلو پیڈیا کا اُردو ترجمہ ہے، یہ کتاب چالیس ضخیم جلدوں میں ہے، کویت کی حکومت نے پینتیس برس کی مسلسل محنت کے بعد مختلف مذاہب کے ممتاز علما کے ذریعے یہ انسائیکلو پیڈیا تیار کرایا، قاضی صاحب کی ہمت کی داد دینی چاہئے کہ انھوں نے نہ صرف یہ کہ اس عظیم کتاب کو اُردو کا لباس پہنانے کا ارادہ کیا بلکہ اُسے پایۂ تکمیل تک پہونچا کر دم لیا، اور اب اس ترجمہ کی طباعت واشاعت کے تیاری چل رہی ہے، افسوس اس کی کوئی جلد قاضی صاحب کی زندگی میں زیورِ طبع سے آراستہ نہ ہوسکی، ہمیں یقین ہے کہ جب یہ عظیم انسائیکلو پیڈیا طباعت کے مراحل سے گزر کر لوگوں تک پہنچے گا تو قاضی صاحب کی روح اس سے نہایت مسرور ہوگی۔

قاضی مجاہد الاسلام قاسمی کی تمام تر جدوجہد کا محور یہ تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو کلمۂ واحدہ کی بنیاد پر ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا جائے اس مقصد کے کے لئے انہوں نے آل انڈیا ملّی کونسل کے نام سے ایک جماعت بھی قائم کی جس نے بہت جلد ملک کے مختلف حصوں میں اپنی شاخوں کا جال پھیلا دیا، ملّی کونسل میں بلاتفریق مذہب ومسلک ہر طرح کے لوگ شریک ہیں، اس جماعت نے اپنی ایک خاص شناخت بنالی ہے، اس کا واحد مقصد مسلمانوں کی تعلیمی، سماجی اور معاشی پسِ ماندگی دور کرنا ہے، اس جماعت کے ذریعے قاضی صاحب اور ان کے رفقائے کار نے ملک کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے مسلمانوں کی مشکلات کے لئے بڑا کام کیا ہے قدرتی آفات اور فسادات سے متأثرہ علاقوں میں اس جماعت نے بلاتفریق مذہب وملت انسانیت کی گراں قدر خدمت انجام دی ہے۔

حیرت ہے کہ مختلف کاموں کے لئے قاضی صاحب خود کو کس طرح فارغ کیا کرتے تھے ایک طرف وہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر تھے جو ایک ہمہ گیر ادارہ ہے اور ملکی سطح پر جس کی قابل ذکر سرگرمیاں ہیں، دوسری طرف وہ ''اسلامک فقہ اکیڈمی'' کے جنرل سکریٹری بھی تھے، جس کی مصروفیات خالص علمی ہوتی ہیں اور جو قلب و دماغ کی فراغت اور یکسوئی کی متقاضی ہیں، وہ ملّی کونسل کے جنرل سکریٹری بھی تھے اور جب تک صحت مندر ہے اس حیثیت سے ملک کے طول و عرض میں کونسل کے جلسوں اور میٹنگوں سے خطاب کرنے کے لئے مسلسل گردش میں رہے، امارتِ شرعیہ بہار واُڑیسہ جھارکھنڈ کے چیف قاضی کی حیثیت سے بھی ان کی ذمہ داریاں کم نہ تھیں، چند سال پہلے انہوں نے پھلواری شریف پٹنہ میں المعہد العالی للتدریب فی القضا والافتا کے نام سے ایک تعلیمی ادارہ بھی قائم کیا تھا جس کے وہ بانی صدر تھے، ان تمام ذمہ داریوں کے علاوہ بھی وہ مختلف ذمہ دارانہ مناصب پر فائز تھے اور ہر منصب کے تقاضوں کی تکمیل کے لئے تقسیم کار کے اصول کے تحت ان کے پاس وقت تھا، وہ شام، کویت اور جدہ کے کئی دینی و علمی اداروں کے رکن بھی تھے اور ان کے جلسوں میں شرکت کے لئے تشریف بھی لے جاتے رہے، حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ کے انتقال کے بعد انہوں نے بہار واُڑیسہ کے مختلف شہروں میں ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ اور ہاسپٹل بھی قائم کئے، چنانچہ وہ مولانا سجاد ہاسپٹل پھلواری شریف پٹنہ کے سکریٹری اور مولانا منت اللہ ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ پھلواری شریف پٹنہ کے صدر بھی تھے، اس دوران انھوں نے بہار واُڑیسہ میں مدارس اور مکاتب کے قیام کی تحریک بھی چلائی اور گاؤں در گاؤں سینکڑوں مدارس قائم کئے، مدارس عربیہ اسلامیہ کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کی غرض سے انہوں نے وفاق المدارس الاسلامیہ قائم کیا جس کے وہ چیرمین تھے، سہ ماہی ''بحث و نظر'' کے ایڈیٹر بھی تھے اور مختلف موضوعات پر ان کے فکر انگیز اور بصیرت افروز اداریئے علمی

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

حلقوں میں پسندیدگی کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔

ان گوناگوں مصروفیتوں کے باوجود تصنیف وتالیف کا مشغلہ بھی رہا اور آخر میں شدید بیماری اور نقاہت وکم زوری کے باوجود تالیفی سرگرمیوں میں اشتغال کچھ زیادہ ہی بڑھ گیا تھا، ۴/سال قبل ۱۹۹۸ء میں ڈاکٹروں نے ان کے خون میں کینسر تشخیص کیا تھا عام طور پر اس طرح کے مہلک امراض سے متأثر لوگ بستر سے لگ جاتے ہیں اور مایوسی کے عالم میں زندگی گزارتے ہیں، دنیا کے کسی مشغلے سے ان کی دل چسپی باقی نہیں رہتی، اس بیماری نے قاضی صاحب کے جسم کو تو کمزور کیا مگر ان کے جوش وجذبے کی حدت جوں کی توں برقرار رکھی، بلکہ جو علمی کام عرصۂ دراز سے ادھورے پڑے تھے وہ اس تیزی کے ساتھ انہوں نے پایۂ تکمیل تک پہنچائے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے اور جو سنتا ہے وہ ہمت اور حوصلے کی داد دئے بغیر نہیں رہتا۔

تصنیف وتالیف اور تحقیق ان کی زندگی کے نمایاں پہلو ہیں انہوں نے تقریباً تیس کتابیں یادگار چھوڑی ہیں جن میں سے نو عربی زبان میں ہیں اور ان میں سے بھی کئی بیروت اور کویت وغیرہ سے چھپی ہیں، کئی کتابوں کے انگریزی تراجم بھی ہو چکے ہیں، قاضی صاحب نے جو کچھ لکھا اس نے ماخذ کی حیثیت اختیار کرلی، جس موضوع پر لکھا اس کا حق ادا کیا، آج ان کی کئی کتابیں اسلامی لائبریری میں اپنا ایک منفرد مقام رکھتی ہیں۔ ''اسلامی عدالت'' ان کی ایک ایسی ہی گراں قدر تصنیف ہے جس کی نظیر اُردو زبان میں تو کیا عربی میں بھی مشکل ہی سے ملے گی، مختلف موضوعات پر ان کے فقہی مقالات کے کئی مجموعے چھپ کر مقبول ہو چکے ہیں، قاضی صاحب کی نگرانی میں مسلم پرسنل لا بورڈ نے ''مجموعہ قوانین اسلامی'' کے نام سے بھی ایک عظیم کتاب مرتب کرائی جو شائع ہو چکی ہے، حال ہی میں کویت کے ایک طباعتی ادارے نے ''صنوان القضا وعنوان الافتا'' کے نام سے چار جلدوں میں ایک کتاب شائع کی ہے

جوعربی زبان میں ہے اور تقریباً پندرہ سوصفحات پر مشتمل ہے اب تک اس کا سات سو سال پرانا مخطوطہ دستیاب تھا، قاضی صاحب نے اس پر لگاتار چھ برس تک کام کیا اور اس طرح فقہ حنفی کا یہ قیمتی سرمایہ منظر عام پر آسکا، خوشی کی بات یہ ہے کہ قاضی صاحب نے اپنی زندگی میں اس مخطوطے کو مطبوعہ شکل میں دیکھ لیا، کسی مصنف اور محقق کے لئے اس سے بڑھ کر خوشی کی بات کوئی دوسری نہیں ہوسکتی کہ وہ خود اپنی آنکھوں سے اپنی محنت کے نتائج کا مشاہدہ کرلے۔

نجی زندگی میں وہ نہایت خلیق، متواضع اور منکسر المزاج واقع ہوئے تھے خاص طور پر چھوٹوں سے بڑی شفقت کے ساتھ ملتے، جس سے ملتے اسے یہ احساس ہوتا کہ قاضی صاحب کو اس سے کچھ زیادہ ہی تعلق ہے۔ طالب علمی کے زمانے میں قاضی صاحب سے میرا تعلق دید و شنید سے زیادہ نہیں تھا، مگر فراغت کے بعد جب بھی ملاقات ہوئی ایسا محسوس ہوا کہ قاضی صاحب کی مہربانیاں میری حیثیت سے کچھ زیادہ ہی ہیں۔ ۶ر دسمبر ۱۹۹۲ء کے بعد جب پورے ملک میں فسادات برپا تھے دہلی میں مسلم پرسنل لا بورڈ کا جلسہ منعقد ہوا، دیوبند کے میرے بعض دوست اس اجلاس سے کچھ زیادہ ہی امیدیں وابستہ کئے بیٹھے تھے اور بڑے پرجوش نظر آرہے تھے، ان کی خواہش تھی کہ وہ بھی اس اجلاس میں شریک ہوں اور ۶ر دسمبر کے بعد قائدین ملت کے نقطۂ نظر سے آگاہ ہوں، ان کے اصرار پر میں بھی ہم سفر بن گیا، اتفاق سے جائے اجلاس پر ہم اس وقت پہنچے جب میٹنگ شروع ہوچکی تھی اور استقبالیہ پر چند ایسے لوگ بیٹھے ہوئے تھے جن سے کوئی شناسائی نہیں تھی، بڑی کوشش کی کہ ہم میں سے چند افراد کو میٹنگ میں شرکت کی اجازت مل جائے مگر وہ لوگ ٹس سے مس نہ ہوئے اچانک کیا دیکھتے ہیں کہ قاضی صاحب جلسہ گاہ سے استقبالیہ پر تشریف لائے، مجھ پر نظر پڑی، گلے لگایا اور استقبالیہ والوں سے شکوہ کیا کہ تم نے انہیں اندر کیوں نہیں بھیجا

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

میرے لئے کچھ تعریفی کلمات بھی کہے جو ظاہر ہے محض ہمت افزائی کے لئے تھے ملّی کونسل کی تشکیل کے بعد میرے پاس خط آیا کہ تجھے دیوبند کے لئے ملّی کونسل کا کنوینز کا نام زد کیا گیا ہے اس کے بعد اطلاع آئی کہ قاضی صاحب اپنے چند رفقا کے ساتھ مغربی یوپی کے دورے پر ہیں، دیوبند بھی تشریف لائیں گے، میں نے اپنے گھر پر ہی چند لوگوں کو مدعو کیا، قاضی صاحب کی تقریر ہوئی، دوسرے حضرات نے بھی شرکاء سے خطاب کیا، اس موقع پر قاضی صاحب نے مجھ سے اور میرے گھر والوں سے بہت زیادہ اپنائیت کا اظہار کیا، خاص طور پر اس لئے بھی کہ وہ ان ہی دنوں امریکہ سے واپس تشریف لائے تھے اور شکاگو میں انہوں نے اپنے دوست اور میرے خسر مولانا قاری محمد عبداللہ سلیم کے یہاں قیام کیا تھا، قاضی صاحب کو میری خوش دامن صاحبہ کی مہمان نوازی بہت پسند آئی تھی اور وہ اس موقع پر بار بار اس کا تذکرہ کررہے تھے کہ امریکہ میں اگر مجھے کہیں اپنائیت ملی تو وہ قاری عبداللہ سلیم کے گھر میں ملی، اس موقع پر میں نے دیوبند کے ایک ناشر کے اصرار پر ''فتاویٰ شامی'' کے جدید ایڈیشن کے لئے ایک تقریظ حضرت قاضی صاحب سے بھی لکھوائی جو انھوں نے بغیر کسی تأمل کے فوراً لکھ کر دے دی۔

جس زمانے میں ''ترجمانِ دیوبند'' کا پہلا شمارہ آیا اس وقت طلاقِ سکران کے وقوع اور عدم وقوع کی بحث زوروں پر تھی میں نے اپنے ایک مضمون میں اس اختلاف پر سوالیہ نشان قائم کیا، اس میں نہ قائلین وقوع کی حمایت تھی اور نہ مانعین عدم وقوع کی تائید بلکہ دونوں سے شکوہ تھا کہ آخر وہ کسی ایک جگہ بیٹھ کر اپنے اختلافات کیوں دور نہیں کرلیتے، اس مضمون کی اشاعت کے بعد قاضی صاحب کی فقہ اکیڈمی کے تعلق سے دو مضامین موصول ہوئے ایک مضمون میں فقہ اکیڈمی کی تعریف کی گئی تھی اور دوسرے مضمون میں نہ صرف یہ کہ فقہ اکیڈمی پر تنقید کی گئی تھی بلکہ

قاضی صاحب کی ذات اوران کے طریقۂ کار کو بھی ہدفِ ملامت بنایا گیا تھا، میں نے یہ دونوں مضامین شائع کئے اور ایک ادارتی نوٹ بھی لگایا کہ ادارے کا ان دونوں مضامین کے مشمولات سے اتفاق ضروری نہیں ہے یہ دونوں مضامین شائع ہوئے چند ہی روز بعد قاضی صاحب کا دہلی سے فون آیا اوراس مضمون پر اپنی تکلیف کا اظہار کیا جس میں قاضی صاحب کے متعلق کچھ جارحانہ انداز اختیار کیا گیا تھا فرمایا تم سے تعلق ہے اس لئے شکوہ کررہا ہوں، مجھے احساس ہوا کہ شاید میں نے وہ مضمون شائع کرکے غلطی کی ہے،اس واقعے کے بعد گزشتہ اپریل ۲۰۰۱ء میں ''القاموس الوحید'' کے رسم اجراء کے موقع پر دیوبند تشریف لائے،اسی محبت اور شفقت سے ملے اور میں اپنی غلطی کی وجہ سے کچھ جھجھک محسوس کرتا رہا، یہ بڑے لوگ تھے ان کے طرزِ عمل میں بڑوں کی شان تھی،اب یہ لوگ آہستہ آہستہ اُٹھتے جارہے ہیں۔

قاضی صاحب :عوام میں،علما میں، مدارس کے حلقوں میں کس قدر مقبول تھے اس کا اندازہ ان کی وفات کے بعد ہورہا ہے،شاید ہی کوئی دن ایسا جاتا ہو جس دن ان کی یاد میں منعقد کئے گئے تعزیتی جلسوں کی خبریں اخبارات میں نہ چھپتی ہوں، تمام زعمائے ملت، قائدین کرام، علمائے عظام، اربابِ مدارس اس بات پر متفق نظر آتے ہیں کہ قاضی صاحب کے انتقال سے ایک زبردست خلا پیدا ہوا ہے اوراس خلا کا پُر ہونا بہ ظاہر مشکل نظر آتا ہے، اللہ تعالیٰ قاضی صاحب کی قبر کو نور سے بھردے اور امت کے لئے ان کا ثانی پیدا فرمائے۔ آمین

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

لائق استاذ اور فعال منتظم

مولانا مفتی محمد انوار الحق در بھنگویؒ

مرنا سب کو ہے، جو آتا ہے جانے کے لیے آتا ہے؛ لیکن بعض لوگ محفل سے اس طرح اچانک اٹھ کر چلے جاتے ہیں کہ بیٹھے رہ جانے والے حیران پریشان اس خالی جگہ کو تکتے رہتے ہیں جو کسی کے دفعۃً چلے جانے سے پیدا ہوتی ہے، دار العلوم (وقف) دیوبند کے قدیم اور لائق وممتاز استاذ مولانا انوار الحق کچھ اسی طرح اچانک چلے گئے اور اپنے پیچھے بے شمار شاگردوں اور واقف کاروں کو اداس اور غمگین چھوڑ گئے۔

یکم اپریل ۲۰۰۴ء کی شام مغرب کی نماز کے بعد کسی نے اطلاع دی کہ دار العلوم وقف کے استاذ مفتی انوار الحق انتقال کر گئے، اس خبر پر یقین ہی نہیں آیا خیال ہوا آج یکم اپریل ہے، کسی نے بے ہودہ مذاق کرنے کی کوشش کی ہے، یہ بھی دل میں آیا کہ شاید بتلانے والے کو سننے میں مغالطہ ہوا ہو، ہوسکتا ہے کسی اور انوار صاحب کا انتقال ہوا ہو؛ لیکن جب یہی افسوس ناک خبر کئی لوگوں سے ملی اور دار العلوم کے لاؤڈ اسپیکر سے اعلان بھی ہوگیا تو اس ناگہانی حادثے پر یقین کرنا ہی پڑا، دوسروں پر کیا گزری مجھے نہیں معلوم؛ لیکن اس خبر نے میرے دل ودماغ کی دنیا تہ وبالا کر دی رہ رہ کر ان کا ہنستا مسکراتا چہرا نگاہوں میں گھومتا رہا، دل یہ یقین کرنے پر آمادہ ہی نہیں تھا کہ وہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں، میرا ان سے کوئی قریبی تعلق نہیں تھا، بس آتے جاتے

علیک سلیک تھی، اس کے باوجود میں بے حد افسردہ تھا، یہ خبر سن کر، اور انھیں بے جان دیکھ کر ان لوگوں کا کیا حال ہوا ہوگا جو رات دن ان کے ساتھ رہتے تھے، ان کی مجلسوں میں شریک ہوتے تھے، ان سے پڑھتے تھے، ان سے قریبی تعلق رکھتے تھے۔

مجھ جیسے کسی شخص کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ مفتی صاحب دارالعلوم کے طلبہ اور اساتذہ میں اس قدر مقبول ہیں، اس کا علم ان کی وفات کے بعد ہوا، جن لوگوں نے مفتی صاحب کے بے روح جسم کے چاروں طرف طلبہ کے ہجوم کا مشاہدہ کیا ہے، اور جن لوگوں نے ان کے جنازے کو ہزاروں طالبان علوم نبوت کے کاندھوں پر قبرستان قاسمی کی طرف محو سفر دیکھا ہے وہ اس بات کی گواہی دیں گے کہ دارالعلوم وقف کے طلبہ ہی نہیں؛ بل کہ دارالعلوم دیوبند کے طلبہ بھی اس حادثے سے بے حد متأثر دل گرفتہ اور ملول تھے۔

آج بھی جب کہ ان کی وفات کو ایک ماہ گذرنے والا ہے دارالعلوم وقف کے اساتذہ اور طلبہ ان کی وفات کے غم سے سنبھل نہیں پائے ہیں، بیٹھے بیٹھے اچانک کوئی چل بسے تو اس کا اثر پتھر دل رکھنے والوں پر بھی ہوتا ہے، چہ جائے کہ متأثر ہونے والے دل ایمانی حرارت سے نرم اور گداز ہوں، پھر یہ اثر دیرپا ہو اور کسی صورت کم نہ ہو رہا ہو تو سمجھ لینا چاہئے کہ جانے والا دلوں سے بے حد قریب تھا، مفتی صاحب کی وفات نے بھی کچھ ایسا ہی اثر چھوڑا ہے، گذرنے والا ہر لمحہ ان کی یاد کی شدت میں اضافہ کر رہا ہے، ان کے قریب رہنے والے ان کے دوست اور شاگرد ایسا محسوس کرتے ہیں، جیسے وہ ابھی کہیں اٹھ کر گئے ہیں، کچھ لمحوں کے بعد اپنے شفقت آمیز لہجے اور گرج دار آواز کے ساتھ واپس آجائیں گے۔

مفتی صاحب مرحوم نے زندگی کے قیمتی ماہ وسال دار العلوم وقف میں گزارے، انھوں نے دارالعلوم دیوبند میں سال ششم کے طالب علم کی حیثیت سے داخلہ لیا، اور ۱۹۸۰ء سے قبل ہی فراغت حاصل کرلی، اسی ادارے سے افتا کیا، بعد

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

میں حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ سے عقیدت ومحبت کی بنا پر دار العلوم وقف سے وابستہ ہوگئے، انھوں نے بہت جلد ایک مدرس کی حیثیت سے مقبولیت حاصل کرلی، اور انتظامی امور میں بھی دخیل بھی ہوگئے، دار العلوم وقف کو ایک ننھے پودے سے تناور درخت بنانے میں جن باغ بانوں نے شب وروز محنت کی ہے ان میں اگر مفتی صاحب مرحوم کا نام نہ لیا جائے تو یہ ان کے ساتھ سخت ناانصافی ہوگی، عرصے تک وہ شعبۂ تعلیمات سے بہ حیثیت معاون ناظم متعلق رہے، داخلے کے امتحانات اور نتائج کے تمام مراحل میں ان کا کردار کافی مؤثر اور محنت طلب رہتا تھا، اس کا بہت کچھ اندازہ طلبہ کے اس ہجوم سے ہوتا رہا جو داخلے کے ایام میں ان کی رہائش گاہ کے آس پاس رہا کرتا تھا، میں انہیں فائلیں اور کاغذات کے پلندے بغل میں دبائے کبھی دفتر تعلیمات اور کبھی حضرت مہتمم صاحب اور حضرت صدر المدرسین کے مکانات کی طرف آتے جاتے دیکھا کرتا تھا، معلوم ہوا کہ اب کچھ دنوں سے تعلیمی امور ان کے متعلق نہیں تھے بل کہ دار الاقامہ کا نظم وضبط ان کے سپرد کردیا گیا تھا، اس میں بھی وہ پوری جاں فشانی کے ساتھ لگے رہتے تھے، صبح فجر کی نماز سے پہلے شہر میں واقع اپنے مکان سے پاپیادہ دار العلوم وقف جانا جو آبادی سے بہت دور واقع ہے، اور وہاں جاکر نماز فجر کے لیے طلبہ کو بیدار کرنا ان کا معمول تھا، فجر کے بعد وہ دیر تک دار العلوم وقف میں رہ کر طلبہ کی نگرانی کرتے تھے، کسی نے بتلایا کہ وہ پہلا گھنٹہ پڑھا کر گھر واپس آتے تھے۔

طلبہ کے معاملات سے ان کو بڑی دل چسپی تھی، کوئی طالب علم بیمار ہے مفتی صاحب اس کی دیکھ بھال میں مصروف، کوئی پریشان حال ہے مفتی صاحب اس کی دل جوئی کے لیے حاضر، کوئی ضرورت مند ہے مفتی صاحب اس کی دست گیری کے لیے مستعد، وفات سے ٹھیک ایک ہفتہ پہلے جمعہ کی شب میں اٹھارہ بیس سال کا ایک طالب علم کھیلتے کھیلتے اچانک موت کی آغوش میں چلا گیا، مفتی صاحب مرحوم نے وہ

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

پوری رات جاگ کر گزاری، اس کی میت کو غسل دیا، تجہیز و تکفین، نماز جنازہ، اور تدفین کے تمام مراحل سے فراغت کے بعد وہ صبح کو گھر لوٹے، طلبہ کو وہ اپنے بچوں کی طرح چاہتے تھے، ایک مہربان اور شفیق باپ کی طرح طلبہ کی ہر ضرورت کا خیال رکھتے تھے طلبہ بھی ان کو پورا پورا احترام دیتے تھے، ان کے متنازع امور کو سلجھانے میں مفتی صاحب کی مدد ضرور لی جاتی تھی، جلسوں وغیرہ میں نظم وضبط برقرار رکھنے کے لیے ان کی ایک کڑک دار آواز بڑی مؤثر ثابت ہوتی تھی، سنا ہے کہ وقف دار العلوم کے طلبہ نہ صرف ان کا احترام کرتے تھے؛ بلکہ ان سے ڈرتے بھی تھے، عموماً طلبہ ان ہی اساتذہ کا احترام کرتے ہیں اور ان ہی سے ڈرتے ہیں جو ان کے ساتھ شفقت اور محبت کا برتاؤ کرتے ہوں۔

دار العلوم وقف کی ترقی سے ان کو بڑی دل چسپی تھی، رمضان المبارک کی تعطیلات میں وہ فراہمیِ سرمایہ کے لیے اسفار بھی کرتے رہے ہیں، خاص طور پر بمبئی کے اہل خیر حضرات سے وہ دار العلوم وقف کے لیے اچھا خاصا سرمایہ فراہم کر کے لاتے تھے، بمبئی کے دینی حلقوں میں ان کا نام احترام کے ساتھ لیا جاتا تھا، بمبئی کے لوگ جب بھی دیوبند آتے، مفتی صاحب کے ذاتی مہمان بنتے تھے، ان کی وفات نے بمبئی کے مخیّر اور دین دار حضرات کو بھی کافی غمگین اور رنجیدہ کیا ہے۔

خدا مغفرت کرے، بڑی خوبیوں کے انسان تھے، ہر وقت ہنستے مسکراتے رہنا ان کی پہچان بن گیا تھا، حال ہی میں انھوں نے محدود پیمانے پر کتابوں کی خرید و فروخت کا سلسلہ بھی شروع کیا تھا، وہ فارغ اوقات میں اپنے تجارتی مکتبے میں بیٹھا کرتے تھے، جانے والے چلے جاتے ہیں اور اپنے پیچھے بہت سے مسائل چھوڑ جاتے ہیں اہل وعیال کے لیے یہ بڑے نازک لمحات ہیں، بہ ظاہر وہ حالات کی کڑی دھوپ میں کھڑے ہوئے ہیں، دور دور تک کوئی شجرِ سایہ دار نہیں ہے، مدارس عربیہ کے مدرسین اور ملازمین اگر جوان العمری میں گذر جائیں تو ان کے پس ماندگان کے لیے بڑے

سخت اور جاں گسل معاشی مسائل پیدا ہوتے ہیں، ایک دو بڑے اداروں کے علاوہ کہیں فنڈز وغیرہ نہیں کٹتے، بیوہ عورتوں اور یتیم و بیسر بچوں کے لیے پنشن کی اسکیم تو کہیں بھی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ مفتی صاحب کے اہل وعیال کا غم ہلکا کرے، ان کو معاشی الجھنوں سے نجات بخشے اور ان کی کفالت کے آبرومندانہ ذرائع پیدا فرمائے۔

دارالعلوم وقف کے لیے بھی یہ آزمائش کی گھڑی ہے، لائق فائق استاذ سے کسی درس گاہ کی محرومی اس کی بڑی بدنصیبی ہے، چہ جائے کہ وہ استاذ مفتی انوار جیسا منتظم، فعال اور مخلص ہو، میرے خیال سے ان جیسا باحوصلہ شخص دارالعلوم وقف کو مشکل ہی سے ملے گا، وہ تو تجربات کی بھٹی میں تپ کر پختہ کار ہو گئے تھے، انھوں نے اس ادارے کی تشکیل سے تعمیر تک ہر طرح کے سرد گرم حالات کا بہ چشم خود مشاہدہ کیا ہے؛ بل کہ وہ ان حالات سے خود بھی نبرد آزما رہے ہیں، اب جو شخص بھی ان کے چھوڑے ہوئے خلا کو پر کرنے کے لیے آگے بڑھے گا اس کو مفتی صاحب مرحوم جیسا مرد فعال بننے میں کتنے ماہ وسال لگیں گے اس کا صحیح اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جو مدارس کے انتظامی امور پر گہری نظر رکھتے ہیں، مدارس کے سفر میں یہ کوئی آسان منزل نہیں ہے، اب بہت کم لوگ وحید الزماں کیرانویؒ جیسا بننا پسند کرتے ہیں؛ بل کہ حق بات تو یہ ہے کہ اب کوئی شخص ان جیسا بن کر اپنا قیمتی وقت اور بیش قیمت صحت ضائع کرنا نہیں چاہتا سہولت پسندی کے اس دور میں عموماً اساتذۂ کرام نے تربیتی امور سے لاتعلقی اختیار کرلی ہے، حقیقت یہ ہے کہ مفتی صاحب مرحوم جیسے جفاکش، محنتی، شفیق، مہربان لائق اور قابل اساتذہ مشکل سے پیدا ہوتے ہیں، ''ترجمان دیوبند'' کے قارئین سے درخواست ہے کہ وہ مرحوم کے لیے دعائے مغفرت ضرور فرمائیں۔

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

ملّت اسلامیہ کے لائق فرزند، دارالعلوم دیوبند کے ممتاز فاضل

مولانا محمد رضوان القاسمیؒ

حضرت مولانا محمد رضوان القاسمیؒ نے ایک ماہ کی مسلسل بیماری اور بے ہوشی کے بعد ۱۱؍اکتوبر ۲۰۰۴ء کو حیدرآباد میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ مولانا دارالعلوم دیوبند کے ان چند گنے چنے فضلا میں سے تھے جنھوں نے اپنی جد وجہد سے ایک تاریخ بنائی ہے، وہ مسلسل فعال اور متحرک رہنے والے باہمت انسان تھے، تھک کر بیٹھ جانے کا ان کے یہاں تصور بھی نہیں تھا، مدّت سے دل کے مریض تھے، اس عالم میں بھی وہ پیہم رواں دواں رہے، دارالعلوم سے فراغت کے بعد دارالعلوم رحمانیہ حیدرآباد میں مدرس ہوکر گئے جو اس وقت اپنے ابتدائی مراحل میں تھا، اس مدرسے میں محنت اور جاں فشانی کے ساتھ تدریسی امور انجام دیئے، لیکن انتظامیہ سے اختلافات کے بعد جلدی ہی اس سے علیحدہ ہوگئے۔ بعد میں وہ ایک ایسے شخص کی حیثیت سے سامنے آئے جس نے زندگی کی آخری سانس تک زمانے کی سختیاں جھیلیں اور چیلنجوں کا سامنا کیا حیدرآباد کی مشہور تاریخی- مسجد عامرہ- کی امامت وخطابت نے انہیں شہر کی اعلیٰ تعلیمی سماجی اور دینی شخصیتوں میں اثر ورسوخ حاصل کرنے کا موقع بخشا، اس مسجد کے وسیع دارالمطالعہ کی بے شمار کتابوں نے ان کے اندر مطالعے کا ذوق اور لکھنے کا شوق پیدا کیا

ایک طرف وہ بے مثال خطیب بن کر ابھرے، دوسری طرف اُردو کے ادیب اور صاحب قلم کی حیثیت سے انہوں نے خوب نام کمایا، جلد ہی ان کے مواعظ وخطبات حیدرآباد اور اضلاع کے دینی حلقوں میں پسند کیے جانے لگے، وہاں کے مشہور اردو روزنامہ اخبار ''سیاست'' نے ان کا ہفتہ وار کالم شروع کیا، جس میں وہ ہر ہفتے دینی علمی ادبی اور اصلاحی موضوعات پر مضامین لکھتے تھے، یہ سلسلہ آخر وقت تک قائم رہا، بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو میدان خطابت کے شہ سوار بھی ہوں اور رئیس القلم بھی مولانا رضوان القاسمی میں اللہ تعالیٰ نے یہ دونوں خوبیاں جمع کر دی تھیں اور وہ اپنی ان دونوں صلاحیتوں سے برابر کام لے رہے تھے، ان کے خطبوں اور تحریروں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

دارالعلوم رحمانیہ سے علیحدگی کے بعد انہوں نے دارالعلوم سبیل السلام کے نام سے ایک مدرسے کی داغ بیل ڈالی، ابتداء میں یہ مدرسہ معمولی حیثیت کا تھا راقم الحروف کی نگاہوں میں آج بھی ان کے مدرسے کی ابتدائی عمارت کا منظر محفوظ ہے، مہدی پٹنم کے دور افتادہ علاقے میں ایک مختصر رقبے پر قائم یہ مدرسہ لکڑی کے تختوں کی دیواروں اور ٹین کی چھتوں پر مشتمل تھا، مولانا رضوان القاسمی کی سخت محنت نے اس مدرسے کو عروج بخشا اور اللہ رب العزت نے ایسے ذرائع پیدا کیے کہ آج یہ مدرسہ صلالہ کی پہاڑیوں کے دامن میں کشادہ، وسیع اور دل کش عمارتوں کا ایک خوبصورت مجموعہ بن گیا ہے، اس کے دفاتر، اقامت گاہیں، درس گاہیں، لائبریری کانفرنس ہال اور دارالتحفیظ وغیرہ کی عمارتیں ان کے اعلیٰ تعمیری ذوق کی عکاس اور بے مثال قربانیوں کا ثمرہ نظر آتی ہیں، انہوں نے اپنی مختصر سی زندگی ہی میں اپنی آنکھوں سے اپنے خوابوں کو شرمندۂ تعبیر ہوتے دیکھا، یہ بڑی بات ہے، آج وہ موجود نہیں ہیں اللہ نے چاہا تو ان کا لگایا ہوا یہ باغ اسی طرح پھلتا پھولتا اور مہکتا رہے گا اور ان کی روح

کو پرسکون رکھے گا۔

مولانا محمد رضوان القاسمیؒ اپنی تحریری، تقریری اور تعلیمی مصروفیتوں کے باوجود ملّی سرگرمیوں میں برابر حصہ لیتے تھے، وہ تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند کے نائب صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، آل انڈیا ملّی کونسل، آل انڈیا فقہ اکیڈمی اور ندوۃ العلما لکھنؤ کی مجلس شوریٰ کے رکن تھے اور ان تمام اداروں کے جلسوں میں پابندی کے ساتھ شرکت کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو ملت کا نبض شناس بنایا تھا، ملّی مسائل پر ان کی گہری نظر تھی اور وہ مجلسوں میں اپنی وقیع، مؤثر اور مدلل گفتگو کی وجہ سے احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔

راقم السطور مولانا رضوان القاسمی سے ذاتی طور پر بہت اچھی طرح واقف تھا ہماری پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب میں دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد ۱۹۷۸ء میں دارالعلوم رحمانیہ حیدرآباد میں صدر مدرس بنا کر بھیجا گیا، اس مدرسے میں مجھے ایک سال گذارنے کا موقع ملا، اس دوران روزنامہ سیاست میں ان کے کالم پڑھنے کے بعد خیال ہوا کہ کالم نگار کے ساتھ القاسمی کی نسبت لگی ہوئی ہے، اس لیے ان سے ملاقات ضرور کرنی چاہیے، یہ جذبہ کشاں کشاں مسجد عامرہ تک لے گیا، وہاں دارالمطالعہ میں پہلی بار اس باغ و بہار شخصیت سے ملاقات ہوئی، تعارف ہوا، اس طرح اس مسجد میں اور دارالعلوم سبیل السلام میں ملنے جلنے اور بات چیت کرنے کا بار بار مواقع میسر آئے، دیوبند میں بھی ان سے کبھی سرراہ اور کبھی اپنے تجارتی مکتبے دارالکتاب میں ملاقات رہی، تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند کے سہ روزہ سمینار کے موقع پر جو الامام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانیِ دارالعلوم دیوبند کے حالات اور کارناموں پر چند سال پہلے دہلی میں منعقد ہوا تھا؛ طویل ملاقات اور گفتگو کا موقع ملا اس موقع پر ہم دونوں نے الامام مولانا محمد قاسم نانوتوی ایوارڈ کی ایک تجویز میٹنگ

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

میں رکھی، اتفاق سے اس تجویز پر ہم دونوں کے خیالات وجذبات یکساں تھے، یہ تجویز سمینار کے آخری اجلاس میں پیش ہوئی اور منظور کر لی گئی، اس تجویز پر عمل کرنے کے لیے جو کمیٹی بنائی گئی تھی اس کا کنوینر مولانا رضوان القاسمی کو نامزد کیا گیا، مجھ سمیت کئی لوگ اس کمیٹی کے رکن تھے، مگر مولانا اپنی غیر معمولی مصروفیتوں کے باعث اس تجویز کو روبہ عمل نہ لا سکے، اس کا افسوس رہے گا۔ ان سے آخری تفصیلی ملاقات حضرت مولانا وحید الزماں کیرانویؒ کی شاہ کار تالیف ''القاموس الوحید'' کے رسمِ اجراء کے موقع پر تین سال پہلے دیوبند میں ہوئی تھی، اس تقریب میں شرکت کے لیے وہ بہ طور خاص سفر کر کے حیدرآباد سے دیوبند تشریف لائے تھے، جلسۂ عام میں حضرۃ الاستاذؒ کی شخصیت پر ان کا خطاب بڑا متوازن اور متاثر کن تھا، عام طور پر طلبہ اور اساتذہ نے اسے پسند کیا۔

مولانا رضوان القاسمیؒ کا انتقال ملت اسلامیہ کے لائق فرزند، دارالعلوم دیوبند کے ممتاز فاضل، اُردو کے مایۂ ناز ادیب اور خطیب اور سلسلۂ مدارس کی بے مثال اور فعال شخصیت کا انتقال ہے، اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو نور سے بھر دے اور انہیں ابدی راحت وسکون عطا فرمائے، علم کا جو گلستاں انہوں نے حیدرآباد کی سرزمین پر لگایا تھا وہ اسی طرح شاداب وگل فشاں رہے، قارئین ترجمان دیوبند سے درخواست ہے کہ وہ مولانا مرحوم کے لیے مغفرت اور بلندیٔ درجات کے لیے دعاء فرمائیں۔

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

آخری صف بھی چراغوں کو بجھا چاہتی ہے

محی السنّہ حضرت مولانا شاہ ابرار الحق حقی

۱۷ رمئی ۲۰۰۵ء کو ایک الم ناک دن کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا کہ آج کے دن ایک ممتاز عالم دین عظیم مصلحِ امت اور صاحب نسبت بزرگ نے رخت سفر باندھا، محی السنۃ حضرت مولانا شاہ ابرار الحق حقی کا سانحۂ وفات بلاشبہ عالم اسلام اور دنیائے انسانیت کے لیے ایک ایسا نقصان عظیم ہے جس کی تلافی بہ ظاہر ممکن نہیں ہے۔ وہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی بزم رشد و ہدایت کے آخری چراغ تھے، اس چراغ کے بجھ جانے سے ایک پورے عہد کا خاتمہ ہوگیا، حضرت تھانویؒ کے بہ راہ راست فیض یافتگان کے سلسلۃ الذہب کی آخری کڑی بھی نگاہوں سے اوجھل ہوگئی اور علم و عمل کا نیرّ تاباں یوپی کے ایک شہر ہردوئی کی سرزمین میں غروب ہوگیا۔

حضرت شاہ صاحب عرصے سے بیمار تھے، عمر بھی کافی ہوچکی تھی، چند سال پہلے برین ہمبریج ہوا تھا، جس کی وجہ سے متعدد جسمانی عوارض لاحق تھے اور ہر وقت اس اندوہ ناک خبر کا دھڑکا لگا رہتا تھا، ۱۷ رمئی کی شب اچانک دوبارہ دماغ کی رگ پھٹی ہردوئی سے لکھنؤ بہ غرض علاج لے جائے جا رہے تھے کہ راستے میں خالق حقیقی سے جا ملے، چند لمحوں میں اس حادثۂ وفات کی خبر پوری دنیا میں پھیل گئی، قرب و جوار کے جو

لوگ ہردوئی پہنچ سکتے تھے وہ اسی وقت چل پڑے، صبح تک ہردوئی پہنچنے والوں کی تعداد ہزاروں کے قریب پہنچ گئی، نماز جنازہ جناب قاری امیر حسن صدر مدرس مدرسہ اشرف العلوم ہردوئی نے پڑھائی، ایک محتاط اندازے کے مطابق اس موقع پر لگ بھگ ایک لاکھ افراد موجود تھے، عیدگاہ کے قریب عام قبرستان میں بھیگی آنکھوں کے ساتھ زمین کی امانت؛ زمین کے سپرد کردی گئی۔

حضرت شاہ ابرار الحقؒ ۲ / دسمبر ۱۹۲۰ء مطابق ۱۳۳۹ھ کو ہردوئی کے ایک دین دار گھرانے میں پیدا ہوئے، ہردوئی ضلع یوپی کا ایک پس ماندہ علاقہ ہے، اسے نہ اقتصادی طور پر شہرت حاصل تھی، نہ سیاسی اور علمی لحاظ سے، اللہ تعالیٰ نے اس ضلع کو حضرت شاہ صاحبؒ جیسی شخصیت سے نوازا جس نے اس پس ماندہ علاقے کے گم نام شہر کو شہرت اور عزت کی سربلندیوں تک پہنچا دیا، آج یہ شہر ملک کے نقشے میں ایک غیر معمولی شان اور امتیاز رکھتا ہے، ہندوستان کے قرب وجوار ہی سے نہیں بلکہ دور دراز کے علاقوں تک سے لوگ یہاں اپنی روحانی پیاس بجھانے کے لیے آتے رہے ہیں ہندوستان سے باہر بھی یہ شہر دین دار مسلمانوں کی توجہات کا مرکز رہا ہے اور ساری دنیا سے لوگ یہاں استفادے کی غرض سے سفر کر کے پہنچتے رہے ہیں۔

حضرت مولانا کے والد مرحوم جناب محمود الحق صاحب حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے مجاز تھے، اس طرح بچپن ہی سے حضرت مولانا کے کان حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے نام اور کام سے آشنا رہے ہیں، حضرت مولانا کے نام نامی کے ساتھ ''حقی'' کا لاحقہ اس لیے رہا کہ آپ کے سلسلۂ نسب میں مشہور محدث حضرت شاہ عبدالحق دہلویؒ کا نام آتا ہے۔

خاندانی روایات کے مطابق ابتدائی تعلیم گھریلو سطح پر ہوئی، آٹھ سال کی عمر میں کلام اللہ شریف حفظ کیا، ابتدائی اُردو اور فارسی کی تعلیم کے بعد ۱۳۴۹ھ میں مشہور علمی

درس گاہ مظاہر علوم سہارنپور میں داخل ہوئے اور وہاں سے ۱۳۵۶ھ میں علوم عالیہ سے فراغت حاصل کی، اس کے بعد بھی ایک سال تک فنون کی بنیادی کتابوں کے مطالعے میں مصروف رہ کر استعداد بڑھاتے رہے، دورِ طالب علمی ہی میں طبیعت پر یک سوئی کا غلبہ تھا، بھرپور علمی انہماک اور اشتغال رکھتے تھے، مزاج میں تقویٰ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا محدث سہارنپوریؒ نے جو آپ کے استاد بھی تھے لکھا ہے کہ "مولانا ابرار الحق صاحب کو اللہ تعالیٰ نے طالب علمی ہی کے زمانے میں صاحب نسبت بنا دیا تھا، اور تعلق مع اللہ کی دولت عطا فرما دی تھی۔" طبیعت میں نیکی اور تزکیۂ باطن کی طرف رجحان اس درجہ تھا کہ ایام طالب علمی ہی میں ہر جمعرات کو بہ غرض استفادہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی خانقاہِ تھانہ بھون کا سفر کرتے اور جمعہ کا تمام دن وہاں گذار کر واپس آتے، فراغت کے بعد آپ نے کچھ عرصے مظاہر علوم سہارنپور میں معین المدرسی کی خدمات انجام دیں، کچھ وقت بہ حیثیت عربی مدرس جامع العلوم کانپور میں بھی قیام فرمایا اور کچھ عرصے فتح پور ہنسوہ میں سلسلۂ تدریس سے وابستہ رہے۔ ۱۳۶۱ھ میں جب کہ آپ اپنی عمر کی بائیس ویں منزل میں تھے حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی طرف سے اجازت وخلافت کے اعزاز سے سرفراز ہوئے، شوال ۱۳۶۲ھ میں اپنے مرشد حضرت تھانویؒ کے حکم اور ایماء سے انھوں نے ہردوئی میں اشرف المدارس کی بنیاد رکھی، یہ علاقہ علمی اعتبار سے نہایت پسِ ماندہ رہا ہے، یہاں ایک ایسے مدرسے کی سخت ضرورت تھی جو جہالت کی تاریکی میں علم کی شمع روشن کر سکے، تاریخ نے ثابت کیا کہ اس مدرسے نے علاقے کی علمی، عملی اور روحانی ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

حضرت شاہ ابرار الحقؒ کی تمام زندگی امر بالمعروف نہی عن المنکر اور احیائے سنت میں گذری، انھوں نے اپنے پیرو مرشد کی قائم کردہ مجلس دعوۃ الحق کو حضرت کے وصال

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

کے بعد از سر نو زندہ کیا، اس مجلس کے نمایاں مقاصد میں سے ایک مقصد احیائے سنت تھا الحمدللہ! اس کے ذریعے احیائے سنت کا کام بڑے مضبوط اور مستحکم طریقے پر انجام پایا، اس سلسلے میں حضرت کے افادات، آپ کے مجاز بیعت مشہور بزرگ حضرت مولانا حکیم محمد اختر صاحب نے ''ایک منٹ کا مدرسہ'' میں جمع کر دیے ہیں، اس کتاب میں کل ایک سو بیس اسباق ہیں جو تھوڑی فرصت والوں کے لیے بہترین تحفہ ہیں، مساجد کے ائمہ حضرات اگر کتاب میں بتلائے ہوئے طریقے کے مطابق یہ اسباق اپنے مقتدیوں کو پڑھانا شروع کر دیں تو وہ نماز، وضو، کھانے، پینے، سونے، جاگنے اور مسجد میں آنے جانے کی تمام سنتوں کا علم حاصل کر سکتے ہیں اور اُنہیں ایک سال میں تقریباً تین سو ساٹھ سنتیں یاد ہو سکتی ہیں۔

حضرت والا نے مجلس دعوۃ الحق کے زیر انتظام بے شمار مکاتب اور مدارس بھی قائم کیے، جن کے نظم و نسق کی تمام تر ذمہ داری حضرت والا اور آپ کے نائبین و خدام پر تھی، ان مدارس میں تصحیح کلام پاک پر خاص زور دیا جاتا ہے، حضرت کے یہاں کلام پاک کے حروف کی تجوید و صحت کے ساتھ ادائیگی پر اس حد تک زور تھا کہ بڑے بڑے اہل علم حضرات اس مقصد کے حصول کے لیے حضرت کے بتلائے ہوئے طریقے کے مطابق قاعدہ پڑھتے نظر آتے تھے، اسی طرح حضرت کے یہاں کلماتِ اذان کی ادائیگی کا ایک خاص اسلوب تھا اور مؤذنین و ائمہ کو اس کی بہ طور خاص تعلیم دی جاتی تھی۔

حضرت نے تبلیغ دین اور احیائے سنت کے مقصد سے بے شمار ملکی و غیر ملکی سفر کیے، آپ جہاں بھی تشریف لے جاتے علم و عمل کے دیوانے پروانوں کی طرح منڈلانے لگتے تھے، عرصۂ دراز سے تقریباً ہر سال حج بیت اللہ شریف کے لیے جانا آپ کا معمول تھا، آپ نے تقریباً پچاس حج کیے، مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے قیام کے دوران بھی بیرون ملک سے آئے ہوئے ہزاروں افراد آپ کی قیام گاہ پر حصول فیض

کے لیے جمع رہتے تھے۔

حضرت والا کی زندگی اپنے شیخ حضرت تھانویؒ کی عملی زندگی کا عکس جمیل تھی اُمت کے ہر فرد کا غم آپ کے دل میں اس طرح پیوست تھا کہ شاید ہی کوئی لمحہ آپ اس سے سکون پاتے ہوں، ہر مشکل گھڑی میں آپ نے اُمت مسلمہ کی رہنمائی کی مجھے یاد ہے کہ بابری مسجد کی شہادت کے بعد جب ہندوستان کے مسلمان شدید ترین مایوسی کا شکار تھے، آپ نے ان کی تسلی وتشفی کے لیے ایک ہدایت نامہ جاری فرمایا اور اس میں مسلمانانِ ہند کو اس مایوسی کے عالم سے نکلنے کے طریقے تلقین فرمائے، خود بھی متبع سنت تھے اور دوسروں کو بھی اسی رنگ میں رنگا ہوا دیکھنا چاہتے تھے، دورِ حاضر میں اتباع سنت کا جس قدر اہتمام حضرت کو تھا شاید ہی کسی دوسرے کو رہا ہو، ایک طرح سے آپ اسوۂ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مکمل اور جامع نمونہ تھے۔

آج حضرت شاہ صاحبؒ ہم میں موجود نہیں ہیں، لیکن آپ کی تعلیمات اور آپ کے افادات ہر دور میں ہماری رہنمائی کرتے رہیں گے، آپ کے قائم کردہ مدارس، آپ کی یادگار کے طور پر رہتی دنیا تک زندہ و پائندہ رہیں گے، آپ کے خلفاء اور مجازینِ بیعت کے ذریعے آپ کا فیض ہمیشہ جاری رہے گا، اللہ تعالیٰ آپ کے قبر کو نور سے بھر دے اور آپ کو آخرت کے بلند ترین درجات سے نوازے اور ہمیں آپ کے نقشِ کف پا پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

ملت کے عظیم رہ نما اور قائد

حضرت مولانا سیّد اسعد مدنیؒ

حضرت مولانا سیّد اسعد مدنیؒ کی زندگی کا سفر دہلی کے اپولو ہاسپٹل میں ۶ رفروری ۲۰۰۶ء کو اپنی آخری منزل پر پہنچ کر ختم ہوگیا، وہ ایک سال سے مختلف امراض میں مبتلا تھے اور لگ بھگ تین ماہ سے مسلسل بے ہوشی کی حالت میں تھے، اور اسی حالت میں خالقِ حقیقی سے جا ملے، اس میں شک نہیں کہ ان کی وفات کا سانحہ دوررس اثرات کا حامل ہے، اس سانحے سے نہ صرف ان کے اہل خاندان متأثر ہوئے ہیں بلکہ جمعیۃ علما ہند اور مدارس عربیہ سے وابستگان کو بھی ناقابل بیان صدمہ پہنچا ہے حقیقت یہ ہے کہ وہ جن غیر معمولی صلاحیتوں کے حامل انسان تھے بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں، ان کو اللہ نے مقبولیت، اور شہرت کی جن بلندیوں پر پہنچایا وہاں تک پہنچنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے، وفات کے بعد سے تدفین تک ہزاروں لوگ اُن علاقوں سے سفر کر کے دیوبند پہنچے جہاں سے اس مختصر اور محدود وقت کے اندر پہنچنا ممکن تھا، دور دراز سے لوگوں کے وفود اہل خاندان سے تعزیت اور اظہار افسوس کے لیے آج تک آرہے ہیں، آنے والوں میں اہل علم بھی ہیں، ارباب سیاست بھی ہیں، اور عوام الناس بھی، ایک بڑی تعداد ان لوگوں کی بھی ہے جو حضرت مولانا سے بیعت وارشاد کا تعلق رکھتے تھے، بہ ہر حال جو مقبولیت ان کے حصے میں آئی ہے وہ بہت کم

لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔

حضرت مولانا سیّد اسعد مدنیؒ رخصت ہوگئے، صرف یادیں باقی رہ گئیں جو آنے والی نسلوں کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوں گی، خاص طور پر ان لوگوں کے لیے جو ملک وملت کی خدمت کے ارادے سے میدان عمل میں قدم رکھیں گے، اور کچھ کرنے کے جذبے سے آگے آئیں گے، اللہ تعالیٰ نے مولانا کو جن خصوصیات سے نوازا تھا اُن میں سب سے زیادہ محیر العقول خصوصیت یہ تھی کہ وہ مختلف ومتضاد میدانہائے عمل میں سرگرم عمل تھے، اور ہر میدان میں ان کی سرگرمیوں کا دائرہ انتہائی وسیع تھا، ان کی اس خصوصیت نے انھیں معاصر علما اور قائدین میں ایسا امتیاز بخشا تھا دور حاضر میں جس کی نظیر نہیں ملتی، وہ ملت کی آبرو تھے، ان کے انتقال سے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ بہت دیر میں پُر ہوگا، اور ملت کا جو نقصان ہوا ہے اس کی تلافی میں بڑا وقت لگے گا۔

حضرت مولانا کی جو خصوصیت ہمیں سب سے زیادہ متأثر کرتی ہے وہ ربط وتعلق کی برقراری وہمہ گیری تھی، ان کا حلقۂ اثر بہت بڑا تھا، مگر اس حلقے کو باقی رکھنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ اس کے افراد سے برابر ربط رکھا جائے، حضرت مولانا کو یہ کمال حاصل تھا کہ وہ اس پہلو کو بھی اپنی سرگرمیوں کا ایک حصہ بنائے ہوئے تھے، مثال کے طور پر جن اداروں سے وہ وابستہ تھے، یا جن انجمنوں اور تنظیموں سے ان کا کسی بھی نوعیت سے کوئی تعلق تھا وہ کوشش کرتے تھے کہ ان کے معمولی سے معمولی اجلاس میں بھی شریک ہوں، دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ اور مجلس عاملہ کی کسی میٹنگ سے ان کی غیر حاضری کی کوئی مثال نہیں ہے، دارالعلوم کی شوریٰ کے موقع پر ہی وہ دہلی میں جمعیۃ علما کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس بھی رکھ لیتے تھے، کبھی کبھی گھریلو تقریبات بھی منعقد ہوتی تھیں، اوران میں قرب وجوار کے لوگ بڑی تعداد میں شرکت کرتے تھے، اگر کسی تقریب کا موقع نہ ہوتا تب بھی لوگوں کو پتہ چل جاتا تھا کہ حضرت مولانا دیوبند میں

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

تشریف رکھتے ہیں، اس لیے ملنے والوں کا تانتا بندھ جاتا، رمضان المبارک میں اعتکاف؛ عبادت کے ساتھ ساتھ مریدین و مسترشدین سے تعلق کی استواری کا بہترین ذریعہ بھی تھا، شاید ہی کبھی یہ اعتکاف قضا ہوا ہو، شروع میں معتکفین تعداد زیادہ نہیں ہوتی تھی، لیکن آخری سالوں میں مستقل اعتکاف کرنے والوں کی تعداد اچھی خاصی بڑھ گئی تھی، اعتکاف اور عید سے فراغت کے بعد حضرت مولانا کا عام طور پر دستور یہ تھا کہ وہ آس پاس کے علاقوں میں اپنے متعلقین سے ملنے کے لیے تشریف لے جاتے تھے، بعض اوقات ایک دن میں دس دس اور پندرہ پندرہ جگہوں کا دورہ ہوتا، پہلے سے طے شدہ نظام اور پروگرام کے مطابق جس جگہ تشریف لے جاتے وہاں علاقے کے بااثر لوگ اور عوام استقبال و ملاقات کے لیے پہلے سے منتظر ہوتے تھے، مدارس کے اجتماعات میں شرکت سے حضرت مولانا نے کبھی پہلو تہی نہیں کی، جب بھی کسی نے دعوت دی اپنی اور داعی کی سہولت کے مطابق تاریخ طے کردی، علاقے کے مدارس میں غلہ اسکیم کے اجتماعات اس طرح رکھے جاتے کہ حضرت مولانا کی شرکت سب میں ہوجاتی، صبح سے شرکت اور تقریر کا جو سلسلہ شروع ہوتا رات گئے تک جاری رہتا رابطے کا یہ پروگرام صرف مغربی یوپی تک ہی محدود نہیں تھا، بلکہ آسام، بنگال، بہار گجرات یہاں تک کہ جنوبی ہند کی ریاستوں بلکہ بنگلہ دیش اور پاکستان میں بھی مدارس کے اجتماعات میں شرکت کی یہی صورت ہوتی تھی، تسلسل کے ساتھ حاضری نے ان کو مدارس میں اور مدارس کے ذریعے عوام میں مقبول بنا دیا تھا۔

جمعیۃ علما ہند کے پلیٹ فارم سے بھی ربط باہم کے لئے کچھ نہ کچھ سرگرمی ہر وقت رہتی تھی، کبھی کہیں صوبائی کانفرنس، کبھی ضلعی پروگرام، کبھی ریلی، کبھی مظاہرہ کبھی سیمنار، کبھی میٹنگ، کبھی ختم نہ ہونے والا یہ سلسلہ علما اور عوام کو ان سے جوڑے رکھتا تھا، دارالعلوم دیوبند میں برسر اقتدار آنے کے بعد انہوں نے رابطۂ مدارس کی بنیاد ڈالی،

اور وقفے وقفے سے اس کے کئی اجتماعات منعقد کئے، رابطۂ مدارس نے مدارس کو دارالعلوم دیوبند سے قریب کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے، مسلم فنڈ جیسے مالیاتی اداروں کی صورت میں بھی عوامی خدمت کا ایک مضبوط وسیلہ انہیں ملا ہوا تھا، عوامی خدمت اور ربط کے کسی معمولی سے معمولی پہلو کو بھی انہوں نے کبھی نظرانداز نہیں فرمایا وہ دیوبند عیدگاہ کمیٹی کے صدر بھی تھے، اور سہارنپور کی جامع مسجد کمیٹی کے صدر بھی حالاں کہ یہ دونوں منصب ان کی بلند و بالا شخصیت کے مقابلے میں ہیچ تھے مگر خدمت اور ربط یہ دونوں پہلو ہمیشہ اُن کے سامنے رہتے تھے، اور اپنی طویل عوامی زندگی میں جو کامیابیاں انہوں نے حاصل کی ہیں ان کی بنیاد ہی یہ دو چیزیں ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ حضرت مولانا کو وراثت میں بہت سی اقدار اور روایات ملیں، یہ بھی صحیح ہے کہ اپنے گرامی قدر والد محترم شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے تلامذہ اور مریدین کے وسیع حلقے نے ان کے لیے دیدۂ و دل فرش راہ کئے مگر خود ان کے ذاتی اوصاف و کمالات بھی کم نہیں تھے، سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ انتہائی فعال اور متحرک انسان تھے، آرام ان کی زندگی میں تھا ہی نہیں، ہر وقت سفر، جلسے، جلوس کانفرنس، ملاقات، تقریر، بات چیت، شاید ہی اس کے پاس کوئی لمحہ فرصت کا ہو، شاید ہی کوئی وقت انھیں آرام کا ملتا ہو، ان تمام مصروفیات کے باوجود فرائض اور سنن ونوافل اوراد و وظائف کا اہتمام؛ حیرت ہوتی ہے کہ اللہ نے ان کے جسم میں کس قدر توانائیاں بھر دی تھیں کہ ۱۹۴۲ء میں سفر شروع ہوا تو باہوش زندگی کی آخری سانس تک نہ کبھی تھکن، نہ اکتاہٹ نہ منزل کی دوری کا احساس، نہ راستے کی صعوبتوں کی پرواہ۔

حضرت مولانا کے حوصلے بہت بلند تھے، ان جیسی اولوالعزمی اور بلند ہمتی بہت کم دیکھنے میں آتی ہے، جب آدمی کوئی کام کرتا ہے تو ضروری نہیں ہوتا کہ سب کچھ اس کی مرضی کے مطابق ہو، بسا اوقات راستے بہت دشوار ہوتے ہیں، اور منزل بہت دور

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

ہوتی ہے، لیکن راستے کی دشواریوں کو انگیز کرنا اور منزل سے بے پرواہ ہو کر سفر جاری رکھنا بڑے دل گردے کا کام ہے، اور حضرت مولانا نے یہ کام کر دکھایا، جمعیۃ علما ہند کا معاملہ ہو، یا دارالعلوم دیوبند کا، یا ملّی اور ملکی مسائل کا، ہر جگہ ہر محاذ پر ان کی زندگی مجاہدات سے بھری ہوئی تھی، حضرت مولانا کی زندگی سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ حوصلوں کے ساتھ جدوجہد کرنا، اور صبر و تحمل کے ساتھ نتائج کا انتظار کرنا ہی کامیابی کی دلیل ہے، حضرت مولانا کے مزاج کا یہ عنصر بھی بڑا اہم ہے کہ انہوں نے کبھی کسی معاملے میں کوئی موقف اختیار کیا تو اس سے کبھی انحراف نہیں کیا، خواہ اپنوں یا غیروں نے کتنی ہی مخالفت کیوں نہ کی ہو، جس بات کو حق سمجھا اس پر ڈٹے رہے، اور جلد یا بہ دیر اس معاملے میں کامیابی سے ہم کنار ہوئے۔

ملی اور ملکی سیاست میں مولانا نے سیکولرزم اور رواداری کو بنیاد بنایا اور ساری زندگی اسی بنیاد پر جمے رہے، حالانکہ بہت سے مرحلے ایسے آئے کہ سیکولرزم پر لوگوں کا یقین متزلزل ہو گیا، لیکن حضرت مولانا اسی طرح ثابت قدم رہے، مستقل مزاجی ان کی زندگی کا وہ پہلو ہے جس نے ان کو ملی قائدین کی صف اوّل میں کھڑا کر دیا ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ گذشتہ پندرہ بیس برسوں میں ان کے قد کا کوئی قائد ہی نہیں نظر آتا کانگریس کے ساتھ مستقل وابستگی نے بہت سے ملی مسائل کے حل میں مدد دی، خاص مسلسل اٹھارہ برس تک راجیہ سبھا کی ممبری کے صحیح حق دار وہی ثابت ہوئے، کیوں کہ انہوں نے کانگریس کی آئیڈیالوجی کی قیمت پر کبھی کوئی سمجھوتہ نہیں کیا، حالاں کہ بعض پرآشوب حالات میں حضرت مولانا نے اپنے بیٹے مولانا محمود مدنی کو کانگریس کے علاوہ دوسری پارٹیوں میں شامل ہونے اور ان کے ٹکٹ پر الیکشن لڑنے کی اجازت دی، مگر خود کبھی اپنے لیے اس پارٹی سے علیحدگی کو پسند نہیں کیا جسے انہوں نے اور ان سے پہلے ان کے والد محترم نے اپنے خون سے سینچ کر پروان چڑھایا، کانگریس میں رہ

کر حضرت مولانا نے حق بات کہنے کا سلسلہ جاری رکھا، دوسرے کانگریسی لیڈروں کی طرح وہ اپنے ہونٹوں پر مہر سکوت لگا کر نہیں بیٹھے، پارلیمنٹ کے ایوان بالا میں اٹھارہ سال کے دوران ملی مسائل پر ان کی تقریریں ہمارے دعوے کا ثبوت ہیں اور یہ مطبوعہ شکل میں دستیاب بھی ہیں، راجیہ سبھا سے باہر بھی انھوں نے جدوجہد کا سلسلہ جاری رکھا مختلف مسائل پر کنونشن اور کانفرنسیں منعقد کیں، اوران میں متعلقہ وزیروں کو بلا کر اپنی بات سرکاری ایوانوں تک پہنچائی، پانی سر سے اونچا ہوا تو ملک وملت بچاؤ تحریک بھی چلائی، اوراپنے متعلقین و منتسبین کے ساتھ دہلی کی جیل بھی بھری، اس سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت مولانا جیسا قدآور لیڈر اگر چاہے تو وہ پارٹی فورم میں رہ کر اپنی بات کرسیوں پر بیٹھے ہوئے لوگوں تک آسانی سے پہنچا سکتا ہے۔

حضرت مولانا جیسا تدبر، ان جیسی دوراندیشی اور مستقبل شناسی کا جوہر کم لوگوں میں ہوتا ہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ آدمی گردوپیش سے ہمہ وقت باخبراور متوقع خطرات سے آگاہ رہے، اس جوہر کے بغیر اچھی قیادت کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، آزادی کے بعد جو لوگ ملی قیادت کے محاذ پر نا کام ہوئے ان میں جذبے اور جوش کی کمی نہیں تھی بلکہ تدبر اور دوراندیشی کی کمی تھی، یہی وجہ ہے کہ حضرت مولانا کے علاوہ کوئی دوسرا قائد اپنی ہمہ جہت خدمات کے ساتھ منظر عام پر نہیں آسکا، یہ بات نہیں کہ کوششیں نہیں ہوئیں، کوششیں بہت ہوئیں، ان کے نتیجے میں قیادت بھی ابھر کر سامنے آئی، لیکن اس کی زندگی کے لمحے مختصر ہی رہے، صرف مسلم پرسنل لا بورڈ کی مجموعی قیادت کو کامیاب کہہ سکتے ہیں، مگر اس کامیابی کے عوامل اور اسباب کچھ الگ نوعیت کے ہیں، جن پر یہاں بحث کرنا موضوع میں شامل نہیں ہے۔

حضرت مولانا جیسا فعال اور جفاکش قائد اس ملت کو مشکل ہی سے ملے گا ہمیں یاد نہیں پڑتا کہ ہندوستان میں کہیں کوئی فساد ہوا ہو، یا کہیں کوئی زلزلہ یا ناگہانی

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

آفت نے ملک کو مشکلات میں ڈالا ہو اور جمعیۃ علما کا یہ فعال اور جفاکش قائد خم ٹھوک کر میدانِ عمل میں نہ آیا ہو، پھر چاہے آگ لگی ہو، یا گولیاں برس رہی ہوں، کوئی چیز اس کے قدم نہیں روک سکی، ملت نے بھی اس کی ایک آواز پر لبیک کہا، فسادات کے لیے فنڈ جمع کرنے کا معاملہ ہو یا زلزلہ زدگان کی اعانت کے لیے سرمایہ کے حصول کا سلسلہ ہو، خواہ انگریزی اخبار جیسے ملی مسائل میں مدد کی بات ہو، امت نے کبھی فراخ دلانہ اعانت سے دریغ نہیں کیا، ہم بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ اگر حضرت مولانا کی قیادت ملت کی امنگوں کا ترجمان تھی تو ملت بھی ان کی محبت اور عقیدت کے سُرور میں ڈوبی ہوئی تھی۔

حضرت مولانا کی بے شمار خوبیوں میں سے ایک خوبی یہ تھی کہ وہ سیاست اور شریعت کو اس طرح ساتھ لے کر چلے کہ کبھی ان پر یہ الزام نہ لگایا جاسکا کہ وہ سیاست میں الجھ کر شریعت کے تقاضوں کو فراموش کر بیٹھے یا شریعت کے دائرے میں اس طرح محصور ہوئے کہ سیاست کی خبر گیری نہ کرسکے، جب وہ میدان سیاست میں ہوتے تو ایک ماہر سیاست داں کی طرح اپنا کردار ادا کرتے اور جب مسند ارشاد پر بیٹھتے تو شریعت ہی سب کچھ ہوتی، اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ سیاست میں رہ کر بھی وہ اللہ کے رنگ میں رنگے رہے، سیاست داں سے زیادہ شیخ طریقت ہادی اور مرشد کی حیثیت سے ماحول پر چھائے رہے، یہ ان کا بڑا کمال تھا اور دور حاضر میں کوئی اس کمال میں ان کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔

میدانِ سیاست میں ایک فعال شخص کی حیثیت سے انھوں نے ایک طویل عرصہ گذارا، اس طویل عرصے میں ان کے دوست بھی بنے اور دشمن بھی، مخالفین بھی رہے اور موافقین بھی، اور ایسا ہونا فطرت کے بالکل عین مطابق ہے، مگر انہوں نے مخالفت سے گھبرا کر کبھی اُٹھا ہوا قدم واپس نہیں لیا، ہمت، دلیری، مستقل مزاجی اور

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

ثبات قدمی جیسے اوصاف ان کے مزاج کا حصہ بن چکے تھے، یہ وہ ہتھیار تھے جن کے ذریعے انھوں نے اپنے بڑے سے بڑے دشمن کو گوشۂ تنہائی میں بیٹھنے پر مجبور کر دیا، جو لوگ ہر موقف میں ان کا ساتھ دیتے تھے اور جنھوں نے کبھی کسی حال میں بھی ان کا ساتھ نہیں چھوڑا ان پر عنایات کی بے پناہ بارشیں بھی برسائیں اور ان کو زمین سے اُٹھا کر آسمان پر بھی بٹھایا، حضرت مولانا میں اللہ تعالیٰ نے مردم شناسی کا وصف رکھا تھا اور وہ اپنے اس وصف سے اپنی طویل مصروف زندگی میں ہر موقع پر فائدہ اُٹھاتے رہے، اس وصف نے ان کو لوگوں سے دور بھی کیا اور قریب بھی، مگر عملی زندگی میں جو ہدف انھوں نے اپنے لیے مقرر کیا تھا اس سے سر مو انحراف کرنا انھوں نے کبھی گوارا نہیں کیا، ایک اچھے رہنما اور بہترین قائد کی طرح وہ آگے ہی بڑھتے رہے۔

حضرت مولاناؒ کی زندگی کا ایک اہم پہلو جس کا عوامی مجلسوں میں بار بار ذکر آتا ہے وہ ان کے دستر خوان کی وسعت، کشادگی اور مہمان نوازی تھی، حضرت مولانا چاہے اپنے دولت کدے پر موجود ہوں یا نہ ہوں، ان کے صاحبزادوں میں سے کوئی دیوبند میں ہو یا نہ ہو، مگر آنے والوں کے لئے دستر خوان اسی طرح بچھایا جاتا جس طرح میزبان کی موجودگی میں بچھایا جاسکتا ہے، اس کے لیے دولت کدے پر کئی ملازمین مستقلاً موجود رہتے، یہ جود وسخا حضرت مولانا کو اپنے والد گرامی قدر سے ورثے میں حاصل ہوئی تھی، ضروری نہیں کہ دستر خوان انواع واقسام کے کھانوں سے لبریز ہو، سادگی کے ساتھ پیٹ بھر کھانا بھی مہمان کی عزت افزائی اور دل جوئی میں مؤثر ثابت ہوتا ہے۔ افسوس! بہت سے علما اس کی اہمیت نہیں سمجھتے، ایسے تمام لوگوں کو جو اجتماعی زندگی کا حصہ بننا چاہتے ہوں حضرت مولانا کی زندگی کے اس اہم پہلو سے سبق ضرور لینا چاہیے، یوں مہمان نوازی کو اجتماعی زندگی کی قید میں مقید کر دینا بھی غلط ہے، یہ تو سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے، جو اور سنتوں کی طرح متروک

ہوتی جارہی ہے۔

حضرت مولانا کی زندگی کے کس کس پہلو کا تذکرہ کیا جائے، لوگ اپنے اپنے مشاہدات کی روشنی میں اپنے اپنے تعلقات کی نوعیت کے اعتبار سے ان کے محاسن اور فضائل پر روشنی ڈالیں گے، حقیقت یہ ہے کہ میرا مشاہدہ بہت دور کا ہے، ''ترجمان دیوبند'' کے زیرِ نظر شمارے میں ایسے کئی حضرات کے مضامین شائع کیے جارہے ہیں جنھوں نے حضرت مولانا کو بہت سے قریب سے دیکھا ہے اور بہت دیر تک دیکھا ہے، راقم السطور کا تعلق کبھی علیک سلیک سے آگے نہیں بڑھا، اور اس علیک سلیک کی نوبت بھی پوری زندگی میں شاید ایک آدھ بار ہی آئی ہو، مجلس میں حاضری کا تو کبھی موقع ہی نصیب نہیں ہوا، اس لیے میں حضرت مولانا کی زندگی کے محاسن پر کچھ زیادہ لکھنے پر قادر نہیں ہوں۔

طالب علمی کے دور میں کچھ مضامین جمعیۃ کی سرگرمیوں کو عنوان بنا کر لکھے گئے، ظاہر ہے اس میں حضرت مولانا کے نظریات کو بھی موضوع بحث بنایا گیا، لیکن یہ سلسلہ یک لخت اُس وقت رک گیا جب تکمیل ادب میں داخلے کے لیے میرے مشفق و محسن مربی اور استاذ حضرت مولانا وحید الزماں صاحب کیرانوی نور اللہ مرقدہ نے یہ شرط رکھ دی کہ اس طرح کے مضامین نہ لکھے جائیں وہ دن اور آج کا دن کبھی اس طرف طبیعت راغب نہیں ہوئی، حالاں کہ ۸۰ء کے بعد دیوبند میں ایک طوفان بلاخیز آکر گذر گیا اور اچھے اچھے اس کی رو میں بہہ گئے، مگر راقم السطور نے اپنے استاذ سے کیا ہوا وعدہ پورا کیا، اگرچہ خود استاذ محترم کی زندگی کا آخری دور اس نقطۂ نظر سے تلخ تجربات کا حامل رہا۔

۸۰ء کے بعد کا دور بڑا نازک تھا، خاص طور پر ان لوگوں کے لیے جو دارالعلوم کے پروردہ ہیں اور اس سے محبت رکھتے ہیں، جب انقلاب آیا تو وفاداریاں بدلیں

محبت اور نفرت کے پیمانے تبدیل ہوئے اور جب اندھیرا چھٹا تو بہت دیر ہو چکی تھی حضرت مولانا سیّد اسعد مدنیؒ اس پورے منظر میں نمایاں تھے، دوسری طرف حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی تھے، راقم السطور بھی ہزاروں فرزندانِ دارالعلوم کی طرح اس اختلاف سے رنجیدہ اور ملول رہا، اور اسے جب بھی موقع ملا اس نے اتحاد کی بات کی، ''ترجمان دیوبند'' کے شماروں میں راقم السطور کی تحریریں اس کا ثبوت ہیں، آج تاریکی چھٹ چکی ہے اور اُمیدوں کی صبح روشن ہو چکی ہے، بہت ممکن تھا حضرت مولانا محمد سالم قاسمی کی مزاج پرسی کے جواب میں خاموشی اختیار کر لی جاتی، اور اتحاد کا خواب ادھورا رہ جاتا، لیکن حضرت مولانا سیّد اسعد مدنیؒ کی مثبت فکر اور دور اندیشی کی عادت نے جواب دلوا کر اُمیدوں کے چراغ روشن کر دیئے، آج وہ دنیا میں نہیں ہیں، لیکن اتحاد کے جس سلسلے کو وہ آگے بڑھا چکے تھے، اگر ان کو حیات مستعار کے چند ماہ و سال اور میسر آجاتے تو شاید یہ سلسلہ اور آگے بڑھتا، اب ان کے نسبی، فکری، اور عملی وارثین کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ ان کے چھوڑے ہوئے کاموں کو پایۂ تکمیل تک پہنچائیں حضرت مولانا کو اصل خراج عقیدت یہی ہوگا۔

❁❁❁

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

سفر تمام ہوا آبلوں پہ چلتے ہوئے

صحافی بابو نسیم مسعود عثمانی

بابو نسیم مسعود عثمانی بھی اللہ کو پیارے ہو گئے، موت ہر شخص کو آتی ہے، کسی کو پہلے، کسی کو بعد میں، مگر جانے والوں کا غم فطری ہوتا ہے، جس کو جس سے جتنا تعلق ہوتا ہے اتنا ہی وہ اس کی جدائی کا دکھ محسوس کرتا ہے، بابو جی کے بارے میں اگرچہ ہر شخص اس خبر کے لیے آمادہ ہو چکا تھا، کیوں کہ وہ تھے ہی ایسی جان لیوا بیماری میں مبتلا جس سے بچ پانے کی کوئی اُمید ہی نہیں تھی، اس کے باوجود ان کے انتقال کی خبر سے ہر شخص افسردہ ہو گیا، چند ماہ پہلے تک وہ اچھے بھلے تھے، اچانک بخار رہنے لگا، پیٹ کی شکایت ہمیشہ سے تھی، مقامی معالجین کے زیر علاج رہے، کچھ افاقہ نہ ہوا تو دہلی کے بڑے ہسپتالوں میں دکھلایا گیا، وہاں ٹیسٹ وغیرہ کئے گئے، تشخیص ہوا کہ بلڈ کینسر ہے بابو جی کو اس کی بھنک بھی لگنے نہیں دی گئی، وہ یہی سمجھتے رہے کہ پیٹ کی تکلیف ہے نظام ہضم خراب ہے، اسی سے حرارت وغیرہ بھی ہے، وہ آخری لمحوں تک اسی اُمید پر جیتے رہے کہ میں اچھا ہو جاؤں گا، میں جب بھی عیادت کے لیے گیا انہیں پُر امید ہی پایا، فون پر وفات سے چند روز پہلے بات چیت ہوئی کہنے لگے کہ پہلے سے بہتر ہوں بس کمزوری ہے، خون چڑھوایا ہے، ایک بوتل اور چڑھے گا انشاء اللہ ٹھیک ہو جاؤں گا انہیں کیا معلوم تھا کہ وہ ایک خطرناک بیماری میں مبتلا ہیں، اور اب دوا علاج کے

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

بجائے کوئی معجزہ ہی انہیں بچا سکتا ہے، یہی ہوا بھی، ۷؍جولائی ۲۰۰۶ء کو اچھے خاصے تھے، اچانک ضعف اور گھبراہٹ محسوس کی، ڈاکٹر نے دیکھا سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا نبض کام کر رہی تھی، بلڈ پریشر صحیح تھا، مگر موت سر پر کھڑی تھی، ادھر ڈاکٹر گھر سے نکلا ادھر موت نے زندگی کو شکست دی۔

بابو نسیم مسعود عثمانی دیوبند کے عثمانی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے، یہ خاندان ہمیشہ سے علم وادب کا گہوارہ رہا ہے، اس کے اثرات بابو جی میں بھی بہ درجۂ اتم موجود تھے اور اسی لیے انہوں نے صحافت کی طرف رُخ کیا، بنیادی طور پر وہ ہندی کے صحافی تھے اور روزنامہ ''ہندوستان'' سے بہ حیثیت نامہ نگار وابستہ تھے، بعد میں جب قومی آواز کی اشاعت نئی دہلی سے شروع ہوئی تو وہ اس کے نامہ نگار بھی بن گئے، اس طرح وہ بہ یک وقت اُردو اور ہندی کے اہم اخباروں کے نامہ نگار بن کر دیوبند میں اُبھرے انہوں نے ۱۹۸۰ء کے آس پاس خود اپنا اخبار بھی نکالا، جو سرمائے کی قلت کی بنا پر جلدی ہی بند بھی ہو گیا، ہندی اخبار میں خبروں کے ساتھ ان کا کیا طرز عمل تھا مجھے نہیں معلوم، لیکن اُردو میں جو خبریں وہ دیتے تھے ان کے سلسلے میں ان کا اپنا خاص نقطۂ نظر تھا، ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ان کو کسی جلسے وغیرہ کی خبر دی اور انہوں نے من وعن آگے بڑھا دی، بلکہ وہ خبر کو غور سے پڑھتے، اس کے بال و پر تراشتے، بلکہ بعض اوقات اس کا مثلہ بنا دیتے، مگر خبر اپنی مرضی کی بناتے، اور اپنی مرضی سے بھیجتے، اس سلسلے میں لوگوں کو ان سے شکایت بھی ہوتی، مگر وہ یہ کہتے تھے کہ ہمیں اخبار کی پالیسی بھی دیکھنی ہے مقامی حالات کی نزاکتوں پر نظر بھی رکھنی ہے، وہ دوسرے نامہ نگاروں کی طرح نہیں تھے، ان میں سوجھ بوجھ تھی، وہ حالات کا باریکی سے تجزیہ کرتے تھے، خاص طور پر متنازعہ معاملات میں وہ احتیاط کے تمام پہلوؤں پر دھیان دیا کرتے تھے۔

دارالعلوم دیوبند کے جھگڑوں کے زمانے میں اُردو کا صرف یہی ایک اخبار تھا

جو دیوبند اور اطراف میں پڑھا جاتا تھا، اس وقت متعلقین دارالعلوم کو صرف قومی آواز پر ہی انحصار کرنا پڑتا تھا، شاید ہی کوئی دن ایسا گزرتا ہو جب اس قضیے کی کوئی خبر نہ آتی ہو، یا تبصرہ شائع نہ ہوتا ہو، بابو جی اس زمانے میں مشہور بھی بہت ہوئے اور قومی آواز کی تعداد اشاعت میں بھی اضافہ ہوا، بعد میں وہ قدیم روش سے سر مو انحراف نہ کرنے کے اپنے موقف کی وجہ سے دوسرے اخبارات کے روز افروزں معیار سے شکست کھا گیا، مگر بابو جی کی دل چسپی خبروں سے اسی طرح برقرار رہی، وہ ہر موقع پر پہنچتے گھر بیٹھ کر خبریں گھڑنے اور تراشنے کے وہ قائل نہیں تھے، جو لکھتے مشاہدے اور تصدیق کے مرحلے سے گزرنے کے بعد لکھتے۔

صحافت ان کا شوق تھا، پیشہ نہیں تھا، اس لیے وہ زندگی بھر عسرت وتنگ دستی کا شکار رہے، بہت سے نامہ نگار شوق بھی پورا کرتے ہیں اور مختلف ذرائع سے پیسہ بھی کما لیتے ہیں، مگر انھوں نے کبھی مادی منفعت حاصل نہیں کی، بلکہ اچھا برا جو کچھ لکھتے رہے وہ ایمان داری سے لکھتے رہے، وہ اپنے حلیے سے بھی قلندر معلوم ہوتے تھے، اور مزاج کے بھی قلندر تھے، قناعت ان کی سرشت میں داخل تھی، کثیر العیال تھے، لیکن کبھی فراخیِ مال اور کشادگی رزق کے لیے نہ کسی کے آگے اپنا دامن نہیں پھیلایا اور نہ کسی کے سامنے دست سوال دراز کیا، صحافت کی قیمت پر انھوں نے زندگی کی آخری سانس تک کوئی سمجھوتہ نہیں کیا، وہ صحافت میں چائے، ناشتے کے بھی قائل نہیں تھے، چہ جائے کہ نقد رقم قبول کریں، ایک مرتبہ ضلع انتظامیہ نے یہ طے کیا کہ مقامی صحافیوں کو اعزاز دیا جائے، اور ان کی کارکردگی پر انہیں شال وغیرہ اڑھایا جائے، بابو جی اس میٹنگ میں شریک تھے جس میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا، ہر شخص نے اس تجویز کی تحسین کی، تنہا بابو جی کی رائے مخالفت میں تھی، انھوں نے کہا کہ کیا صحافیوں کو بھی ایوارڈ دیئے جائیں گے اس طرح ان کی صحافت پر حرف آئے گا، ایمان داری اور غیر جانب داری متاثر ہوگی

صحافی انتظامیہ کے حق میں لکھنے پر مجبور ہوں گے، یہ تھا بابو جی کی صحافت کا معیار، اس دور میں بھی وہ ایمان دارانہ صحافت کی شمع جلائے بیٹھے تھے، حیرت ہوتی ہے۔

اصول پسندی اور ایمان داری ان کے مزاج کا حصہ تھی، میں نے ان سے بہت سے کام کرائے، خاص طور پر ''ترجمان دیوبند'' کی سہانپور، دہلی وغیرہ سے منظوری کرانے میں انہوں نے خاص کردار ادا کیا، ایل نمبر کے لیے کئی مرتبہ بریلی گئے، جو رقم میں نے انہیں دی واپسی کے بعد انہوں نے باقی ماندہ رقم فوراً واپس کردی ایمان دار لچک نہیں کھاتا، وہ نہ کسی سے ڈرتا ہے، اور نہ کسی کے دبدبے سے متأثر ہوتا ہے، بابو جی کچھ ایسے ہی تھے جو سوچتے وہ کہتے اور اپنے موقف پر ڈٹے رہتے، ایسا نہیں تھا کہ وہ ضدی طبیعت رکھتے تھے، اپنے موقف کے حق میں ان کے پاس دلائل بھی ہوتے تھے، اور وہ بحث کے لیے تیار بھی رہتے تھے، اور اگر وہ بحث پر اتر آئیں تو ان سے جیتنا مشکل ہوتا تھا۔

آدمی اصول پسند اور ایمان دار ہو تو خوددار بھی ہوتا ہے، اُن پر مصائب کے پہاڑ بھی ٹوٹے، اقتصادی اعتبار سے وہ کبھی مضبوط نہیں رہے، تنگی کا شکار رہے، لیکن انھوں نے کبھی اپنی خودداری اور عزت نفس کا سودا نہیں کیا، آخر میں مکان کا قضیہ بھی پیش آیا تھانہ پولیس بھی ہوئی، فریق مخالف نے طاقت کا سہارا بھی لیا، لیکن انہوں نے کبھی انتظامیہ میں اپنے تعلقات سے فائدہ نہیں اُٹھایا، حالاں کہ بہ حیثیت صحافی وہ اپنے اثرات کی بنیاد پر فریق مخالف کو پریشان کرسکتے تھے، مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا خاموشی کے ساتھ کرائے کے ایک بہت ہی معمولی اور تنگ مکان میں منتقل ہوگئے مالک مکان نے وہ مکان خالی کرانا چاہا تو دوسرے محلّے میں واقع اپنے سسرالی مکان میں چلے گئے، ہم سے انہوں نے بارہا چاہا کہ یہ مسئلہ حل کرادیں، ہم نے کوشش بھی کی، لیکن افسوس ہماری یہ کوشش بارآور نہ ہوسکی، اللہ تعالیٰ انہیں اس کا اجر آخرت میں

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

عطا فرمائے۔

اصول پسندی ان کی ہر جگہ ہر موقع پر تھی، یہاں تک کہ وہ کھانے پینے میں بھی اصول پسند واقع ہوئے تھے، مرغن غذاؤں سے زبردست پرہیز تھا، باہر کی کوئی چیز انہیں پسند نہیں تھی، چائے تک ہوٹلوں کی نہیں پیتے تھے، یہ احتیاط وہم کی حد تک تھی، مگر اس تمام تر احتیاط کے باوجود عمر بھر سوزش معدہ میں مبتلا رہے آخر میں کینسر کا شکار بنے اور اسی میں جاں بہ حق ہوئے، یہ بڑا کرم ہوا کہ وہ اس خوف ناک مرض کی آخری کیفیت سے محفوظ رہے، جو انتہائی تکلیف دہ اور اذیت ناک ہوتی ہے، مریض کے لیے بھی اور تیمارداروں کے لیے بھی، ایک طرح سے یہ اچھا ہی ہوا کہ ابھی مرض اپنی انتہائی شکل اختیار نہیں کر پایا تھا کہ وہ موت کی آغوش میں چلے گئے۔

خوددار انسان میں تملق اور چاپلوسی نہیں ہوتی وہ جو کچھ سوچتا ہے کہتا ہے، اور صاف کہتا ہے، آدمی میں لاکھ اچھے اوصاف ہوں لیکن صاف گوئی اور حقیقت پسندی معاشرے میں گوارا نہیں کی جاتی، یہی وجہ ہے کہ بابو جی سیاست میں ناکام رہے یہاں تک کہ اپنے محلے کے حلقے سے بلدیہ کا انتخاب لڑا اور محض اس لیے ناکام ہوئے کہ ووٹ مانگنے کے وقت بھی انھوں نے کسی کے آگے سر نیاز خم نہیں کیا، تاڑ کے درخت کی طرح سیدھے کھڑے رہے، اس موقع پر تو اچھے اچھے قد آور لوگ سجدہ ریز ہو جاتے ہیں ہم نے ان سے کہا الیکشن لڑنا آپ جیسے اچھے لوگوں کا کام نہیں ہے، یہ تو ان لوگوں کا کام ہے جو قدم قدم پر جھوٹ بولتے ہیں، جھوٹے سچے وعدے کرتے ہیں، منہ پر تعریف اور پیٹھ پیچھے برائی کرتے ہیں، صاف گو لوگوں کو یہ مشغلہ رأس نہیں آتا، اچھا ہی ہوا انہوں نے اس شغل سے توبہ کر لی ورنہ ہمیشہ ناکام ہی رہتے۔

راقم السطور سے ان کو بڑا تعلق تھا، اکثر و بیشتر میرے مکتبے میں آتے رہتے تھے، کوئی خاص واقعہ رونما ہوتا تو اس پر تبادلۂ خیال کے لیے بھی وہ زحمت کرتے تھے

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

کبھی کبھی کسی پیچیدہ خبر کی نوک و پلک سنوارنے میں بھی وہ میرے مشوروں پر عمل کرتے تھے، اور اس کی قدر بھی کرتے تھے، خاص طور پر حضرت مولانا محمد سالم قاسمی اور حضرت مولانا اسعد مدنیؒ کے صلح کی تاریخی واقعے کی رپورٹنگ کے دوران انہوں نے جو کچھ لکھا اس میں وہ مجھ سے برابر مشورہ کرتے رہے، اور اس کی وجہ یہ رہی کہ اس معاملے سے مجھے خاص دل چسپی تھی اور کئی مضامین میرے اس سلسلے میں چھپ چکے تھے اسی لیے وہ یہ سمجھتے تھے کہ شاید میں اس سلسلے میں کچھ زیادہ معلومات رکھتا ہوں۔

مستقل مزاجی نے ان کی شخصیت کا پیکر تراشا تھا، لباس ہمیشہ ایک وضع کا پیروں میں ہمیشہ ایک ہی طرح کے چپل، سر پر لمبے بال کبھی ان میں ایک انچ کا بھی فرق نہیں آیا، داڑھی صفاچٹ، مونچھیں بڑی بڑی، چوڑی کمانی اور موٹے شیشوں کا بڑا سا چشمہ، سردی میں باوا آدم کے زمانے کا اوورکوٹ یا ہلکے وزن کی رضائی، ان کا یہ پیکر ہماری نگاہوں میں کچھ اس طرح رچ بس گیا تھا کہ ہم ان لوازمات کے بغیر مسعود عثمانی کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے، یہ مستقل مزاجی ان کی میل ملاپ میں بھی تھی، جن مجلسوں میں بیٹھتے تھے، جن لوگوں سے وہ ملتے جلتے تھے ان مجلسوں میں سالہا سال تک پابندی کے ساتھ بیٹھتے رہے اور ان لوگوں سے ہمیشہ ملتے رہے، حضرت مولانا انظر شاہ کشمیریؒ کی مجلس یاراں عموماً گیارہ بجے شب میں شروع ہوتی ہے، وہ اس مجلس یاراں کے مستقل رکن تھے، اور پابندی کے ساتھ حاضر باش رہتے تھے، چپ رہنے والوں میں نہیں تھے بحث میں پوری طرح حصہ لیتے تھے، زاہد تھے، مگر زاہد خشک نہیں تھے، کوئی اُن سے اچھی طرح ملتا تو وہ اس سے ٹوٹ کر ملتے، کوئی ان سے کنارہ کشی اختیار کرنا چاہتا تو وہ اس سے کوسوں دور بھاگتے، مگر منتقمانہ مزاج نہیں تھا، اگر ان کے ساتھ کہیں کوئی ناانصافی ہوتی تو وہ اسے صبر کے ساتھ انگیز کرتے، حق مغفرت کرے بہت سی خوبیوں کا انسان رخصت ہوا ہے اور اپنے پیچھے بہت سی یادیں چھوڑ گیا ہے، انہوں نے جس

طرح پر مشقت، اور مصیبتوں سے بھری زندگی گزاری اس کے پیش نظر یہ شعر سنانے کو جی چاہتا ہے:

اب کیا ہمیں ستائیں گی دوراں کی گردشیں
اب ہم حدود سود وزیاں سے نکل گئے

ان پر نیکی بھی غالب تھی، پانچوں وقت کی نمازیں پابندی کے ساتھ ادا کرتے رمضان کے روزے بھی رکھتے، اور تلاوت کلام پاک کا اہتمام بھی کرتے، ان کی ذات سے کبھی کسی کو کوئی تکلیف نہیں پہنچی، بیوی بچوں کے، پڑوسیوں کے، رشتہ داروں کے، دوستوں کے سب ہی کے حقوق ادا کرتے رہے، یہی ایک کامیاب زندگی کی پہچان ہے۔

اللہ تعالیٰ ان کی بال بال مغفرت کرے، ان کی سیئات کو حسنات میں بدل دے اپنے جوار رحمت میں جگہ دے، ''ترجمانِ دیوبند'' کے قارئین سے دعائے مغفرت کی خصوصی درخواست ہے۔

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود

دیوبند کے ایک صحافی اسلم انصاری

دارالعلوم کے آس پاس ایک صاحب ہاتھ میں ڈائری تھامے صبح شام چکر لگاتے ضرور نظر آتے، خاص طور پر اس وقت جب دارالعلوم میں کسی خاص شخص کی آمد ہوتی، یا کوئی جلسہ ہوتا، یا مجلس شوریٰ اور مجلس عاملہ کی میٹنگ ہوتی، معلوم ہوا کہ یہ اسلم انصاری ہیں، ہندی روزنامہ ''دینک جاگرن'' میرٹھ کے مقامی نامہ نگار، بعد میں ان سے تعارف بھی ہوگیا، میرے پاس آنے جانے بھی لگے، کبھی کبھی کسی قومی یا بین الاقوامی واقعے پر میرا ردّعمل بھی معلوم کرلیتے اور اسے شائع کردیتے، اس طرح تعلق بڑھتا ہی گیا۔

غالباً یہ ۱۵؍جولائی ۲۰۰۶ء کی تاریخ تھی، صبح جب میں دارالکتاب میں آیا تو ایک دوست نے بتلایا کہ اسلم انصاری شدید بیمار ہیں، ڈاکٹروں نے انہیں میرٹھ ریفر کردیا ہے، پیٹ کے درد کی شکایت کے بعد انہیں مقامی ڈاکٹروں کو دکھلایا گیا تھا مرض سمجھ میں نہیں آیا، میرٹھ کے کسی ہسپتال میں علاج شروع ہوا، آپریشن کے لیے پیٹ چاک ہی کیا گیا تھا کہ ڈاکٹروں نے عمل جراحی روک دیا، معلوم ہوا آنتیں ختم ہوچکی ہیں، کینسر کے بے رحم مرض نے ان کو کھالیا ہے، ڈاکٹروں نے مرض کو لاعلاج قرار دے کر واپس کردیا، اعزّہ انہیں اس حال میں دیوبند واپس لائے کہ جسم میں

برائے نام سانس باقی تھا، کچھ دیر انہیں سرکاری ہسپتال میں رکھا گیا، میں انہیں وہیں دیکھنے کے لیے گیا، آکسیجن پر تھے، ہسپتال میں رشتہ داروں کے علاوہ دوستوں اور مداحوں کی اچھی خاصی تعداد تھی، بہت سے سرکردہ حضرات بھی عیادت کے لیے آجارہے تھے، اس دن مجھے اندازہ ہوا کہ یہ شخص ایک صحافی کی حیثیت سے کس قدر مقبول ہے، اسی رات دس گیارہ بجے ان کا انتقال ہوگیا، جنازے کی نماز دارالعلوم دیوبند کے احاطہ مولسری میں سینکڑوں لوگوں کی موجودگی میں ادا کی گئی اور انصاریوں کے قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔

اسلم انصاری نہایت ہنس مکھ اور ملنسار انسان تھے، ہر ایک سے اچھی طرح ملتے تھے، جس پیشے سے وابستہ تھے اس کے تئیں مخلص بھی تھے اور ایمان دار بھی، نیز مستعد بھی تھے، کہیں کوئی واقعہ ہوا اور اسلم انصاری وہاں موجود، عمرانہ اور گڑیا والے معاملے میں ان کی تگ و دو دیدنی تھی، صحافت میں اپنا مقام بنانے کے لیے انہوں نے بڑی جدوجہد کی، اور جب مقام بن گیا، اور شناخت حاصل ہوگئی تو رخصت ہوگئے، یہی ہے عروج وزوال کا فلسفہ۔

دوتین سال سے انہوں نے رمضان المبارک میں اس ہندی روزنامے میں جس سے وہ وابستہ تھے ایک دینی کالم کی ابتدا کی تھی، روزآنہ وہ کسی نہ کسی عالم سے کسی دینی موضوع پر لکھواتے اور اسے شائع کراتے، خود کہتے تھے کہ یہ ان کا کارنامہ ہے کہ انہوں نے ایک ہندو اخبار میں خالص مسلم کالم شروع کرادیا، یقیناً اس کے ہزاروں لاکھوں مسلمان قارئین بھی ہیں، ان کی نگاہوں سے وہ مضامین ضرور گزرتے ہوں گے، ہوسکتا ہے غیر مسلم بھائی بھی پڑھ لیتے ہوں، عجب نہیں کہ ان کا یہ عمل عنداللہ مقبول ہو اور ان کی نیک نیتی کا صلہ بخشش کی صورت مل جائے، خدا کے یہاں کس چیز کی کمی ہے؟ راقم السطور کے مضامین بھی وہ رمضان کے موضوع پر شائع کرتے رہتے تھے

اور اس طرح اس نیک کام میں مجھے بھی شریک بنالیا کرتے تھے۔

جوان العمری میں ان کی اس اچانک موت سے دل کی کیا کیفیت ہوئی، بتائی نہیں جاسکتی، کئی دن تک دل ودماغ پر اثر رہا، بار بار ان کا چہرہ نگاہوں کے سامنے آجاتا تھا، جو اَب منوں مٹی کے نیچے چھپ گیا ہے، سب کا انجام یہی ہونے والا ہے دنیا کا یہی دستور ہے، اللہ تعالیٰ ان کے گناہ معاف فرمائے، ان کو اپنے سایۂ رحمت وعافیت میں جگہ دے، ان کے پس ماندگان کو صبر جمیل کی توفیق بخشے، آمین۔

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

قادرالکلام شاعر، متواضع مفتی اور عالم

مفتی کفیل الرحمٰن نشاطؒ

موت ایک اٹل حقیقت ہے، مگر آدمی پھر بھی اس سے دور بھاگتا ہے، اور بچنے کی کوشش کرتا ہے، حالاں کہ اسے معلوم ہے کہ بھاگنے سے کوئی فائدہ نہیں، موت آنی ہے،ضرور آئے گی۔ بہ قول شاعر ؎

عمر بھر زیست کے ہمراہ اجل جاتی ہے
تاک میں رہتی ہے یک لخت نگل جاتی ہے

اس حقیقت کو ماننے کے باوجود اگر یہ موت کسی کو دفعۃً آدبوچے تو سننے والے کو یقین ہی نہیں آتا، ہر آدمی یہ کہتا نظر آتا ہے! ارے نہیں! ابھی تو انہیں دیکھا تھا، صبح تو ملے تھے، رات تو اچھے خاصے تھے، کل شام تو میں نے انہیں بازار میں دیکھا تھا، اس طرح کے جملے اچانک واقع ہونے والی موت کے بعد عام طور پر بولے جاتے ہیں کچھ یہی صورت حال اس وقت پیش آئی جب مورخہ یکم اگست ۲۰۰۶ء بروز بدھ ۱۰ بجے کے آس پاس ایک صاحب نے فون کر کے بتلایا کہ مفتی کفیل الرحمٰن نشاؔط کا انتقال ہوگیا، پہلے تو یہ گمان ہوا کہ شاید میں غلط سن رہا ہوں، پھر یہ خیال ہوا کہ شاید بتلانے والے کو مغالطہ ہوگیا ہو، ابھی یقین و بے یقینی کی یہی کیفیت تھی کہ کسی اور شخص نے بعینہٖ یہی خبر سنائی، اتنے میں دارالعلوم کی مسجد سے بھی اعلان ہوگیا، اب تو یقین کرنا ہی پڑا

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

حالاں کہ یہ یقین بڑا مشکل تھا، اس لیے کہ گذشتہ شب مغرب کے بعد وہ میرے مکتبے میں ملاقات کے لیے تشریف لائے تھے، زیرلب مسکراہٹ اور خاموش تکلم کے ساتھ کچھ دیر بیٹھے رہے، میں ایک فون میں مصروف تھا، فون سے فارغ ہوا تو علیک سلیک کے بعد مقصد کی بات کی اور رخصت ہوئے، کسے معلوم تھا کہ جانے والا شخص جو مصافحہ کر کے جا رہا ہے وہ مجھ سے اس کا آخری مصافحہ ہے اور یہ رخصتی آخری رخصتی ہے اب نہ کبھی اسے دیکھ پائیں گے اور نہ کبھی ملاقات ہوگی۔

مفتی کفیل الرحمٰن نشاطؔ بڑی خوبیوں کے انسان تھے، سب سے بڑی خوبی ان میں یہ تھی کہ وہ نہایت کم گو واقع ہوئے تھے، اور اپنی اس خوبی کی بنا پر وہ بہت سی ایسی برائیوں سے محفوظ تھے جن میں عام طور پر لوگ مبتلا رہتے ہیں، شاید ہی وہ کسی کی غیبت کرتے ہوں، کسی کو برا کہتے ہوں، کسی کا مذاق اڑاتے ہوں، اپنے کام سے کام نہ کہیں آنا نہ جانا، نہ کسی سے بہت زیادہ میل ملاپ، نہ کسی سے بہت زیادہ دوری، کسی سے ملاقات بھی کرنی ہو تو کسی اشد ضرورت کے تحت، بلاوجہ آنے جانے کے قائل نہیں تھے، آنے کے بعد حرف مدعا زبان پر لائے، جواب سنا اور رخصت، نہ چائے نہ ٹھنڈا ہر وقت تیز گامی، اس طرح ہوا کے جھونکوں کے مانند آتے اور جاتے جیسے ساری دنیا کے کام ان ہی کے ذمے ہوں، اور انہیں جلد از جلد نمٹانا ہو۔

مسجد چھتہ کے قریب واقع چھوٹی مسجد کے ایک کمرے میں ان کا قیام رہتا تھا، گھر تو وہ صرف کھانے اور سونے کے اوقات میں جایا کرتے تھے، باقی تمام وقت مسجد کے اس حجرے میں گزرتا تھا جس میں کبھی ان کے جدامجد مفتیِ اعظم حضرت مولانا عزیز الرحمٰن عثمانیؒ اور پھر ان کے والد ماجد قاری جلیل الرحمٰن عثمانیؒ رہتے تھے، اس مسجد میں وہ پنج وقتہ نمازوں کے امام بھی تھے، وقت کی پابندی ان کے مزاج میں رچ بس گئی تھی، اگر کسی دن کسی خاص وقت ایک کام میں مشغول نظر آتے تو دوسرے دن بھی ان

کو اسی وقت اسی کام میں مشغول دیکھا جا سکتا تھا، گھر کس وقت جانا ہے، کس وقت واپس آنا ہے، کس وقت کیا کرنا ہے، مجال ہے ایک لمحے کی بھی تاخیر ہو جائے، مزاج میں نظم وضبط اس قدر تھا کہ ہر چیز اپنی خاص جگہ پر سلیقے سے رکھی ملتی، سوئی سے لے کر کتاب تک کی جگہ متعین تھی، بجلی اور ٹیلیفون کے بل ذمہ داری سے وقت پر ادا کرتے بچوں کے حوالے نہ کرتے کہ عموماً بچوں میں ذمہ داری کا احساس نہیں ہوتا، پھر ان بلوں کو سلیقے سے فائل میں لگاتے تاکہ تلاش کرنے میں دشواری نہ ہو، کسی سے کوئی کتاب وغیرہ مستعار لیتے تو اسے خود ہی واپس پہنچاتے، ایسا نہیں کہ ان کے پاس خالی وقت زیادہ تھا، بلکہ عموماً اس طرح کے لوگوں کے اوقات میں برکت ہوتی ہے، وہ بہت سا کام کر لیتے ہیں پھر بھی وقت بچ رہتا ہے، مفتی صاحب تصنیف وتالیف کا ذوق بھی رکھتے تھے اور اس سلسلے کا کوئی نہ کوئی مشغلہ ان کے پاس رہتا تھا، کبھی کوئی ترجمہ کبھی کسی کتاب کی ترتیب، کبھی کسی کتاب کی تصحیح، ابھی ''فتاویٰ عالمگیری'' کے اُردو ترجمے کی تکمیل کی تھی، مسلم شریف کی اُردو شرح کے متعدد اجزاء بھی تیار کئے تھے یہ اجزاء چھپ بھی چکے ہیں، دارالعلوم دیوبند میں مفتی تھے، یہ ذمہ داری کا عہدہ ہے، اور جس طرح کے الجھے ہوئے سوالات آج کل کئے جاتے ہیں ان کے لیے دقت نظری کے ساتھ ساتھ مطالعے کی وسعت بھی مطلوب ہے، اس لیے فارغ اوقات میں کتابوں کا مطالعہ بھی جاری رہتا، آنے والوں کو دعا تعویذ بھی دیدیتے، مگر پیشے کے طور پر نہیں صرف خدمت کے جذبے سے، نکاح پڑھانے کے لیے بھی لے جائے جاتے تھے کبھی کسی وقت بھی کوئی بلانے آجائے فوراً چل دیتے، معذرت کا کوئی لفظ انہیں یاد ہی نہیں تھا، دارالعلوم دیوبند کے دارالافتا میں رات دن استفتاء آتے رہتے ہیں، جو حضرات وہاں مفتی کے عہدے پر فائز ہیں وہ ان کے جواب لکھتے ہیں، مفتی صاحب مرحوم بھی جوابات لکھتے، ان کے جواب طرز نگارش، اور وسعت نظری کے باعث

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

بڑے سلجھے ہوئے ہوتے، راقم السطور کو اس کا ذاتی تجربہ تھا، اسی لیے اسے کوئی فتویٰ حاصل کرنا ہوتا تو وہ ان ہی کے پاس بھیجتا، عموماً وہ ایک دو دن کے اندر اس کا مکمل اور واضح جواب میرے مکتبے میں خود ہی پہنچا دیتے، مفتی صاحب اپنے اس منصب اور اپنی اس بزرگی کے باوجود نہایت متواضع اور منکسر المزاج تھے، نہ ان کی چال میں عالمانہ تمکنت تھی اور نہ بول چال میں رعونت، ہر ادا سے انکسار ٹپکتا تھا، حقیقت یہ ہے کہ ایسے لوگ کم ہی ہوتے ہیں، گھر سے مسجد اور مسجد سے اپنے دفتر تک گردن جھکائے تیز رفتاری کے ساتھ سلام کرتے اور جواب دیتے ہوئے گزرنے کا منظر نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوتا۔

چھوٹی مسجد (جسے مسجد عزیز بھی کہتے ہیں) کے امام تھے، والد صاحب کے انتقال کے بعد یہ ذمہ داری مستقل طور پر آپ کے کاندھوں پر آپڑی تھی، اگرچہ اس سے پہلے بھی والد صاحب کی حیات میں امامت کے فرائض انجام دے لیا کرتے تھے مفتی صاحب کی امامت بڑی ہلکی پھلکی تھی، بچے بوڑھے کسی کے لیے بھی گراں بار نہ ہوتی، استحضار اور نماز میں مشغولیت کا احساس اس قدر تھا کہ بیس بائیس سال کے دوران شاید ہی کبھی سجدۂ سہو کی ضرورت پیش آئی ہو، قرآن کریم بہترین یاد تھا، اور سالہا سال تراویح میں قرآن کریم بھی سناتے رہے، اب دوسرے حفاظ کا سننے لگے تھے۔

ان تمام مشغولیتوں کے باوجود شعر وشاعری کا صاف ستھرا ذوق تھا، بڑے اچھے شعر کہتے، تخیل کے اعتبار سے بھی اور لفظی بندش اور ترکیب کے لحاظ سے بھی ابھی دو تین ماہ پہلے اپنا مجموعۂ کلام ''شناسا'' کے نام سے مرتب کرکے چھپوایا، راقم کے پاس ازراہ کرم خود تشریف لائے اور اس مجموعۂ کلام کی ایک کاپی اپنے قلم سے میرا نام لکھ کر عنایت فرمائی، یہ بھی فرمایا کہ اس پر اپنے تاثرات لکھ دینا (جون ۲۰۰۶ء) کے شمارے میں یہ تاثرات شائع کیے گئے، پڑھ کر خود تشریف لائے اور راقم کا شکریہ ادا

کیا، دوسرے حضرات سے بھی کہا کہ بہت اچھا لکھا ہے، یہ ان کے بڑے پن کی بات تھی ورنہ ان کی شاعری پر تو وہی لوگ زیادہ بہتر لکھ سکتے ہیں جو اس وادیٔ پرخار کے مسافر ہیں، محض حکم کی تعمیل میں چند سطور قلم بند کر بیٹھا جوان کو سرشار کر گئیں۔ فللہ الحمد

یہ شاعری ہی میرے ان سے تعلقات کا سبب بنی، دارالعلوم دیوبند کے طالب علمی کے دور میں راقم السطور کو بھی شعر وشاعری کا شوق چرایا تھا، شعر تو کیا کہتا تک بندی کر لیا کرتا تھا، اور خواہش یہ ہوتی کہ کسی نشست میں یا چھوٹے موٹے مشاعرے میں سنا دوں، ان دنوں دیوبند ادبی سرگرمیوں کا مرکز تھا، ہر ہفتے کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی کے مکان پر نشست رہتی، راقم السطور کبھی بن بلائے اور کبھی بلانے سے ان نشستوں میں جا کر غزل پڑھ آتا، ان ہی نشستوں میں مفتی صاحب بھی تشریف لاتے، عمر میں وہ مجھ سے کافی بڑے تھے، مگر شاعری کے ذوق نے ہمیں ایک دوسرے سے قریب کر دیا تھا، شعر تو اچھے کہتے لیکن نہ تحت اللفظ میں موجودہ دور کے منور رانا اور راحت اندوری کے لہجے کی گھن گرج تھی اور نہ ترنم میں حق کانپوری اور الطاف ضیاء کی سی لے تھی، اس لیے شاعروں میں یا نشستوں میں عموماً چل نہیں پاتے تھے، اس قت بھی مشاعرہ سننے والوں کا ذوق کچھ ایسا ہی تھا جیسا آج ہے، آہستہ آہستہ وہ اس میدان سے کنارہ کش ہو گئے، اور پڑھنے لکھنے میں لگ گئے، دارالعلوم سے فراغت کے بعد نوکری چھوڑ کر علی گڑھ میں جا کر بی.اے. اور ایم.اے. کیا، پھر نوکری پر واپس آئے، تعلیم کے دوران شادی بھی ہو گئی تھی اور صاحب اولاد بھی ہو گئے تھے، یہ ان کی ہمت بھی تھی اور گھر والوں کا ایثار بھی تھا کہ انہوں نے ملازمت سے رخصت لے کر تعلیم حاصل کرنے کی ٹھانی، میں دو چار سال شاعری کی خرافات میں مشغول رہا، اللہ نے ہدایت دی، اور پھر اس سے کچھ دل اس طرح اُچاٹ ہوا کہ اب تک ادھر مائل نہیں ہوتا، مگر مفتی صاحب کی مشق سخن جاری رہی، وہ برابر لکھتے رہے، رسائل وجرائد

میں اور اخبارات میں ان کی غزلیں تسلسل کے ساتھ شائع ہوتی تھیں، خدا جھوٹ نہ بلوائے ایک ہزار غزلیں، نظمیں اور نعتیں ضرور ان کی بیاض میں ہوں گی، پچیس تیس سال سے لگاتار لکھتے رہے ہیں، کبھی جو تھک کر بیٹھے ہوں۔

اس شعری صلاحیت سے دیوبند کے لوگ بڑا نفع اٹھاتے، کسی خاندان میں شادی ہے، لیجیے پہنچ گئے مفتی صاحب کی خدمات حاصل کرنے، کوئی سہرے کی فرمائش کررہا ہے، کوئی رخصتی لکھنے کی درخواست کررہا ہے، کسی نے عرض کیا دولہن کی آمد لکھ دیجئے، مفتی صاحب نے شاید ہی کسی کو انکار کیا ہو، دل توڑنا تو جانتے ہی نہیں تھے، پھر سہرے رخصتی پر کیا موقوف ہر طرح کی تقریب کے موقع پر مفتی صاحب کے شعر حاضر میرے بیٹے عزیزم یاسر ندیم کی کتاب ''گلوبلائیزیشن اور اسلام'' منظر عام پر آئی اور میں نے رسم اجرا کی تقریب میں شرکت کا دعوت نامہ انہیں ارسال کیا تو اسی دن شام کو ایک تہنیتی نظم لکھ کر تشریف لائے اور اس طرح اپنی مسرتوں کا اظہار فرمایا، یہ نظم جلسے میں ایک خوش گلو طالب علم سے پڑھوائی گئی اور ''ترجمان دیوبند'' میں بھی شائع ہوئی رسم اجرا پر یاد آیا جب ان کا مجموعۂ کلام ''شناسا'' منظر عام پر آیا تو میں نے ان سے کہا کہ اس کی رسم اجرا کی تقریب ہونی چاہئے، آج کل یہ چیزیں عام سی ہوگئی ہیں ہمارے شہر کے دو شاعروں کے مجموعے ماضی قریب میں چھپے ہیں بڑی دھوم دھام کے ساتھ تقریبات رسم اجرا منعقد ہوئی ہیں، زیرلب مسکرائے اور فرمایا ہم اس قابل کہاں؟ کتاب چھپ گئی یہ بڑی بات ہے، بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ وہ خودنمائی کے جذبے سے کوسوں دور تھے، لوگ تو شہرت بے جا کی تمنا میں مرے جاتے ہیں وہ استحقاق کے باوجود گوشۂ گمنامی کی زندگی گزارا کرتے تھے، نشاط صاحب دارالعلوم میں مفتی تھے لیکن دارالعلوم کے نوے فی صد طلبہ کو یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ شخص جو ایک چھوٹا سا بیگ لے کر دارالعلوم کے صدر دروازے میں داخل ہوکر مسجد کی طرف مڑ جاتا ہے دارالعلوم

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

دیوبند کا مفتی ہے۔

شعر گوئی کا شوق تھا، لیکن نثر کی طرف بھی رجحان تھا، اور گاہے بہ گاہے مضامین لکھتے رہتے تھے، شروع میں جب ترجمان دیوبند کی اشاعت کا سلسلہ ہوا تو لگاتار کئی مضامین لکھے، خود ہی مضمون لے کر آتے، اور خود ہی رسالہ لے جاتے، پھر لمبے عرصہ تک خاموشی رہی ایک مرتبہ میں نے عرض کیا بہت دن سے آپ نے کچھ لکھا نہیں ہے، چپ رہے، شام کو ''زراعت اور طب میں مسلمانوں کا حصہ'' کے موضوع پر ایک مضمون لکھ کر دے گئے، یہ مضمون جولائی ۲۰۰۶ء میں چھپا، حال ہی میں ترجمان دیوبند کی خصوصی اشاعت (مشاہیر علمائے دیوبند) کا پروگرام بنا تو میں نے مفتی صاحب کو ایک خط لکھا کہ آپ مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی صاحب پر مضمون لکھنے کی زحمت فرمائیں، کچھ ہی دیر کے بعد جواب آیا کہ میں اتنی بڑی شخصیت پر لکھنے کا حق ادا نہیں کرسکتا، بڑے بھائی (مولانا فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی) سے لکھوالیں، میں نے جواب میں لکھا کہ ان سے مولانا فضل الرحمٰن عثمانیؒ پر لکھنے کی درخواست کی گئی ہے آپ مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانیؒ ہی پر لکھ دیں، جواب نہیں آیا، مجھے خیال ہوا کہ شاید لکھیں گے نہیں، لیکن مجھے اس وقت سخت تعجب ہوا جب انتقال سے چند روز پیشتر ۱۸ صفحات پر مشتمل مضمون لکھ کر لے آئے، یہ پہلا مضمون تھا جو ہمیں خاص نمبر کے لیے موصول ہوا، اب خیال ہوتا ہے کہ انہیں اسی لیے جلدی تھی کہ ان کا رخت سفر بندھ چکا تھا، جلدی جلدی وہ تمام کام نمٹانا چاہتے تھے۔

راقم السطور سے ان کو اچھا خاصا تعلق تھا، دیوبند میں جن چند لوگوں سے وہ ملنے کے لیے آیا جایا کرتے تھے، ان میں ایک یہ ناچیز بھی تھا، انتقال سے پہلی والی رات میں مغرب کے بعد کتب خانے میں تشریف لائے، واپس جا کر عشاء کی نماز پڑھائی، گھر پہنچ کر ہاتھ میں درد کی شکایت کی، انجکشن لگوایا، آرام سے سو گئے، صبح درد تو

صحیح تھا لیکن حرارت محسوس ہورہی تھی، ایک دن کی رخصت کے لیے درخواست بھجوائی نو، دس بجے کے درمیان بیٹھے بات چیت کر رہے تھے اچانک پیچھے کی طرف گرتے چلے گئے قریب بیٹھنے والے بھی فرشتۂ اجل کی آہٹ محسوس نہ کرسکے، اور وہ رخصت بھی ہوگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ خدا مغفرت کرے، ان کی قبر کو نور سے بھر دے، ان کے جانے سے دیوبند کے لوگ بڑا خلا محسوس کر رہے ہیں، ان جیسا بے ضرر، کم گو، متواضع، حلیم، بردبار، بے نفس، سادہ مزاج جذبۂ خدمت سے معمور مشفق ومہربان شخص دیوبند والوں کو مشکل سے ہی ملے گا، ہزاروں کی بھیڑ نے اپنے کاندھوں پر جنازہ اٹھایا تو ایسا لگا جیسے مفتی صاحبؒ زبان حال سے جگر مرادآبادی کا یہ شعر پڑھ رہے ہوں ؎

جان کر منجملۂ خاصانِ میخانہ مجھے
مدتوں رویا کریں گے جام وپیمانہ مجھے

یادگار اکابر، محدث جلیل، مفسّر قرآن

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد نعیم دیوبندیؒ

قرآن کریم کی یہ آیت اس وقت بے ساختہ میری زبان پر آ گئی جب میرے برادرِ نسبتی مولوی سعد سلیم نے ۲۳/ اگست ۲۰۰۷ء کو امریکہ سے فون پر یہ اطلاع دی کہ ابھی کچھ دیر پہلے ان کے دادا اور میرے دادا سسر حضرت مولانا محمد نعیم صاحب شیخ الحدیث دارالعلوم وقف دیوبند نے داعیِ اجل کو لبیک کہا، اس وقت شام کے ساڑھے چار بج رہے تھے اور میں اپنے مکتبے دارالکتاب میں مصروفِ کار تھا، امریکہ میں اس وقت صبح ہو رہی تھی، خبر سن کر احساس ہوا کہ واقعی کسی شخص کو یہ پتہ نہیں ہوتا کہ اس کی مٹی کہاں کی ہے اور اس کے نصیب میں کہاں دفن ہونا لکھا ہے، وہ دیوبند میں پیدا ہوئے، ساری زندگی دیوبند میں رہے، یہیں قبرستانِ قاسمی میں بزرگوں کے قریب ابدی آرام کے خواہش مند تھے، مگر پچاسی سال دیوبند میں گزارنے کے بعد امریکہ جا کر مقیم ہو گئے اور ایسے مقیم ہوئے کہ وہیں کی خاک کا پیوند بن گئے۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون.

حضرت مولانا کی پیدائش ۷/ ذی الحجہ ۱۳۳۷ھ مطابق ۱۹۱۹ء کو دیوبند کے ایک معزز اور تعلیم یافتہ عثمانی خاندان میں ہوئی، اِس خاندان کے مورثِ اعلیٰ قاضی شیخ ابوالوفا عثمانی تھے، دیوبند کے مشہور و معروف طبیب اور عالم حکیم بشیر احمد آپ کے دادا تھے اور حکیم محمد منعم عثمانی آپ کے والدِ بزرگوار تھے، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

قدس سرہٗ مالٹا کی اَسارت سے دیوبند واپس تشریف لائے تو آپ اس وقت شیر خوار بچے تھے، گھر کی خواتین نے انھیں حضرت کے سامنے پیش کیا حضرت نے کچھ پڑھ کر دم کیا اور دعائے خیر دی، بچپن سے ہی سنجیدہ اور متین تھے، کھیل کود سے طبعی طور پر کوئی دل چسپی نہیں تھی اس لیے تمام عمر پڑھنے اور پڑھانے میں گزری، تعلیم وتربیت کے تمام مراحل از اول تا آخر دارالعلوم دیوبند میں طے ہوئے، ۱۹۲۳ھ سے ۱۹۴۳ء تک لگ بھگ اکیس سال دارالعلوم دیوبند کے مختلف شعبوں میں داخل رہے، ناظرہ کلام پاک، حفظ، فارسی، ریاضی، تجوید، خوش نویسی، طب اور درسِ نظامی کی مکمل تعلیم اپنے اپنے وقت کے مشہور اساتذۂ کرام سے حاصل کی، جن میں چند اہم نام یہ ہیں حضرت مولانا عبدالرحمٰنؒ تلمیذ حضرت نانوتویؒ، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، حضرت مولانا فخر الدین مرادآبادیؒ، حضرت مولانا اعزاز علی امروہیؒ، حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ، حضرت علامہ ابراہیم بلیاویؒ، حضرت مولانا سید اختر حسین میاں صاحبؒ حضرت مولانا ظہور احمد دیوبندیؒ وغیرہ، کبھی کسی کتاب میں فیل نہیں ہوئے بلکہ ہمیشہ امتیازی نمبروں سے کامیابی حاصل کی، ترمذی شریف کے سالانہ امتحان میں حضرت مولانا فخر الدینؒ صاحب شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند نے خصوصی نمبر مرحمت فرمائے اور جواب کی کاپی پر یہ الفاظ بھی لکھے ''حسنٌ، جیّدٌ، مبدعٌ، مطرّبٌ، خطاطٌ'' فراغت کے بعد جو سند دارالعلوم دیوبند سے عطا کی گئی اس میں مطبوعہ عبارت کے علاوہ یہ الفاظ بھی قلم سے بڑھائے گئے ''**وهو عندنا سليمُ الطبع، جيّدُ الفهم مرضي السيرة، وله مناسبةٌ تامةٌ بالعلوم**''

تعلیم سے فراغت کے بعد آپ نے اولاً ایک سال کے لیے مدرسہ فیضان العلوم سہارنپور میں بہ حیثیتِ ناظم کام کیا، اس کے اگلے ہی سال ۱۹۴۴ء میں حضرت شیخ الادب مولانا اعزاز علیؒ صاحب نے مدرسہ قاسم العلوم فقیر والی بھاول پور بھیج دیا، تین سال بعد

۱۹۴۷ء میں دارالعلوم دیوبند کے اربابِ انتظام نے تدریسی خدمات کے لیے آپ کو طلب کرلیا، اوراس وقت سے تقسیمِ دارالعلوم تک منصبِ تدریس پر فائز رہے، یہ عرصہ لگ بھگ چالیس برس کو محیط ہے،اس دوران انھوں نے درسِ نظامی کی زیادہ تر کتابیں پڑھانے کا شرف حاصل کیا، تقسیمِ دارالعلوم کے بعد ایک دوسال کے لیے آپ دہلی تشریف لے گئے اور وہاں کے مشہور مدرسے دارالعلوم رحیمیہ میں بخاری شریف کا درس دیا، یہاں تک کہ دارالعلوم وقف میں حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ نے طلب فرمایا اور شیخ الحدیث کے منصب پر فائز کیا، پانچ سال پہلے شکاگو امریکہ جانے تک پوری تن دہی اور دل جمعی کے ساتھ دارالعلوم وقف میں بخاری شریف کا درس دیتے رہے اور آخر تک یہ خدمت بلاتن خواہ انجام دی۔

حضرت مولانا محمد نعیم صاحبؒ بے پناہ خصوصیتوں کے حامل انسان تھے، کیونکہ انھوں نے دارالعلوم دیوبند کی ممتاز شخصیتوں کو دیکھا تھا، ان سے اکتسابِ فیض کیا تھا ان کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا تھا اور وہ ایک مہذب علمی گھرانے کے چشم و چراغ تھے، اس لیے ان میں اکابر کی تمام خصوصیات مجتمع تھیں، سادگی، شرافت، متانت علمی انہماک، یک سوئی، قناعت پسندی یہ سب وہ خصوصیتیں ہیں جو ہمارے اکابر کی طرح حضرت مولاناؒ میں بھی بہ درجۂ اتم پائی جاتی تھیں۔

وہ دارالعلوم دیوبند کے ایک ممتاز مدرس تھے، ان کا درس اختصار اور جامعیت کے لحاظ سے طلبہ میں بے حد مقبول تھا، تمام سال یکساں رفتار سے پڑھاتے تھے اور وقتِ مقرر پر طے شدہ مقدارِ نصاب کی تکمیل کو ضروری خیال کرتے تھے، اس لیے اسفار بہت کم تھے، عموماً سفر کے لیے ایامِ تعطیلات کو ترجیح دیتے تھے، درس کے دوران بہت ناپ تول کر بولتے نہ بہت لمبی تقریر کرتے جو طلبہ کے سر سے گزر جائے اور نہ اتنا مختصر بولتے کہ طلبہ سمجھنے سے قاصر رہیں، صاف ستھری اور محاوراتی اُردو بولنے میں ان

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

کا کوئی ثانی نہیں تھا، اس لیے زبان و بیان کے اعتبار سے بھی ان کا سبق بے حد پسند کیا جاتا تھا، کیونکہ انھوں نے درسِ نظامی کے تمام علوم نہایت محنت اور توجہ سے حاصل کئے تھے، اس لیے ہر فن کی کتابیں کامیابی کے ساتھ پڑھائیں اور طلبہ کے درمیان مقبولیت حاصل کی، یہی وجہ ہے کہ وہ ترقی کرتے کرتے بخاری شریف تک پہنچے جس کا درس مدارس کی دنیا میں کامیابی کی معراج سمجھا جاتا ہے، بخاری جیسی ضخیم کتاب بھی انھوں نے اس شان سے پڑھائی کہ کبھی آخر سال میں بھاگا دوڑی کی نوبت پیش نہیں آئی، بلکہ شروع سے آخر تک ایک رفتار رہی، زائد وقت لگائے بغیر کتاب کو اختتام تک پہنچانے میں انھیں ملکہ حاصل تھا، ان کا خیال تھا کہ لمبی چوڑی تقریروں سے استاذ کی قابلیت تو نمایاں ہوتی ہے مگر طلبہ کو فائدہ کم ہوتا ہے، طلبہ کے لیے تو کتاب کو حل کر لینا ہی اور اس کو سمجھ لینا ہی کافی ہے، اور اس کے لیے ضروری ہے کہ استاذ اپنی پوری توجہ مطالبِ کتاب کے حل پر مرکوز رکھے۔

حضرت مولانا نہایت سادگی پسند عالم دین تھے، آج کل علما میں جو کروفر پایا جاتا ہے اس سے کوسوں دور، مزاج میں قناعت پسندی اور توکل، بہت معمولی لباس بعض اوقات پیوند زدہ لباس پہننے میں بھی کوئی عار محسوس نہیں کی، راقم السطور کو لگ بھگ آٹھ سال اُن کے گھر میں اُن کے ساتھ رہنے کا موقع ملا، میں نے ہمیشہ انھیں معمولی اور سادہ لباس میں دیکھا، عموماً اپنے کام خود کرنے کے عادی تھے یہاں تک کہ خود اپنے کپڑے دھو لینا اور اپنی ضرورت سے متعلق تمام کام خود کر لینا انھیں پسند تھا ایسا کم ہی ہوتا تھا کہ وہ اپنے کسی کام کے لیے مثلاً پانی پلانے کے لیے یا کوئی چیز اٹھا کر دینے کے لیے کسی بڑے یا بچے کو آواز دیں، حد تو یہ ہے کہ کھانا کھا کر اپنی پلیٹ خود دھو کر الماری میں رکھ آتے، اس معاملے میں جو مزاج ان کا تھا حقیقت یہ ہے کہ میں نے کسی کا نہیں دیکھا عموماً لوگ گھر میں بیوی بچوں اور خادموں سے کام لینے میں کوئی

حرج نہیں سمجھتے اور اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے، مگر مولانا اپنا کام خود کرنا پسند کرتے تھے اور کبھی کسی کو اپنے کام کے لیے تکلیف نہیں دیتے تھے۔

مزاج میں یک سوئی بہت تھی، خوامخواہ کی محفلیں سجانا، بلاوجہ کی باتیں بنانے کے لیے بیٹھنا یا بلاضرورت کہیں آنا جانا انھیں سخت ناپسند تھا، گھر سے دار العلوم اور دار العلوم سے گھر یا گھر سے مسجد اور مسجد سے گھر تک یہی ان کی ساری دن کی مصروفیتوں کا محور تھا، گھر میں بھی خالی بیٹھنا انھیں پسند نہیں تھا نہ ان کے مزاج میں آرام طلبی تھی دار العلوم سے پڑھا کر آئے، گھریلو لباس تبدیل کیا اور مطالعے میں مشغول ہو گئے علمی انہماک جس قدر مولانا میں تھا ایسا کم ہی لوگوں میں دیکھا گیا ہے، آپ کسی بھی وقت جائیں وہ ہمیشہ لکھنے پڑھنے میں مشغول نظر آتے، اگر لکھتے لکھتے اُکتاہٹ ہونے لگتی تو لکھنا چھوڑ کر کوئی کتاب اٹھا لیتے، کتاب پڑھنے سے دل بھر جاتا تو اخبار پڑھنا شروع کر دیتے، بیٹھے بیٹھے تھک جاتے تو لیٹ کر پڑھنے لگتے، صبح سے رات تک ان کی یہی مشغولیتیں تھیں، نہ ان کے پاس طلبہ کا ہجوم رہتا، نہ ملنے جلنے والوں کی آمد و رفت رہتی، کوئی بہت ہی ضروری کام ہوتا تو گھر سے باہر نکلتے اور کسی ضروری کام ہی کے لیے آنے والوں سے ملنا گوارہ کرتے، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے بہت سے علمی کام کرائے انھوں نے متعدد کتابیں لکھیں، جن میں سے کئی کتابیں متعدد جلدوں میں ہیں۔

ایک مرتبہ سیڑھی لگا کر گھر میں سفیدی کر رہے تھے کہ زمین پر گر پڑے اور پاؤں میں فریکچر ہو گیا ڈاکٹروں نے کئی مہینے کا آرام بتایا، مجبوراً دار العلوم سے چھٹی لینی پڑی، لیکن اس وقت کو انھوں نے بے کار ضائع نہیں کیا بلکہ جلالین شریف کی شرح ''کمالین'' کے نام سے لکھنی شروع کر دی اور اسی حالت میں کافی حصہ لکھا، یہ شرح صحت کے بعد پایۂ تکمیل کو پہنچی، اسی طرح ایک مرتبہ بیمار پڑے اور مدرسے سے طویل

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

رخصت لینے کی نوبت آئی تو ہدایہ کی شرح کے کچھ حصے لکھے، یہ دونوں کتابیں دیوبند کے اداروں نے شائع کی ہیں، آخر عمر میں جب لوگ تھک کر بیٹھ جاتے ہیں انھوں نے ''انوار القرآن'' کے نام سے قرآن کریم کی تفسیر لکھنے کا آغاز کیا اور اس شان سے کیا کہ کبھی اس کام کی وجہ سے تدریس کا سلسلہ متاثر نہیں ہوا، کئی سال کی محنت کے بعد یہ تفسیر پایۂ تکمیل کو پہنچی الحمد للہ تفسیر انوار القرآن بارہ جلدوں میں دار الکتاب دیوبند سے چھپ چکی ہے جن لوگوں نے حضرت مولاناؒ کی اس تفسیر کا مطالعہ کیا ہے ان کا کہنا یہ ہے کہ زبان و بیان کے اعتبار سے اور تفسیری نکات کے حوالے سے اُردو تفسیروں میں یہ اپنی نظیر آپ ہے اب تک اُردو میں اس سے زیادہ مفصل کوئی دوسری تفسیر نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے انھیں لکھنے پڑھنے کا اور تصنیف و تالیف کا ایک خاص ذوق عطا کیا تھا، مطالعہ وسیع تھا اسی لیے مراجع پر گہری نظر تھی، لمبی لمبی حدیثیں زبانی یاد تھیں، فارسی، اردو اور عربی کے بے شمار اشعار نوکِ زبان تھے، اکابر کے ہزاروں واقعات ان کے حافظے میں اس طرح محفوظ تھے کہ جب چاہتے انھیں نکال کر اس طرح بیان کرتے کہ جیسے وہ واقعہ خود ان کی نگاہوں کے سامنے پیش آیا ہو۔

جس قدر اچھی اردو وہ لکھتے تھے وہ بہت ہی کم دیکھنے میں آتی ہے، محاورات اور امثال پر انھیں مکمل عبور حاصل تھا، عموماً اسباق میں بھی وہ محاوراتی زبان استعمال کرتے اور بسا اوقات کوئی جملہ یا کوئی محاورہ ایسا بول دیتے کہ سننے والے ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتے، مگر کیا مجال کہ انھوں نے کبھی زیرِ لب تبسم سے تجاوز کیا ہو، بسا اوقات تبسم کو بھی اس طرح دبا لیتے کہ صاف نظر آتا کہ ہنسی تو آرہی ہے مگر متانت اسے روکنے پر مجبور کر رہی ہے، زبان کی یہ حلاوت اور خوب صورتی تفسیر انوار القرآن کے صفحات پر بکھری نظر آتی ہے، میں پوری ذمہ داری کے ساتھ یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ اس تفسیر کے مطالعے کے دوران کبھی کوئی شخص اُکتاہٹ محسوس نہیں کرسکتا، بیان میں

سلاست بھی ہے، روانی بھی، مضامین میں ترتیب بھی ہے اور تفہیم کا سلیقہ بھی، بہ ظاہر ایسا لگتا تھا کہ یک سوئی اور گوشہ نشینی نے انھیں دورِ حاضر کے مسائل سے دور رکھا ہے، لیکن انوار القرآن کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ نہ صرف یہ کہ زمانے کے مسائل سے اور اس کے تقاضوں سے پوری طرح باخبر ہیں بلکہ ان کا حل بھی ان کے پیشِ نظر ہے۔

تصوف وسلوک میں پہلے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے رہ نمائی حاصل کی، حضرت کی وفات کے بعد شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ سے بیعت وارادت کا تعلق قائم کیا، حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ کی خدمت میں بھی حاضری کا معمول تھا، تصوف کے بنیادی اصول قلتِ طعام، قلتِ کلام، قلتِ منام اور قلتِ اختلاط مع الانام پر سختی کے ساتھ عمل پیرا رہتے تھے، لایعنی اور غیر ضروری گفتگو سے مکمل اجتناب تھا، سیاسی گروہ بندی سے بہت دور تھے، قضیۂ دارالعلوم کے زمانے میں جب کہ اچھے اچھے احتیاط پسند بھی غیر محتاط ہوگئے تھے انھوں نے اپنی زبان وقلم سے کسی کو برا نہیں کہا بلکہ فتنے کے اس دور میں خود کو کچھ زیادہ ہی محدود، گوشہ نشین اور علمی کاموں میں منہمک کرلیا۔

حضرت مولاناؒ اب ہم میں نہیں رہے صرف ان کی یادیں باقی رہ گئیں ہیں اللہ تعالیٰ نے انھیں ہر چیز سے نوازا، علم کی دولت عطا کی، دارالعلوم جیسی مرکزی درس گاہ میں تدریس کا موقع بخشا، بخاری شریف جیسی اصح الکتب بعد کتاب اللہ پڑھانے کی سعادت عطا کی، قلم کی دولت سے نوازا اور اسے تفسیرِ قرآن لکھنے کا ذریعہ بنایا، حافظِ قرآن تھے، خالی وقت میں پڑھتے رہنے کا معمول تھا، حافظ ہونے کے بعد پہلی محراب سنائی اور ۱۹۹۶ء تک لگاتار سناتے رہے اور کسی سال اس معمول میں فرق نہیں آیا، کئی مرتبہ حج کئے، عمروں کی سعادت حاصل کی، برطانیہ، امریکہ، کناڈا، ترکی، اُردن، شام فلسطین اور دوسرے ممالک کے تبلیغی اور سیاحتی دورے کئے، امریکہ میں قیام کے دوران

لوگوں کو خوب خوب استفادے کا موقع دیا، اللہ تعالیٰ نے انھیں بہترین اولاد عطا کی، چھ صاحبزادیاں ہیں جن میں سے پانچ نانی دادی بن چکی ہیں، ایک صاحبزادے ہیں مولانا قاری عبداللہ سلیم جو دارالعلوم دیوبند میں شعبہ تجوید کے صدر رہ چکے ہیں اور تقسیم دارالعلوم کے بعد یہاں کے حالات سے متاثر ہو کر امریکہ منتقل ہو گئے تھے ماشاء اللہ صاحبِ اولاد ہیں جو سب کے سب حافظ اور عالم ہیں، آج امریکہ میں جو کچھ علمی اور دینی سرگرمیاں ہیں ان میں قاری صاحب موصوف کا بڑا ہاتھ ہے، امریکہ جا کر انھوں نے لڑکیوں اور لڑکوں کے لیے دینی تعلیمی ادارے قائم کیے، دارالقضا بنایا رویتِ ہلال کمیٹی کی بنیاد ڈالی، تفسیری سلسلے شروع کیے، آج سے بیس پچیس سال پہلے نہ وہاں کوئی حافظ تھا اور نہ کوئی عالم اور اب یہ عالم ہے کہ امریکہ کے ہر شہر میں علما کی اور حفاظ کی اچھی خاصی تعداد موجود ہے، اللہ تعالیٰ نے مولانا قاری عبداللہ سلیم کو ایک سعادت مند اور لائق بیٹا بنایا انھوں نے اپنے والدین کی اور بالخصوص والد کی؛ ان کی زندگی کی آخری سانس تک وہ خدمت کی ہے جس کی مثال نہیں ملتی، محض والدِ محترم کی خدمت کے لیے انھوں نے تقریباً پانچ سال تک شکاگو سے باہر کوئی سفر نہیں کیا، اور کوشش کی کہ ان کا زیادہ سے زیادہ وقت والد کے خدمت میں گزرے، حقیقت یہ ہے کہ اولاد کی سعادت مندی ہی ماں باپ کے لیے ایک عظیم نعمت ہے۔

دیارِ غیر میں حضرت مولانا کی وفات اس اعتبار سے نہایت رنج و غم کا باعث ہے کہ ان کے وہ عزیز و اقارب جو دیوبند میں رہتے ہیں اور دارالعلوم دیوبند اور وقف کے طلبہ اور ان کے ہزاروں شاگردان کی آخری زیارت اور نمازِ جنازہ میں شرکت سے محروم رہ گئے، لیکن اس محرومی کا ازالہ زیادہ سے زیادہ ایصالِ ثواب کر کے کیا جا سکتا ہے، مگر یہ امر باعثِ تسلی ہے کہ امریکہ میں ان کی وفات کا غم کچھ زیادہ ہی محسوس کیا گیا، چنانچہ جیسے ہی یہ خبر پھیلی کہ حضرت مولاناؒ انتقال فرما گئے ہیں لوگ اپنی اپنی مصروفیات ترک

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

کر کے دارالعلوم شکا گو کی طرف دوڑ پڑے اور اس شہر نے اپنی تاریخ میں پہلی مرتبہ کسی جنازے میں اتنا ہجوم دیکھا کہ کئی کئی کلومیٹر دور تک سڑکوں پر جام لگ گیا اور دارالعلوم شکا گو کے آس پاس گاڑیوں کی پارکنگ کی کوئی جگہ باقی نہیں رہی، دارالعلوم کی وسیع عمارتیں اس کا کشادہ میدان، آس پاس کی سڑکیں، سب لوگوں سے بھر گئیں، یہاں تک کہ انتظامیہ کو مجمع کنٹرول کرنے کے لیے میدان میں آنا پڑا، مقامی آبادی نے بھی بھرپور تعاون کیا، اور دارالعلوم تک پہنچنے میں لوگوں کی رہنمائی کی، فجر میں انتقال ہوا، ظہر میں تدفین عمل میں آئی، چھٹی کے دن نہیں تھے مگر اس کے باوجود لوگوں نے اتنی بڑی تعداد میں شریک ہو کر حضرت مولاناؒ کو خراجِ عقیدت پیش کیا اور ان کے لیے دعائے مغفرت کی، یہ خراجِ عقیدت دراصل اس علم کو تھا جس میں حضرت مولانا زندگی بھر مشغول رہے اور بزرگوں کی اس نسبت کو تھا جو حضرت مولانا کو حاصل تھی اور دیکھا جائے تو یہ ان کے صاحبزادے مولانا قاری عبداللہ سلیم کی علمی اور دینی خدمات کا اعتراف بھی تھا۔

حضرت مولاناؒ راقم السطور کے نہایت شفیق اور مشفق استاذ تھے، راقم نے ان سے مشکوٰۃ شریف اور نسائی شریف پڑھی ہے، مجھے فخر ہے کہ دورانِ طالب علمی اور اس کے بعد بھی مجھے حضرت کی شفقتیں حاصل رہیں، یہاں تک کہ میں ان کے صاحبزادے مولانا قاری عبداللہ سلیم صاحب کا داماد بن کر ان کے خاندان کا حصہ بنا وہ مجھ پر جتنا بھروسہ اور اعتماد کرتے تھے شاید ہی کسی پر کرتے ہوں اپنا کوئی بھی معاملہ ہو کسی بھی طرح کا کوئی حساب کتاب ہو، کسی بھی طرح کا کوئی لین دین ہو، یہاں دیو بند میں سب میرے ہی ذریعے ہوا کرتا تھا، اللہ تعالیٰ حضرت مولانا مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے، اور آخرت کی نعمتوں سے نوازے۔

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

سلطنتِ علم کے بے تاج بادشاہ

حضرت مولانا سید انظر شاہ کشمیریؒ

بقیۃ السلف، استاذ الاساتذہ، رئیس العلما، فخر المحدثین حضرت مولانا سید انظر شاہ کشمیریؒ چند ماہ کی علالت کے بعد ۲۶/اپریل ۲۰۰۸ء کی صبح ۱۰/بجے دہلی کے ایک ہسپتال میں رحلت فرما گئے، جانا سب کو ہے، کسی کا وقت رحیل آچکا، کوئی اذنِ سفر کے انتظار میں ہے، یہ دنیا آنے جانے والوں سے اسی طرح آباد رہے گی، بالآخر فنا ہوجائے گی۔ بعض جانے والے محفل ہست وبود سے کچھ اس طرح خاموشی کے ساتھ اٹھ کر چل دیتے ہیں کہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی، نہ ان کی یاد میں کوئی آنکھ اشک بار ہوتی ہے، نہ کوئی دل بے قرار ہوتا ہے، بعض اس طرح رخصت ہوتے ہیں کہ ان کی جدائی کے غم سے آنکھیں ہی نہیں دل بھی روتے ہیں، ان کی وفات کی خبر خرمنِ ہستی پر صاعقہ بن کر گرتی ہے، اور دور دور تک لوگ اس کا اثر محسوس کرتے ہیں، کسی کا آفتابِ زندگی مشرق میں غروب ہوتا ہے تو مغرب میں تاریکی چھا جاتی ہے، شمال میں ڈوبتا ہے تو جنوب میں اس کا اثر دکھائی دیتا ہے، موت العالِم موت العالَم کا مقولہ پڑھتے سنتے آئے ہیں، لیکن اس کا مصداق کم ہی نظر آیا ہے، حضرت شاہ صاحبؒ کی وفات سے اس مقولے کی حقیقت سمجھ میں آئی کہ آخر ایک عالِم کی موت کو عالَم کی موت کیوں کہا جاتا ہے، ان کی وفات کے بعد اہل علم نے، اساتذہ نے، طلبہ نے، عوام نے، خواص

نے، دین اور دنیا سے تعلق رکھنے والے ہر طبقے نے جس طرح اپنے رنج وغم کا اظہار کیا ہے، اور جس وسیع پیمانے پر مدارس عربیہ میں تعزیتی میٹنگوں اور جلسوں کا اہتمام کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سلطنتِ علم کے بے تاج بادشاہ تھے، اور دلوں پر حکم رانی کرتے تھے، اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ دنیا سے بادشاہتیں ختم ہوتی جارہی ہیں، لیکن علم کی بادشاہت لازوال ہے، یہ کبھی ختم نہیں ہوگی، اور حضرت شاہ صاحبؒ جیسے علما کے سروں پر اس سلطنت کا تاج ہمیشہ جگمگاتا رہے گا۔

حضرت شاہ صاحبؒ دارالعلوم دیوبند کے ان اکابر علما میں سے تھے جنہوں نے برصغیر ہندوپاک ہی کو نہیں بلکہ دنیا کے ہر خطے کو ایمان ویقین اور دین کے علمِ صحیح کے نور سے جگمگایا ہے، اب یہ حضرات ایک ایک کرکے دنیا سے رخصت ہوتے جارہے ہیں، اور اپنے پیچھے ایک ایسا خلا چھوڑ کر جارہے ہیں جس کا پر ہونا قحط الرجال کے اس دور میں مشکل ہی نہیں ناممکن نظر آتا ہے۔

ماضی قریب میں جو شخصیتیں داغ فراق دے کر گئی ہیں ابھی ان کی جگہ ہی پر نہیں ہوسکی تھی کہ اب ملت کے لیے اور خاص طور پر طبقۂ دیوبند کے لیے یہ سانحۂ عظیم اور صدمۂ جانکاہ پیش آگیا، ان کی وفات نے دلوں کی دنیا تہہ وبالا کرکے رکھ دی ہے وہ ہماری تاریخ کا ایک روشن اور تابناک عنوان تھے، وہ کیا رخصت ہوئے ان کے ساتھ علمائے دیوبند کے کردار وعمل، جدوجہد اور قربانی کی ایک مکمل تاریخ رخصت ہوگئی۔

ما کان قیس هلکه هلک واحد
ولکنه بنیان قوم تهدّما

اللہ تعالیٰ نے حضرت شاہ صاحبؒ کی ذات میں بے شمار اوصاف اس طرح مجتمع کردئے تھے کہ وہ ان کی ذات کا حصہ لگنے لگے تھے، بہت کم شخصیتیں ایسی ہوتی

ہیں جو بہ یک وقت مختلف النوع کمالات وامتیازات کی جامع ہوں، وہ مدرس بھی تھے خطیب بھی تھے، صاحب قلم بھی تھے، پیر طریقت بھی تھے، منتظم بھی تھے، سیاسی قائد بھی تھے، انہوں نے خدمت کا کوئی گوشہ تشنہ نہیں چھوڑا، ہر میدان میں اپنی گہری چھاپ چھوڑی، ہر پہلو سے اپنی شناخت قائم کی، اللہ تعالیٰ نے انہیں جن صلاحیتوں سے نوازا تھا ان سب کا حق انہوں نے اس طرح ادا کیا کہ آج ان کے مداح تو مداح ناقد تک یہ اعتراف کرنے پر مجبور نظر آتے ہیں کہ ہر اعتبار سے ان کا قد بہت اونچا تھا، وہ بلاشبہ ایک عبقری شخصیت کے حامل انسان تھے جو صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں، اور جن کے اٹھ جانے سے برسوں تک ماتم ہوتا ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے جس گھر میں آنکھ کھولی وہ اس وقت علم حدیث کے غلغلوں سے گونج رہا تھا، کیوں کہ وہ دار العلوم دیوبند جیسی مرکزی درسگاہ کے سابق شیخ الحدیث کی قیام گاہ تھا، اور شمع حدیث کے پروانے اس در پر ہجوم کئے رہتے تھے ابھی شاہ صاحبؒ نے شعور کی دہلیز پر قدم بھی نہیں رکھا تھا کہ یہ محفل اجڑ گئی، اور شمع کے پروانے بھی ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے، اس وقت حضرت شاہ صاحبؒ چار سال کے تھے اس عمر میں اس دکھ کا کیا احساس ہوتا جو باپ کے سایۂ شفقت سے محرومی کے نتیجے میں ہوتا ہے، انہیں پتہ بھی نہیں چلا کہ اب ان کی تربیت کی تمام تر ذمہ داری بیوہ ماں اور ان ہی کی طرح یتیم بہن بھائیوں پر آپڑی ہے، جن کا غم اگرچہ مشترک تھا مگر بڑے ہونے کی وجہ سے چھوٹوں کے تئیں ان کی کچھ ذمہ داریاں بھی تھیں، ابتدائی دینی تعلیم کے بعد خاندان کے سرکردہ افراد نے یہ فیصلہ کیا کہ انہیں عصری دانش گاہ میں داخل کیا جائے، اس طرح وہ دیوبند جیسے مرکز علم کو خیر باد کہہ کر دہلی پہنچے اور وہاں سے انھوں نے لاہور کا رخ کیا، ان دنوں پنجاب یونیورسٹی کے امتحانات تعلیمی لیاقت میں منتہائے کمال سمجھے جاتے تھے اور غیر منقسم ہندوستان میں روزگار کی ضمانت بھی، شاید

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

اسی لیے یہ فیصلہ کیا گیا ہوگا کہ شاہ صاحبؒ اس یونیورسٹی کے اردو، فارسی امتحانات دے کر اپنا اقتصادی مستقبل محفوظ کرلیں، مگر قضاوقدر کا فیصلہ یہ تھا کہ وہ مرکزِ علم کی طرف واپسی کا سفر کریں، اور اپنے عظیم والد کی میراث سنبھالنے کی تیاری کریں، ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں نے انہیں اپنے گھر کی طرف متوجہ کیا، اس طرح وہ لاہور کو الوداع کہہ کر دیوبند پہنچے، یہ حضرت شاہ صاحبؒ کی خوش قسمتی تھی کہ اس وقت دارالعلوم دیوبند میں ان کے والد بزرگوار حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے شاگردوں کا دبدبہ تھا، وہ حضرات دل سے چاہتے تھے کہ ان کے استاذ کے گھرانے میں علم دین کا تسلسل باقی رہے، جیسے ہی انہیں حضرت شاہ صاحبؒ کے ارادوں کا علم ہوا انہوں نے دیدۂ ودل فرش راہ کئے، اور اپنے استاذ زادے کو آغوش شفقت میں لے کر خصوصی توجہات کے ساتھ ان کی تعلیم وتربیت کا سلسلہ شروع کردیا، شروع میں قاری اصغرعلی صاحبؒ نے کچھ ابتدائی کتابیں پڑھائیں، پھر شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علیؒ نے کیمیا گری کا وہ مشہور زمانہ عمل شروع کیا جس کے ذریعہ وہ زنگ آلود لوہے کو بھی کندن بنادیا کرتے تھے، یہاں تو باپ سے ورثے میں ملا ہوا سونا پہلے سے موجود تھا، صرف صیقل کرنے اور چمکانے کی دیر تھی، یہی ہوا بھی کہ ماہرین فن اساتذہ کی معمولی توجہات نے انہیں علوم وفنون میں کامل دست گاہ بخش دی، پانچ چھ سال کے عرصے میں وہ فارغ بھی ہوگئے اور اس درس گاہ میں مدرس بھی بن گئے جس درسگاہ میں ان کے والد نے قال اللّٰہ وقال الرسول کی صدائے دل نواز بلند کی تھی، تاریخ اپنے آپ کو دہرانے کی تیاری کررہی تھی اور حضرت شاہ صاحبؒ اس تاریخ کا ایک کردار بننے جارہے تھے۔

یہ صحیح ہے کہ شاہ صاحبؒ کے علمی اور ادبی کردار کی تعمیر وتشکیل میں ان کے والد بزرگوار کے شاگردوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، اور انہیں تراش خراش کر ایک قیمتی اور دیدہ زیب ہیرا بنایا، یہی وجہ ہے کہ وہ ابھی سند فراغ بھی حاصل نہیں کرپائے تھے

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

کہ ان کو دارالعلوم میں تدریسی خدمات کے لیے منتخب کرلیا گیا، اور اس طرح ایک بیش قیمت جوہر دارالعلوم کے تدریسی شعبے میں نگینے کی طرح فٹ ہوگیا، یقیناً یہ اس نسبت کو خراج عقیدت تھا جو حضرت شاہ صاحبؒ کو اپنے والد بزرگوار سے حاصل تھی نسبتوں کا احترام ہمارے مسلکی مزاج میں داخل ہے اور صحیح ہے، مگر کیا یہ سب کچھ محض نسبت کی وجہ سے ہوا، بالکل نہیں! انہوں نے اپنے تعلیمی سفر کا آغاز بے سروسامانی کی حالت میں کیا، ان پر نہ کوئی خارجی دباؤ تھا اور نہ داخلی، محض اپنے شوق سے انہوں نے یہ سفر شروع کیا تھا، شاید انہیں اندازہ بھی نہ ہوگا کہ اس راہ میں کتنی مشکلات ہیں اور کتنی مشقتیں ہیں، اساتذہ کی مہربانیاں، شفقتیں اور عنایتیں اپنی جگہ مگر جوہر قابل بننے کے لیے یہ سرمایہ کافی تو نہیں تھا، شاہ صاحبؒ نے یہ راز سمجھ لیا تھا، یہی وجہ ہے کہ جب انہوں نے حصول علم کی وادی میں آبلہ پائی کا ارادہ کیا تو پھر پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا، اپنے مشفق اساتذہ کی توقعات پر پورے اترے، اور مکمل اعتماد کے ساتھ خود کو اپنے والد کی علمی وراثت کا صحیح حق دار ثابت کیا۔

حضرت شاہ صاحبؒ کا تدریسی سفر پچپن برسوں کو محیط ہے، اس لمبے سفر میں کوئی ایسا مقام نہیں آیا جہاں وہ تھک کر بیٹھے ہوں، درس نظامی کی شاید ہی کوئی چھوٹی بڑی کتاب ایسی ہو جو انہوں نے نہ پڑھائی ہو، میزان سے بخاری تک کا یہ طویل سفر انہوں نے اس طرح طے کیا کہ وہ دارالعلوم کی تعلیمی فضاؤں میں مطالعے کی وسعت حافظے کی قوت اور تفہیم کی صلاحیت کے حوالے سے طالبان علوم نبوت کے لیے قابل تقلید نمونہ بن گئے، اور یہ کامیابی کی وہ معراج ہے جس کی اصحاب درس وتدریس آرزو کرتے ہیں اور وہی استاذ شاگردوں کے دلوں میں مقام پاتا ہے جسے قدرت کی طرف سے یہ صلاحیتیں عطا کی گئی ہوں، حضرت شاہ صاحبؒ کا درس تھکا دینے والا یا اکتا دینے والا کبھی نہیں رہا، ان کا انداز بیان اتنا خوب صورت اور دل چسپ ہوا کرتا تھا

کہ طلبہ نے ان کے گھنٹے سے کبھی فرار حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی، اور اگر کبھی ایسا موقع آیا تو طلبہ کو یہ ضرور محسوس ہوا کہ انہوں نے کوئی متاعِ عزیز کھو دی ہے، یا کوئی نا قابل معافی جرم کرلیا ہے، اور یہ صورت حال اس وقت سے جب آتش جوان تھا اور اس وقت تک جب وہ عمر کے آخری پڑاؤ پر تھے یکساں طور پر قائم رہی، کسی مدرس کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا خوش نصیبی ہو سکتی ہے کہ اس کا درس مقبول ہو، اور اس کی درس گاہ پڑھنے والوں سے کھچا کھچ بھری رہے، ہم نے تو یہاں تک دیکھا کہ ان کے گھنٹوں میں دوسری جماعتوں کے بلکہ دوسرے مدرسوں کے طلبہ بھی ذوق وشوق کے ساتھ آکر بیٹھتے تھے اور کچھ نہ کچھ حاصل کر کے اٹھتے تھے۔

اس دوران انہوں نے میدانِ خطابت میں بھی قدم رکھ دیا، یہ وہ دور تھا جب ہندو پاک کی فضاؤں میں امیر شریعتؒ، سحبان الہندؒ، مجاہد ملتؒ اور حکیم الاسلامؒ جیسے منجھے منجھائے خطیبوں کی آوازیں گونج رہی تھیں، وہ ایک پرشور آہنگ اور اسلوب کے ساتھ آئے اور دلوں پر چھاتے چلے گئے، عوام الناس کے دلوں پر بھی اور خواص کے دلوں پر بھی، ایک وقت وہ آیا کہ ان کا خطاب کسی جلسے کی کامیابی کی ضمانت سمجھا جانے لگا دارالعلوم دیوبند میں اور دارالعلوم وقف میں منعقد ہونے والے جلسوں کے اسٹیج پر اور ان دونوں اداروں سے باہر مختلف تقریبات میں انہیں بارہا بلکہ بار بار سننے کا شرف حاصل ہوا، اور ہر مرتبہ خود کو معنی ومفہوم کی لذت آفرینیوں کے ساتھ ساتھ زبان وبیان کی سحر طرازیوں میں گم پایا، اللہ تعالیٰ نے حضرت شاہ صاحبؒ کو تقریر کا وہ عجیب وغریب ملکہ عطا فرمایا تھا کہ اس کی نظیر مشکل سے ملے گی، جوش وخروش سے بھرپور لہجہ مؤثر، دلچسپ اور مسحور کن انداز بیان، کوثر وتسنیم سے دھلی ہوئی زبان، الفاظ ومعانی کا ایک سیل بے کراں، یکساں روانی کے ساتھ بہتا ہوا اور موجیں مارتا ہوا، سننے والا محسوس کرتا کہ کانوں میں رس گھل رہا ہے، دیکھنے والا دیکھتا کہ الفاظ کیا نکل رہے ہیں موتی

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

جھڑ رہے ہیں، تقریر نہ زیادہ مختصر ہوتی اور نہ زیادہ طویل، شروع ہی سے سامعین کو جکڑ کر چلتے اور اس سے پہلے کہ سننے والے آواز کے سحر سے باہر نکل کر آتے کرسی چھوڑ کر کھڑے ہو جاتے، دل چاہتا کاش یہ سلسلہ اسی طرح دراز رہتا، ان کی تقریر کا اختتامیہ فجائیہ کی شکل اختیار کر لیتا تھا اور حاضرین مجلس کی آتش شوق بھڑک بھڑک کر ٹھنڈی ہوا کرتی تھی، یہ حقیقت ہے کہ ان کا انداز بیان بالکل انوکھا اور نرالا تھا، ہماری طالب علمی کے زمانے میں بہت سے طلبہ اس لہجے کی مشق کیا کرتے تھے، اور شاہ صاحبؒ کے انداز پر تقریر کرنے والوں کی آوازیں اکثر و بیشتر دارالعلوم کی فضاؤں میں گونجتی رہتی تھیں۔ اب یہ آواز ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی ہے، شاعر نے کسی ایسے ہی موقع کے لیے کہا تھا

زمزموں سے جس کے لذت گیر اب تک گوش ہے
کیا وہ آواز اب ہمیشہ کے لیے خاموش ہے

حضرت شاہ صاحبؒ کی تقریروں میں ایک خاص بات یہ تھی کہ وہ اکابرین دیوبند کے واقعات موقع بہ موقع سناتے ہوئے چلتے تھے، یہ بات دعوے کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اپنے بزرگوں کی زندگی کا ایک ایک لمحہ کسی خوب صورت منظر کی طرح ان کے ذہن کے کینوس پر اس طرح مرتسم تھا کہ وہ جب چاہتے اس منظر سے خود بھی لطف اندوز ہوتے اور اپنے ساتھ دوسرے کو بھی لطف اٹھانے کا موقع فراہم کرتے، وہ اس خوبی کے ساتھ واقعے کی منظر کشی کرتے کہ سننے والا خود کو ان ہی فضاؤں میں گردش کرتا ہوا محسوس کرتا جن فضاؤں سے وہ واقعہ متعلق ہوتا، یہ ان کے بیان کی خوبی تھی کہ وہ بات ہی بات میں اپنے بزرگوں کی تاریخ کے زریں نقوش بھی اجاگر کرتے چلتے اور ان میں پوشیدہ عبرت، موعظت اور نصیحت کے پہلوؤں کو بھی کانوں کے راستے دلوں میں اتار دیتے، بلا شبہ اکابر کے افادات پر ان کی گہری نظر تھی اور یہ اس بات کی

علامت ہے کہ ان کا مطالعہ وسیع تھا، اور اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ان کے مزاج میں وہ ذوق رچ بس گیا تھا جسے ہم دیوبندیت کہتے ہیں، ان کی تقریروں کا ایک مجموعہ ''خطباتِ کشمیری'' کے نام سے زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکا ہے۔

ہمارے حلقوں میں مدرس تو بہت ملتے ہیں، ایسے ماہرین فن اساتذہ کی نہ پہلے کمی تھی اور نہ آئندہ کبھی رہے گی جو مختلف علوم وفنون میں مجتہدانہ بصیرت رکھتے ہوں، اور ان کی نظر متعلقہ مسائل کے تمام پہلوؤں پر ہو، البتہ عصری اسلوب میں لکھنے والوں کی کمی پہلے بھی کھٹکتی رہی ہے اور اب بھی اس سلسلے میں کوتاہی کا احساس دامن گیر رہتا ہے، حضرت شاہ صاحبؒ نے اس کوچے میں بھی قدم رکھا، اور بہت جلد صحافی ادیب اور قلم کار کی حیثیت سے متعارف ہو گئے، انہوں نے متعدد عربی کتابوں کے تراجم کئے، کئی کتابیں لکھیں، سینکڑوں مضامین قلم بند کئے، مرحوم شخصیتوں پر لکھے ہوئے ان کے مضامین ''لالہ وگل'' کے نام سے چھپ کر مقبول ہو چکے ہیں، یہ مضامین جو ادب عالیہ کا خوب صورت نمونہ ہیں، پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں، خوب صورت تراکیب، دل نشیں تشبیہات واستعارات سے مزین یہ مضامین زیر تحریر شخصیت کے متعلق بیش قیمت معلومات سے بھی لبریز ہیں، انہوں نے اپنے والد مرحوم حضرت علامہ انور شاہ صاحبؒ کے حیات اور کارناموں پر بھی ایک کتاب تحریر کی جو ''نقش دوام'' کے نام سے دارالعلوم دیوبند کے اجلاس صد سالہ سے کچھ ہی قبل منظر عام پر آئی تھی اور جس کے اجراء کی رسم حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ کے دستِ مبارک سے دارالحدیث میں انجام دی گئی تھی، اسلوب نگارش میں روایتی اندازِ تحریر سے انحراف کے ساتھ ساتھ وہ کتابوں کے دل چسپ، خوب صورت اور بامعنی نام رکھنے میں بھی روایتوں کے اسیر نہیں تھے، انہوں نے اپنے ایک تقریری مجموعہ کا نام ''گل افشانیِ گفتار'' رکھا، ''نقشِ دوام'' اصلاً حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی سوانح ہے، لیکن کتاب

میں جہاں بھی کسی شخص کا ذکر آیا، کسی کتاب کا نام آیا، کسی جگہ کا تذکرہ ہوا، کوئی مسئلہ بحث کے قابل ہوا اس پر حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنے مخصوص لب و لہجے میں اس طرح دادِ تحقیق دی ہے کہ وہ کتاب مختلف النوع معلومات کا حسین وجمیل گل دستہ بن گئی ہے، حضرت شاہ صاحبؒ کا تصنیفی کام کچھ بہت زیادہ نہیں ہے، البتہ تراجم پر وقتاً فوقتاً کام کرتے رہے ہیں اور کچھ کتابوں کے ترجمے چھپے بھی ہیں، تاہم مختلف علمی اور ادبی جریدوں میں ان کے بے شمار مضامین دبے پڑے ہیں جنہیں نکالنے اور مرتب کرنے کی ضرورت ہے، حضرت شاہ صاحبؒ کا اندازِ تحریر بھی ان کی تقریر کی طرح دل چسپ اور منفرد ہے اہل علم کی یہ عام رائے ہے کہ وہ اپنے اسلوب کے خود ہی موجد بھی ہیں اور خود ہی خاتم بھی، تقریر کی طرح ان کی تحریر کا سلسلہ بھی آخر تک برقرار رہا، پہلے کبھی خود لکھتے رہے ہوں گے اب کافی دنوں سے املا کرایا کرتے تھے، جو لوگ اس خدمت پر مامور رہے ان کا بیان ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ کا ذہن ہر وقت بیدار رہتا تھا، موضوع کتنا ہی سنگلاخ کیوں نہ ہو الفاظ ومعانی سے لبریز ان کے علوم کا چشمۂ شیریں ذرا سی تحریک پر بہنے لگتا، اور بہتا چلا جاتا، لکھنے والوں کا قلم تھک جائے، لیکن دریا کی روانی میں کمی نہ آئے، آخری بیماری کے زمانے میں بھی انہوں نے خطوط، تقریظات اداریئے اور مضامین املا کرائے، یہ کام وہی شخص کرسکتا ہے جس کے پاس معلومات کا سمندر بھی ہو، اور زبان وبیان پر قدرت بھی، اور اظہار کا سلیقہ بھی۔

دار العلوم دیوبند میں حضرت شاہ صاحبؒ نے تدریس کے ساتھ ساتھ انتظامی عہدوں پر بھی کام کیا، بالآخر وہ تعلیمات جیسے اہم شعبے کے نائب ناظم اور بعد میں ناظم بنادئے گئے، اسی دوران اجلاسِ صد سالہ کا غلغلہ مچا ہوا اور اس کے بعد وہ مشہورِ عالم ہنگامہ ہوا جس کی علمی دنیا میں مثال نہیں ملتی اور جس کے نتیجے میں حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ جیسے پاک دل، صاف کردار انسان کو دار العلوم دیوبند کا منصب

اہتمام چھوڑنا پڑا، ان کے ساتھ دارالعلوم دیوبند سے جو پچاسی افراد باہر نکل کر آئے ان میں سرفہرست حضرت مولانا انظر شاہ کشمیریؒ تھے، بعد میں دیوبند کی جامع مسجد میں دارالعلوم وقف قائم کیا گیا، اس کے قیام سے لے کر موجودہ جگہ پر اس کی منتقلی تک تعمیر وترقی کے ہر مرحلے میں حضرت شاہ صاحبؒ کا نمایاں کردار رہا ہے بلکہ اساسی کردار رہا ہے، یہاں یہ کہا جائے تو ہرگز مبالغہ نہ ہوگا کہ اگر شاہ صاحبؒ جیسا متحرک، فعال، مخلص اور وفادار شخص دارالعلوم وقف کو نہ ملتا تو یہ ادارہ وجود میں آنے سے پہلے ہی دم توڑ دیتا، آج جو کچھ یہ ادارہ ہے اس کی تعمیراتی اور تعلیمی سرگرمیاں ہیں وہ سب حضرت شاہ صاحبؒ ہی کی جہد مسلسل کا نتیجہ ہیں، اور ان ہی کی محنتوں کا ثمرہ ہیں، دارالعلوم وقف کی شکل میں جو ادارہ شاہ صاحبؒ کی کوششوں کے نتیجے میں قائم ہوا اور جو ان کی محنتوں سے پروان چڑھا اب وہ ان کی یادگار بن چکا ہے اور قیامت تک کے لیے صدقہ جاریہ بھی۔

اندرون دارالعلوم تدریس کے ابتدائی دور میں وہ جمعیۃ علما ہند سے وابستہ رہے اور ایک سرکردہ رکن کی حیثیت سے انہوں نے جمعیۃ کی سرگرمیوں میں کافی کچھ حصہ لیا، بعد میں وہ مختلف اسباب کی بنا پر اس سے الگ ہوگئے، مگر نظریاتی طور پر وہ جمعیۃ سے خود کو الگ نہ کرسکے، دوسرے جمعیتیوں کی طرح فطری طور پر ان کا جھکاؤ بھی کانگریس کی طرف تھا، کچھ دنوں کے لیے وہ بی جے پی کی طرف گئے ضرور مگر جلدی ہی انہیں یہ احساس بھی ہوگیا کہ یہ جماعت ان جیسے عالم دین کے لیے کسی بھی طرح مناسب نہیں ہے، اس مختصر وقفے کو چھوڑ کر وہ ہمیشہ کانگریس کی تائید کے اصول پر کاربند رہے، اس وقت بھی ان کے پائے استقامت میں لغزش نہیں دیکھی گئی جب اتراکھنڈ میں جہاں کانگریس کی حکومت تھی ان کے ساتھ نامناسب طرز عمل اختیار کیا گیا، اس وقت راقم السطور نے ''ترجمان دیوبند'' میں اس تکلیف دہ واقعے پر احتجاج

کرتے ہوئے حضرت شاہ صاحبؒ سے گزارش کی تھی کہ وہ اس جماعت کو الوداع کہہ دیں، کیوں کہ اب اس میں شرفاء کے لیے گنجائش کم ہی رہ گئی ہے، حضرت شاہ صاحبؒ جیسے وضع دار اور اصول پسند انسان کم ہی ہوتے ہیں، انہوں نے محض ملی مفاد کی خاطر کانگریس کو گلے لگائے رکھا، حالاں کہ اس واقعے کے بعد مختلف سیاسی جماعتوں نے انہیں باوقار عہدوں کی پیش کش بھی کی، مگر انہوں نے اس طرح کی کسی پیش کش کو درخور اعتنا نہ سمجھا۔

ان کے سیاسی نقطۂ نظر سے کسی کو کتنا ہی اختلاف کیوں نہ رہا ہو مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے جس موقف کو صحیح اور درست سمجھا وہ اس پر سختی اور مضبوطی کے ساتھ ڈٹے رہے، اس سلسلے میں نہ انہوں نے مشکلات کی پرواہ کی اور نہ کسی ناقد کی تنقید کا برا مانا، اس سلسلے کی مثال مدرسہ بورڈ کے سلسلے میں ان کا موقف ہے، یوپی اے کی حکومت نے مدارس عربیہ کی اصلاح اور اس کی جدید کاری کے عنوان سے ایک مدرسہ بورڈ تشکیل دیا تھا، اس کی خوب تشہیر کی گئی، اخبارات میں مختلف کانگریسی لیڈروں کے بیانات شائع ہوئے، جن میں کافی کچھ سبز باغ دکھائے گئے، اس سلسلے میں وزارت ثقافتی امور کی طرف سے ایک کانفرنس بھی منعقد کی گئی جس میں حکومتی نمائندے بھی کافی تعداد میں شریک تھے، مدارس عربیہ اور مسلم تنظیموں کے نمائندوں نے بھی اس کانفرنس میں حصہ لیا اور اپنے خیالات کا اظہار کیا، مسلمانوں کی طرف سے جو موقف سامنے آیا وہ یہ تھا کہ مدرسہ بورڈ ایک پرفریب اقدام ہے اس کے ذریعے مدرسوں کی امداد مقصود نہیں ہے بلکہ ایسا لگتا ہے کہ حکومت امداد کے بہانے سے ان کے داخلی معاملات میں مداخلت کی راہ ہموار کرنا چاہتی ہے، مسلک دیوبند سے وابستہ ہندوستانی مسلمانوں کی شاید ہی کوئی معروف تنظیم یا قابل ذکر مدرسہ ایسا ہو جس نے اس منصوبے کی پذیرائی کی ہو، اس سلسلے میں مختلف اجتماعات کا

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

انعقاد ہوااور بڑے واضح طور پراس منصوبے کو مسترد کرنے کا اعلان کیا گیا، ہمارے علما میں صرف حضرت شاہ صاحبؒ ایک ایسے عالم دین تھے جنہوں نے مدرسہ بورڈ کی کھل کرتائید کی اوراس سلسلے میں بیانات بھی شائع کرائے اور مضامین بھی لکھے، اس ماحول میں اکثریت کی رائے سے انحراف کرنا اور اپنا الگ موقف رکھنا بڑی جرأت کی بات تھی اور یہ جرأت صرف شاہ صاحبؒ ہی کرسکتے تھے، ان ہی دنوں تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند نے انڈیا اسلامک کلچرل سنٹر نئی دہلی میں ایک کل جماعتی اجلاس منعقد کیا، جس میں دارالعلوم دیوبند نے بھی شرکت کی، ملی جماعتوں میں جمعیۃ علماہند جماعت اسلامی، جمعیۃ اہل حدیث، مسلم پرسنل لا بورڈ کے نمائندوں کے ساتھ ساتھ شیعہ علما بھی موجود تھے، صدارت حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی فرمارہے تھے اس اجتماع میں شریک تمام حضرات کا موقف ایک ہی تھا کہ مدرسہ بورڈ کا تصور ناقابل قبول ہے، بڑی جذباتی تقریریں ہوئیں، اسی ماحول میں جس وقت حکومت کے خلاف شرکائے اجتماع کا غصہ اپنے شباب پر تھا ایک عالم دین نے جو دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل بھی ہیں اور حضرت شاہ صاحبؒ کے شاگرد بھی، اجتماع کی نظامت کرتے ہوئے جذبات کی شدت سے مغلوب ہوکر یہ کہہ دیا کہ جو علما مدرسہ بورڈ کی حمایت کررہے ہیں وہ دور اکبری کے علمائے سو ہیں، راقم اس اجتماع میں شریک تھا، یہ الفاظ مجھے سخت گراں گزرے، اور میں نے صدر جلسہ سے مخاطب ہوکر بہ صد احترام عرض کیا کہ یہ براہِ راست حضرت مولانا کشمیریؒ کی ذات پر ناروا حملہ ہے اور ان کی نیت پر شبہ کرنے کی بے ہودہ کوشش ہے، کیوں کہ آج کی تاریخ تک ہمارے حلقے کے اگر کسی عالم نے اس بورڈ کی حمایت کی ہے تو وہ حضرت مولانا انظر شاہ کشمیریؒ ہیں۔

خدا کے فضل سے یہ اجتماع باشعور حضرات پر مشتمل تھا، میری بات توجہ سے سنی

گئی اور اسی وقت تنظیم ابنائے قدیم کے کارگزار صدر اور اجتماع کے داعی حضرت مولانا عمید الزاں کیرانوی نے مائک پر تشریف لا کر ان صاحب کے جملوں پر اظہارِ افسوس کیا اور ان کو ہدایت کی کہ وہ اپنے الفاظ واپس لیں، ندامت اور افسوس کے اظہار کے بعد معاملہ تو ختم ہو گیا لیکن اسی وقت میرے دل میں یہ خیال آیا کہ حضرت شاہ صاحبؒ کی ذات ایسی نہیں ہے کہ ان کو اس طرح کے نقد وتبصرے کا نشانہ بنایا جائے، وہ ہمارے قابل احترام رہنما ہیں، ہمیں کوشش کرنی چاہئے کہ وہ بھی ہمارے ساتھ آجائیں اور ان کا موقف بھی وہی ہو جو ہم سب کا ہے، میں نے اسی وقت یہ فیصلہ کیا کہ دیوبند جا کر سب سے پہلے میرا کام یہ ہوگا کہ میں حضرت شاہ صاحبؒ سے ملاقات کروں اور ان سے درخواست کروں کہ وہ مدرسہ بورڈ کی تائید سے دست بردار ہو جائیں، اجلاس میں بھی یہ تجویز زیر بحث آئی کہ جو حضرات مدرسہ بورڈ کے سلسلہ میں نرم موقف رکھتے ہیں ان سے تبادلۂ خیال کیا جائے، اور ان کو بھی اپنے ساتھ لینے کی کوشش کی جائے، اس سلسلے میں مجھ سے حضرت مولانا عمید الزماں کیرانوی مدظلہ نے فرمایا کہ حضرت شاہ صاحبؒ سے بات چیت کا آغاز کروں اور اگر زیر بحث معاملے میں ان کے موقف میں لچک پائی گئی تو وہ ایک وفد کے ساتھ دیوبند آکر اس سلسلے کو آگے بڑھائیں گے۔

چنانچہ میں اس عزم کے ساتھ دیوبند واپس آیا، اور میں نے پہلی فرصت میں برادرم مولانا احمد خضر شاہ سے فون پر رابطہ کر کے عرض کیا کہ مجھے شاہ صاحبؒ سے ان کی شبینہ مجلس سے الگ تنہائی میں بات کرنی ہے، وہ شاہ صاحبؒ سے وقت لے کر مجھے مطلع کریں، اسی دن مغرب کے بعد کا وقت طے ہوا، میں شاہ صاحبؒ کے دولت کدے پر حاضر ہوا، میں نے حاضری کا مقصد عرض کیا، مدرسہ بورڈ کے سلسلے میں اپنی رائے رکھی، ملت کو اس بورڈ سے جو خدشات اور اندیشے ہیں ان کا اظہار کیا

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

شاہ صاحبؒ بے خبر نہیں تھے، ایک ایک بات پر ان کی نظر تھی، ایک ایک پہلو سے وہ واقف تھے، انہوں نے بتلایا کہ یہ سب اندیشے بے بنیاد ہیں، اگر حکومت مدارس کے امور میں مداخلت کرنا چاہے گی تو اسے اتنا لمبا راستہ اختیار کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ پھر مدرسہ بورڈ کے سلسلے میں حکومت نے جو پروگرام ترتیب دیا ہے اس کی کس شق سے مداخلت کا راستہ ہموار ہوتا ہے؟ ہم مدرسہ بورڈ سے کسی قانون کے تحت بندھنے نہیں جا رہے ہیں، صرف زبانی سمجھوتہ ہوگا اگر حکومت ہمارے مدرسوں کی کچھ مدد کرنا چاہتی ہے تو آخر مداخلت کے خدشات کی بنیاد پر اس مدد سے منھ کیوں موڑ رہے ہیں جب کہ ہمارے طلبہ اور اساتذہ اس کے مستحق بھی ہیں اور ضرورت مند بھی شاہ صاحبؒ خواہ مخواہ اس کی تائید نہیں کر رہے تھے ان کے پاس مضبوط دلائل تھے، وہ بار بار فرمایا کرتے تھے کہ مدارس کی اصلاح بے حد ضروری ہے، طلبہ کا معیار زندگی بڑھنا چاہئے، جدید علوم کا اضافہ ہونا چاہئے، اساتذہ کی تنخواہیں بہت کم ہیں ان میں اسکولوں اور کالجوں کے معیار کے مطابق اضافہ ضروری ہے، یہ سب باتیں سننے کے بعد میں نے عرض کیا آپ کی تمام باتیں سر آنکھوں پر اس وقت تو صرف اتنی گزارش ہے بلکہ مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ آپ بھی مدرسہ بورڈ کی مخالفت کریں، کیوں کہ لوگ آپ کی ذات کو نشانہ بنا رہے ہیں، اس گفتگو کے درمیان شاہ صاحبؒ دیوار سے ٹیک لگا کر تشریف فرما تھے، میری بات سن کر سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور فرمایا کہ بھائی میں اس کی پرواہ نہیں کرتا کہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں اور کیا کہیں گے میں تو اس بورڈ کی اس لیے تائید کر رہا ہوں کہ میں علی وجہ البصیرۃ اسے مدرسوں کے حق میں مفید سمجھتا ہوں، البتہ گفت وشنید اور افہام وتفہیم کے لیے ہر وقت تیار ہوں۔

حضرت شاہ صاحبؒ کے اس مضبوط اور مدلل موقف نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ علم وفضل کی دنیا میں کمی نہیں ہے، لیکن خلوص، للّٰہیت اور دین کی تڑپ وہ

جنسِ گراں مایہ ہے جواب خال خال ہی ملتی ہے، اخلاص کی قیمت پر وہ کوئی سمجھوتہ کرنے کے لیے راضی نہیں ہوئے، میں ان کے اس جذبۂ صادق اور عزم راسخ کو سلام کرتا ہوا رخصت ہوا۔

حضرت شاہ صاحبؒ انقلابی فکر رکھتے تھے، وہ محدود انداز میں سوچنے والوں میں سے نہیں تھے، ان کا طائر فکر جہانوں کی وسعت میں پرواز کرتا نظر آتا تھا، روایات کے احترام اور تقلید کے ساتھ ساتھ وہ مدارس کی دنیا میں نئے اور مفید تجربوں کی بھی ہمت افزائی کیا کرتے تھے، چند سال پہلے انہوں نے دارالعلوم وقف کے برابر میں ''جامعۃ الامام انور'' کے نام سے ایک تعلیمی ادارہ قائم کیا، وہ مدارس کے نصاب ونظام تعلیم میں کچھ مفید اور نتیجہ خیز تبدیلیاں لانا چاہتے تھے، ایک تو یہ کہ نصاب تعلیم کچھ مختصر ہو دوسرے یہ کہ وہ نصاب غیر ضروری علوم وفنون کی کتابوں سے بوجھل نہ ہو تیسرے یہ کہ طالب علم درس نظامی کے ساتھ ساتھ انگلش، ہندی اور کمپیوٹر وغیرہ کی تعلیم بھی حاصل کرلے، تعلیم کے اس نہج پر انہوں نے کام شروع کردیا تھا، اور اچھے ثمرات مرتب ہورہے تھے کہ خالق حقیقی کی طرف سے بلاوا آگیا، اس طرح ان کا یہ خواب تشنۂ تعبیر رہ گیا، امید ہے ان کے جانشین اور لائق فرزند مولانا احمد خضر شاہ کشمیری اس ادارے کو شاہ صاحبؒ کے متعین کردہ خطوط کے مطابق پروان چڑھانے کی کوشش کریں گے۔

''جامعۃ الامام انور'' میں انہوں نے ایک تصنیفی شعبہ بھی قائم کیا تھا، جس کا مقصد بہ طور خاص حضرت علامہ سید انور شاہ کشمیریؒ کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں کی اشاعت، عربی مصنفات کے اردو ترجمے، اور ادھورے کاموں کی تکمیل ہے، اس ضمن میں کام شروع کیا جاچکا ہے، اور کئی کتابوں کے اردو تراجم منظر عام پر آچکے ہیں جیسے ''خاتم النبیین''، ''حیات ابن مریم'' وغیرہ، ترمذی شریف کی عربی شرح کی پہلی جلد بھی

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

''العرف الذکی'' کے نام سے چھپ چکی ہے، یہ شرح کئی جلدوں میں مکمل ہوگی ''نوادرات کشمیری'' کے نام سے بھی ایک کتاب خود حضرت شاہ صاحبؒ کی مرتب کردہ شائع ہوئی ہے، جس میں حدیث اور فقہ وغیرہ علوم سے متعلق مباحث پر حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیریؒ کے تفردات جمع کردئے گئے ہیں، بخاری شریف کی مشہور شرح ''انوار الباری'' کی تکمیل اور تنقیح وتہذیب کا کام بھی جاری ہے، کئی ذی استعداد اور قابل حضرات حضرت شاہ صاحبؒ کی نگرانی میں یہ علمی اور تصنیفی کا کام کررہے تھے امید ہے علم دوست حضرات کی توجہ سے اس کا سلسلہ جاری رہے گا۔

حضرت شاہ صاحبؒ مجسم اخلاق تھے، بلکہ اخلاق کے معاملے میں یادگار سلف تھے، بہت سی خوبیاں ان میں ایسی تھیں جو ان جیسے عظیم المرتبت علمائے دین میں کم ہی نظر آتی ہیں، تواضع وانکساری کے ساتھ رواداری اور وضع داری، نفاست کے ساتھ سادگی، متانت اور سنجیدگی کے ساتھ بے تکلفی، یہ وہ اوصاف ہیں جنہوں نے شاہ صاحبؒ کو منفرد بنادیا تھا، ان کا ذوقِ مہمان نوازی بھی نہایت بلند تھا، ہر ملنے والے سے اس طرح پیش آتے گویا شاہ صاحبؒ اسی سے زیادہ قریب ہوں، خورد نوازی کا وصف ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، مجھے اس کا بارہا تجربہ ہوا، چند سال پہلے جب بہ نام خدا ''ترجمان دیوبند'' شروع کیا گیا تو اس کا پہلا شمارہ حضرت شاہ صاحبؒ کی خدمت میں پیش کیا گیا، ابھی تھوڑی ہی دیر گذری تھی کہ ان کے ایک دیرینہ خادم ایک لفافہ لے کر کتب خانے پر آئے، اس لفافے میں پانچ سو روپے تھے اور ایک تفصیلی خط جو ہدایتوں اور نصیحتوں سے لبریز تھا، یہ خط ہم نے ترجمان کے دوسرے ہی شمارے میں شائع کردیا تھا، یہ مضمون لکھ رہا ہوں تو حضرت شاہ صاحبؒ کی خورد نوازی اور حوصلہ افزائی کے بے شمار واقعات ذہن کی اسکرین پر روشن ہورہے ہیں، اس مختصر مضمون میں اتنی گنجائش کہاں کہ وہ سب واقعات عرض کردئے جائیں، چند ایک لکھنے کی کوشش

کرتا ہوں۔

میرے بیٹے عزیزی یاسر ندیم نے نہایت کم عمری میں اپنی کتاب "گلوبلائزیشن اور اسلام"، لکھی، اس کی رسم اجراء کی تقریب شیخ الہند ہال میں منعقد کی گئی بہ چند وجوہ حضرت شاہ صاحبؒ اس ہال میں تشریف نہیں لایا کرتے تھے، خیال ہوا کہ حضرت شاہ صاحبؒ کو دعوت دی بھی گئی تو وہ تشریف نہیں لائیں گے، پھر بھی ان کی خدمت میں دعوت پیش کردی گئی، اور وعدۂ شرکت کی بنیاد پر اعلان بھی کردیا گیا، دیکھنے والے اس وقت حیرت زدہ رہ گئے جب حضرت شاہ صاحبؒ وقت مقررہ پر تشریف لے آئے کتاب کے اجراء کی رسم انجام دی، یاسر کو کچھ نقد روپے ایک لفافے میں رکھ کر مرحمت فرمائے تقریروں کا سلسلہ دراز ہوا تو انھوں نے جلسہ گاہ سے واپسی کا ارادہ کیا، ایک تو اس وقت ان کے کچھ معمولات تھے اور دوسرے گھر میں منعقد ہونے والی روزانہ کی مجلس کے شرکاء بھی سراپا انتظار بنے ہوئے تھے جس کا انہیں شدت سے احساس تھا، مگر ہمارے لیے مشکل یہ تھی کہ حضرت شاہ صاحبؒ چلے جاتے تو مجمع منتشر ہوجاتا کیوں کہ سامعین میں اکثریت ان لوگوں کی تھی جو حضرت شاہ صاحبؒ کی تقریر کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے، ہم نے اپنی پریشانی بتلائی، شاہ صاحبؒ نے فرمایا میں ایک گھنٹے میں واپس آتا ہوں، اعلان کردیا گیا کہ شاہ صاحبؒ کچھ دیر بعد واپس تشریف لے آئیں گے، ہماری حیرت اور مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب حضرت شاہ صاحبؒ وعدے کے مطابق واپس تشریف لائے، آخر تک بیٹھے اور آخری تقریر بھی ان ہی کی ہوئی۔

یاسر کی شادی کا موقع تھا، نکاح نئی دہلی میں ہونا تھا شرکت کے لیے عزیز واقارب کے علاوہ بہت سے سرکردہ علما بھی مدعو تھے، حضرت شاہ صاحبؒ نے بھی ازراہ عنایت ومحبت دعوت قبول کرلی تھی، چنانچہ وہ اپنے صاحبزادۂ محترم

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

کے ہمراہ اپنی گاڑی میں ہماری گاڑیوں کے قافلے کے ساتھ چلے، پہلے اپنی بیٹی کے گھر جاکر پرہیزی کھانا کھایا، پھر پرگتی میدان کے اس ہال میں تشریف لائے جہاں نکاح ہونا تھا، کچھ دیر بیٹھ کر تشریف لے گئے، یہ شاہ صاحبؒ کا بڑا پن بھی تھا کہ وہ اپنے چھوٹوں کے لیے اس قدر مشقتیں برداشت کرلیا کرتے تھے۔

''جامعۃ الامام انور'' کے قیام کے بعد راقم السطور کو حضرت شاہ صاحب اس ادارے کی ہر تقریب میں یاد فرمایا کرتے تھے، کبھی کوئی انعامی جلسہ ہے، کبھی کوئی مہمان آرہا ہے اس کے اعزاز میں تقریب ہے، کبھی امتحان سالانہ کا موقع ہے، کبھی بچوں کا تقریری اور تحریری مسابقہ ہے، شاید ہی کوئی ایسا موقع ہو جب شاہ صاحبؒ نے مجھے نہ بلایا ہو، عزت نہ دی ہو، اور مائک پر نہ کھڑا کیا ہو، اپنے پروگراموں میں وہ اہل دیوبند کو خصوصیت کے ساتھ مدعو کیا کرتے تھے، اور دیوبند کے لوگ بھی حضرت شاہ صاحبؒ سے اپنے تعلق کے اظہار کے لیے حاضری کو ضروری تصور کیا کرتے تھے، اب چند سالوں سے جامعہ میں رمضان المبارک کی کسی تاریخ کو حضرت شاہ صاحبؒ دیوبند سے تعلق رکھنے والے سرکردہ افراد کو افطار پر مدعو کرنے لگے تھے، ایک مرتبہ تو ایسا ہوا کہ نہ یہاں شاہ صاحبؒ تھے اور نہ ان کے بیٹے، اس کے باوجود دعوتِ افطار کا اہتمام کیا گیا، شرکاء کے دلوں میں اس کی بڑی قدر ہوئی۔

رمضان المبارک کے ذکر پر یاد آیا کہ تین چار سال پہلے نماز تراویح کے بعد میرے موبائل پر مولانا احمد خضر شاہ صاحبؒ کا فون آیا کہ میں دہلی میں ہوں، حضرت شاہ صاحبؒ بھی دہلی میں ہیں، برطانیہ کے سفر کا پروگرام ہے، تم سے کچھ مشورہ چاہتے ہیں، حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ بھائی میں اس طرح کے جھمیلوں سے دور ہی رہتا ہوں، لیکن اب کچھ لوگ کہتے ہیں کہ رمضان کا سفر ختم کرکے دیوبند میں مقیم رہوں، اور جامعہ کی مسجد میں سنت اعتکاف بھی ادا کروں، کچھ ترجمہ وتفسیر بھی بیان

کر دیا کروں، ہوسکتا ہے اس سے کچھ لوگوں کو فائدہ ہو جائے، شاہ صاحبؒ نے یہ بھی فرمایا کہ تم میرے مخلص ہو اس لیے تمہاری رائے مطلوب ہے، میں نے اس اعتماد کے لیے شاہ صاحبؒ کا شکریہ ادا کیا اور عرض کیا کہ جن لوگوں نے بھی یہ مشورہ دیا ہے وہ شکریے کے مستحق ہیں، واقعی آپ کو دیوبند میں قیام کرنا چاہیے، اور افادے اور افاضے کے اس سلسلے کو مزید وسیع کرنا چاہیے، اس طرح حضرت شاہ صاحبؒ دیوبند واپس تشریف لے آئے، اور اس وقت سے رمضان المبارک کے مہینے میں دیوبند ہی میں قیام فرمانے لگے، عصر اور تراویح کے بعد درس تفسیر کا سلسلہ بھی شروع فرمادیا تھا جو آخری رمضان تک جاری رہا۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے ''تنظیم علمائے ہند'' قائم کی تو مجھے اس کا رکن بنایا بلکہ صوبہ یوپی کے لیے اس کا صدر بھی نامزد کیا، اس کے بعد جب بھی ملاقات ہوتی فرمایا کرتے تھے بھائی تم تو ہماری تنظیم کے اہم ذمہ دار ہو، شاہ صاحبؒ کی محبت اور ناچیز سے تعلق کے بہت سے واقعات یاد آتے جارہے ہیں لیکن مضمون کی تنگ دامانی کا گلہ ہے۔

راقم السطور سے حضرت شاہ صاحبؒ کو جو تعلق تھا اس کا تقاضا یہ ہے کہ ''ترجمان دیوبند'' کا ضخیم نمبر شائع کیا جاتا، لیکن ایک ماہ کی مختصر مدت میں مضامین کی فراہمی ممکن نہ تھی اور کتابت وطباعت کے مرحلوں سے نمٹنا آسان نہ تھا، مجبوراً اسی شمارے پر اکتفا کیا جارہا ہے، اسے ناچیز کی طرف سے اس شمارے کو حضرت شاہؒ کی شخصیت اور خدمات کو ادنیٰ خراج عقیدت تصور کیا جائے۔

حضرت شاہ صاحبؒ تو تشریف لے گئے، آج نہیں تو کل انہیں جانا ہی تھا، مگر ان کے تلامذہ اور عقیدت مندوں کے لیے یہ امر باعث اطمینان ہونا چاہیے کہ وہ اپنے پیچھے دارالعلوم وقف اور جامعۃ الامام انور جیسے دو بڑے ادارے چھوڑ گئے ہیں

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انہوں نے اپنے فرزندار جمند مولانا احمد خضر شاہ کشمیری کی کچھ اس انداز سے تربیت کی ہے کہ خدا نے چاہا تو وہ اپنے والد کے حقیقی جانشین ثابت ہوں گے، وہ اپنے مزاج و مذاق اور اخلاق و عادات کے اعتبار سے اپنے والد ماجد کی بہترین یادگار رہیں، اللہ تعالیٰ انہیں اور ان کے تمام گھر والوں کو صبر جمیل عطا فرمائے اور انہیں اپنے والد مرحوم کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

منفرد عالم دین

حضرت مولانا سید انظر شاہ کشمیریؒ

دیوبند آہستہ آہستہ روحانی اور علمی شخصیتوں سے خالی ہوتا جارہا ہے، جو چند گنے چنے لوگ رہ گئے ہیں وہ بھی عمر کی اس منزل میں ہیں کہ نہیں کہا جاسکتا کب کیا ہوجائے، موت ایک تلخ سچائی ہے اور ہر ذی نفس کو اس سچائی کا سامنا کرنا ہے، جو لوگ رخصت ہورہے ہیں انہیں جلد یا بہ دیر رخصت ہونا ہی تھا، مگر ان حضرات کے جانے سے جہاں یہ غم ہے کہ یہ لوگ علم وعرفان کی محفلوں سے اٹھ کر چلے گئے وہاں یہ غم بھی ہے کہ ان کے جانے سے جو جگہیں خالی ہورہی ہیں ان کو پُر کرنے والا کوئی نہیں ہے اس لیے ہر ایسا حادثۂ وفات غمابغم کی تفسیر بن کر رونما ہوتا ہے، بعض دفعہ یہ خیال آتا ہے کہ کہیں وہ دور تو نہیں آگیا جس کے بارے میں سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا: **يذهب الصالحون الأول فالأول ويبقى حفالة كحفالة الشعير أو التمر لايباليهم الله بالة.** (بخاری: ۵/۲۳۶۴، رقم الحدیث: ۶۰۷۰۔) ''نیک لوگ یکے بعد دیگرے اٹھتے چلے جائیں گے اور جو یا کھجور کے کباڑ کی طرح بے کار لوگ باقی رہ جائیں گے، جن کی اللہ تعالیٰ کوئی پرواہ نہیں کرے گا''۔

۲۶/ اپریل ۲۰۰۸ء کو محدث کبیر حضرت مولانا سید انظر شاہ کشمیریؒ کے سانحۂ وفات کے بعد ہر زبان پر یہی الفاظ ہیں کہ یہ کمی آسانی سے پوری نہیں ہوگی، یہ خلا کبھی پر نہیں

ہوگا، ان کی وفات سے علمی دنیا کو جو نقصان پہنچا ہے اس کی تلافی بہت مشکل ہے، یہ اور اس طرح کے بہت سے جملے سننے اور پڑھنے کو مل رہے ہیں، عموماً جب کسی بڑی شخصیت کا انتقال ہوتا ہے تو بہ طور تعزیت لوگ اسی طرح اپنے غم واندوہ کی تفسیر بیان کرتے ہیں، اکثر حالات میں انہیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ الفاظ جو ان کی زبان سے نکل رہے ہیں حقیقت کے پیرہن سے محروم ہیں اور بہت جلد لوگ انہیں بھول بھی جاتے ہیں اور یہ احساس بھی نہیں ہوتا کہ فلاں شخص کے اٹھ جانے سے کبھی کوئی خلا پیدا بھی ہوا تھا، مگر ان ہی میں بعض شخصیتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو ان تعزیتی جملوں کا حقیقی مصداق بن جاتی ہین، ہم صرف اپنے دائرے میں رہ کر بات کرتے ہیں، حضرت شیخ الہندؒ کے بعد دارالعلوم میں کوئی ایسی ہمہ گیر اور ہمہ جہت شخصیت پیدا نہیں ہوسکی جو ہر پہلو سے ان کی جانشینی کا حق ادا کرتی، یوں ان کے باکمال شاگردوں نے مختلف میدانوں میں کارہائے نمایاں ضرور انجام دئے ہیں اور جب ان کے شاگردوں کی جماعت ایک ایک کرکے رخصت ہوئی تو زمانہ ان کی نظیر پیش کرنے سے قاصر رہا، آج تک دارالعلوم کو علامہ انورشاہ کشمیریؒ جیسا نابغۂ روزگار عالم اور عبقری صفت محدث میسر نہ آسکا، شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ جیسا متبحر عالم دین، درویش صفت انسان اور بے مثال قائد نصیب نہ ہوسکا، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ جیسا گنجینۂ علوم ومعارف اور سرچشمۂ رشد وہدایت نہ مل سکا، ان کے شاگردوں کی طرف آیئے تو حکیم الاسلام حضرت قاری محمد طیبؒ جیسے جامع الصفات والکمالات مہتمم کو دارالعلوم دیوبند کے در ودیوار آج تک تلاش کررہے ہیں اور آئندہ بھی ان کی تلاش کا یہ سفر جاری رہے گا، اب آگے بڑھئے محرومیوں کا یہ سلسلہ رک نہیں گیا، وحید العصر حضرت مولانا وحید الزماں صاحبؒ رخصت ہوئے تو اس ادارے کو آج تک کوئی ایسا شخص میسر نہ آسکا جس نے عربی زبان وادب کے باب میں دارالعلوم دیوبند کو

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

اوجِ ثریا پر پہنچا دیا، جس کے اندر اخلاص کے ساتھ عمل کا جذبہ اور شفقت ومحبت کے ساتھ حسن تربیت کا سلیقہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، اور اب حضرت مولانا نظر شاہ کشمیریؒ بھی ان یگانۂ روزگار اور عدیم النظیر شخصیتوں کے کارواں سے جا ملے۔

دارالعلوم دیوبند کے فضلائے کرام نے، ذمہ داران مدارس نے، دانشوران وطن نے، ارباب علم نے، اصحابِ قلم نے، ماہرینِ سیاست نے اور ان کے ساتھ عوام کے ایک بڑے طبقے نے حضرت شاہ صاحبؒ کی وفات پر جس طرح اپنے رنج والم کا اظہار کیا ہے ماضی قریب میں اس کی نظیر نہیں ملتی، لوگ اپنے اپنے تعلق کے پیمانے سے اس حادثے کا دکھ محسوس کر رہے ہیں، اور اپنی تقریروں کے ذریعے اس کرب کا اظہار بھی کر رہے ہیں، راقم السطور بھی حضرت شاہ صاحبؒ کے خوان علم کا خوشہ چیں رہا ہے، درس گاہ کے علاوہ بھی اسے بارہا حضرت شاہ صاحبؒ کی تقریریں سننے کا، ان کی تحریریں پڑھنے کا، ان کی مجلس میں بیٹھ کر بہ راہِ راست استفادہ کرنے کا موقع ملا، اس لیے ان کے بے شمار شاگردوں کی طرح وہ بھی ان کی وفات کے بعد حزن وملال کی کیفیت سے باہر نہیں نکل پا رہا ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کی زندگی پر بہت کچھ لکھا جارہا ہے، اور بہت کچھ لکھا جائے گا، ہر شخص اپنے مشاہدات کی روشنی میں اپنے تأثرات قلم بند کر رہا ہے، کوئی ان کے عالمانہ مقام ومرتبے پر لکھ رہا ہے، کوئی ان کی خطیبانہ صلاحیت پر دادِ تحسین دے رہا ہے، کوئی ان کے اسلوب نگارش پر سر دُھن رہا ہے، کوئی ان کے ذاتی وشخصی اوصاف وکمالات پر روشنی ڈال رہا ہے، راقم السطور کو طالب علمی کے زمانے میں اور اس کے بعد جو تھوڑی بہت قربت حضرت شاہ صاحبؒ سے رہی ہے اور اس دوران بہ قدر ظرف جو کچھ اس نے حاصل کیا ہے اس کی روشنی میں ''ترجمان دیوبند'' کے ادارتی صفحات پر کچھ خامہ فرسائی بھی کی گئی بعد میں احساس ہوا کہ مضمون اگرچہ طویل ہوگیا ہے لیکن

ابھی بہت کچھ لکھنا باقی ہے، اور بہت سی باتیں ایسی ہیں جو اس مضمون میں نہیں آسکیں پیش نظر سطور کو اسی مضمون کا تتمہ یا تکملہ سمجھنا چاہئے۔

حضرت شاہ صاحبؒ میں بعض باتیں ایسی تھیں جو ان کے معاصر علما میں تقریباً مفقود ہو چکی ہیں، سب سے بڑی بات تو یہ کہ وہ انتہائی متواضع اور خلیق انسان تھے، ہر شخص سے پہلی ملاقات میں بے تکلف ہو جاتے تھے، اور گفتگو کے دوران کوئی شخص یہ محسوس نہیں کرتا تھا کہ وہ ان کے لیے اجنبی ہے یا ان سے پہلی دفعہ مل رہا ہے شاہ صاحبؒ کا دستر خوان بھی نہایت وسیع تھا، ہر آنے جانے والے کو بے حد اصرار کے ساتھ روکتے تھے اور پورے اہتمام کے ساتھ اس کی ضیافت فرماتے تھے، مہمان نوازی کی شان یہ تھی کہ بار بار تقاضا کر کے کھلاتے اور خود ایک دانہ بھی لینے کے روادار نہ تھے، اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت شاہ صاحبؒ کو اپنی صحت اور تندرستی کا بے حد خیال تھا وہ کھانے پینے کے معاملے میں بڑے محتاط تھے، انھیں معلوم تھا کہ کیا کھانا ہے اور کیا نہیں کھانا ہے، کس وقت کھانا ہے، اور کس وقت نہیں کھانا ہے آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ شاہ صاحبؒ نے عمر کے آخری چالیس برسوں میں کبھی گوشت نہیں کھایا کیوں کہ ایک وقت وہ ایک شدید مرض میں مبتلا ہوئے تھے اور اس وقت ڈاکٹروں نے گوشت نہ کھانے کا مشورہ دیا تھا، ایسا بار بار ہوا کہ دستر خوان پر سب لوگ جمع ہیں، انواع واقسام کے لذیذ کھانے سجے ہوئے ہیں، کھانے والے خوب کھا رہے ہیں اور شاہ صاحبؒ امرود یا سیب کی قاشیں چھیل چھیل کر کھانے میں مشغول ہیں، پرہیز انسانی زندگی کا سب سے صبر آزما کام ہے، اور یہ کام وہی شخص کرسکتا ہے جسے صحت کے ساتھ زندگی عزیز ہو، کھانے میں احتیاط کے علاوہ صبح وشام کی لمبی سیر بھی ان کے معمولات زندگی میں شامل تھی، سفر میں ہوں یا حضر میں اس معمول میں کبھی فرق نہیں آتا تھا، ٹہلنے کا وقت ہوتا اور سفر میں ہوتے گاڑی رکوا کر ٹہلنا شروع کر دیتے یا ٹرین میں ہی ادھر سے

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

ادھر چکر لگا لیتے تھے حد یہ ہے کہ ہوائی سفر میں بھی اپنی سیٹ سے اٹھ کر پیچھے کی طرف جا کر کھڑے ہو جاتے یا جہاز کے اگلے حصے میں پہنچ جاتے اس طرح کے دو چار چکر لگا کر انہیں اطمینان ہو جایا کرتا تھا، معمولات کی اتنی سخت پابندی اس قدر مصروفیات کے ہجوم میں حیرت انگیز ہی کہی جا سکتی ہے، جب ان کے بیٹے کی شادی ہوئی اور عصر کے بعد بارات گھر سے نکل کر نکاح کے لیے روانہ ہوئی تو شاہ صاحبؒ راستے میں بارات کو چھوڑ کر آگے بڑھ گئے اور اپنے معمولات پورے کر کے نکاح کی مجلس میں واپس آئے، واقعی ان کی صحت قابل رشک تھی اور اکثر ہم لوگ اپنی محفلوں میں ان کی صحت کو گفتگو کا موضوع بنایا کرتے تھے، بیاسی سال کی عمر میں بلا کی پھرتی تھی، دبلا پتلا جسم لیکن چست اور پھرتیلا، ان جیسے آدمی کے لیے پستیاں اور بلندیاں کوئی معنی نہیں رکھتی تھیں نہ اوپر چڑھتے ہوئے ہانپتے تھے اور نہ نیچے اترتے ہوئے گھٹنے پکڑتے صحت کے معاملے میں وہ واقعی ہم سب کے لیے بہترین نمونہ تھے۔

دارالعلوم وقف کو انہوں نے اپنے خونِ جگر سے سینچا اور پروان چڑھایا، اس کے ایک ایک ذرے سے انہیں عشق تھا اور ان کی ہر ہر ادا سے اس عشق کا اظہار ہوتا تھا، اس ادارے کی ترقی کے لیے ہر وقت کوشاں رہتے، وہ اسے ایک مثالی ادارہ بنانا چاہتے تھے، افسوس گذشتہ دو چار سال کے دوران بعض ایسے حالات پیش آئے کہ وہ اپنی اس خواہش کو پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچا سکے، لیکن ادارے کے ساتھ ان کے تعلق خاطر میں کوئی کمی نہیں آئی، طلبہ کے تعلق سے جب بھی کسی ضرورت کا اظہار کیا جاتا یا ان کو اس ضرورت کا از خود علم ہو جاتا تو وہ اپنے پاس سے اس ضرورت کی تکمیل کرتے بہت سے نادار طلبہ کے کفیل تھے، بعض اساتذہ وملازمین کی خاموشی کے ساتھ امداد کیا کرتے تھے، ایک استاذ کو جو کرایہ کے مکان میں رہ رہ کر تنگ آ چکے تھے اپنی خرید کردہ زمین پر مکان بنا کر دیا، شہر میں بھی وہ غریب پڑوسیوں اور رشتہ داروں کی مالی مدد سے

دریغ نہیں فرماتے تھے، آج طلبہ اور اساتذہ کی آنکھوں میں چھلکتے آنسوان کے ساتھ شاہ صاحبؒ کی عنایتوں اور نوازشوں کی داستان سنا رہے ہیں، عزیزی عزیر انور شاہ قیصر نے اس حادثۂ وفات کے بعد مرثیہ لکھا جب وہ دار العلوم وقف کے دار الحدیث میں پڑھا گیا تو ہر آنکھ نم تھی اور اس شعر نے تو ہر شخص کو تڑپا کر رکھ دیا۔ ع

وہ جس کی آنکھوں نے نیند کھوئی ہماری خاطر، تمہاری خاطر

وہ سب کی آنکھوں کی نیند لے کر جوار رحمت میں سوگیا ہے

ایسا لگتا ہے کہ دار العلوم وقف میں ابھی تک اسی شعر کی صدائے بازگشت گونج رہی ہے، اگر وہاں کی بے زبان عمارتوں کو زبان مل جائے تو وہ اپنا درد کچھ ایسے ہی لفظوں میں بیان کریں گی۔

دار العلوم وقف کا ذکر آیا تو عنانِ قلم کو ایک ایسے واقعے کی طرف موڑتے ہیں جس کے ذکر سے ایک بڑی غلط فہمی کا ازالہ ہوگا، دار العلوم وقف کے قیام کے پسِ منظر سے کون واقف نہیں ہے اور جو شخص اس پس منظر سے واقف ہے وہ یہ بھی جانتا ہے کہ دار العلوم دیوبند اور وقف دریا کے دو ایسے کنارے سمجھے جاتے تھے جو کبھی ایک دوسرے سے نہیں مل سکتے، دونوں اداروں میں رہنے والے طلبہ اور اساتذہ تو اس کش مکش سے عاجز و پریشان تھے ہی اہل شہر بھی کم نہ تھے۔ ہم جیسے لوگوں کے لیے یہ پریشانی اس لیے زیادہ تھی کہ ہم دونوں اداروں سے ربط ضبط رکھنا چاہتے تھے، دونوں طرف اپنے لوگ تھے، اپنے اساتذہ، اپنے عزیز واقارب اپنے دوست احباب۔ صورت حال یہ تھی کہ دار العلوم (وقف) کے لوگ دیوبند کی عیدگاہ میں نماز پڑھنے کے روادار نہ تھے، اور دار العلوم دیوبند کے لوگ شہر کی جامع مسجد کے قریب بھی نہیں پھٹکتے تھے، سالہا سال تک دار العلوم وقف کے متعلقین کے جنازے جامع مسجد کی سیڑھیوں پر رکھ کر پڑھے گئے، اگر کوئی جنازہ احاطۂ مولسری میں چلا بھی جاتا تو بہت سے لوگ

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

نماز جنازہ سے صرف اس لیے محروم رہ جاتے کہ انہیں دار العلوم میں قدم رکھنا گوارا نہ تھا، شیخ الہند ہال میں منعقد ہونے والی تقریبات میں دار العلوم وقف کے ذمہ دار حضرات اور ان کے متعلقین قدم رکھنا بھی پسند نہیں کرتے تھے، یہ صورت حال بڑی خراب اور تکلیف دہ تھی، میں نے ”ترجمان دیوبند“ میں بارہا اس صورت حال پر ماتم کیا۔

ایک سال عید کی نماز کے موقع پر حضرت مولانا سید اسعد مدنیؒ نے اپنی تقریر میں اسی کشیدگی کو موضوع بنایا، اس تقریر سے امید کی کرن جاگی، اور میں نے ”ترجمان دیوبند“ میں (دیوبند کی عیدگاہ میں مولانا اسعد مدنیؒ کی تقریر امید کی ایک کرن) کے عنوان سے اداریہ لکھا، لوگوں کو پہلی مرتبہ یہ احساس ہوا کہ دو اداروں کی لڑائی میں ہم خواہ مخواہ پس رہے ہیں، اسی دوران جمعیۃ علما ہند نے غیر مقلدین کے خلاف کانفرنس کے انعقاد کا اعلان کیا، میں نے ترجمان میں لکھا کہ آپ مسلک دیوبند کے تحفظ کی بات کر رہے ہیں اور حال یہ ہے کہ اس مسلک کے لوگ دیوبند سے لے کر پورے ہندوستان میں بلکہ ہندوستان سے باہر بھی اس جھگڑے کی وجہ سے دو گروہوں میں منقسم ہیں، میں نے منتظمین سے درخواست کی کہ آپ اس میں دار العلوم وقف کو ساتھ لے کر چلیں، مجھے بے حد خوشی ہوئی جب جمعیۃ کے دفتر سے دار العلوم وقف کے ذمہ داروں کے نام دعوت نامہ دیوبند کے ایک ذمہ دار شخص کے ذریعے مجھ تک پہنچا، اور مجھ سے کہا گیا کہ یہ دعوت نامہ میں متعلقہ حضرات تک پہنچا دوں، اور ان کو کانفرنس میں شرکت پر آمادہ کروں، میں نے وقف کے دونوں بڑے ذمہ داروں، حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی اور حضرت مولانا محمد انظر شاہ صاحب کشمیریؒ سے ملاقات کی، اور ان کی خدمت میں یہ دعوت نامہ پیش کیا، میں یہ بتلا دوں کہ اس دعوت نامے کو قبول کرنے کے معاملے میں حضرت انظر شاہ صاحب کشمیریؒ کا رویہ زیادہ مثبت تھا، اس سے مجھے امید ہوئی کہ یہ حضرات دعوت ضرور قبول کریں گے، ایسا ہی ہوا ان حضرات نے دو اساتذہ پر مشتمل

اپنا ایک وفد شرکت کے لیے دہلی روانہ کیا اور اس طرح پہلی مرتبہ یہ امید پیدا ہوئی کہ کشیدگی میں کمی ہوسکتی ہے، اس کے بعد تمام قصے آپ کو معلوم ہیں ''ترجمان دیوبند'' کے متعدد مضامین صرف ان ہی قصوں سے بھرے پڑے ہیں، حضرت مولانا اسعد مدنیؒ کی علالت، حضرت مولانا محمد سالم صاحب کی عیادت، سعودی عرب سے واپسی پر حضرت مولانا اسعد مدنیؒ کا مکتوب، دوسری جانب سے اس کا جواب، آنا جانا، دعوتیں سلام کلام، نامہ و پیام سب کچھ شروع ہوا، اس وقت یہ بات مشہور کی گئی کہ حضرت شاہ صاحبؒ اس صلح سے ناخوش ہیں، میں اس واقعے کا چشم دید گواہ بلکہ ایک کردار رہا ہوں، اس لیے میں پوری ذمہ داری کے ساتھ یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ شاہ صاحبؒ صلح کی ان کوششوں سے کبھی ناخوش نہیں ہوئے، وہ دل سے چاہتے تھے کہ صلح ہو، دوریاں ختم ہوں، قربتیں بڑھیں، اگر انہیں ملال تھا تو صرف یہ کہ اس پورے معاملے میں انہیں نظر انداز کرنے کی کوشش کی گئی ہے، دار العلوم وقف کے ایک بڑے ذمہ دار ہونے کی حیثیت سے وہ اس احساس میں حق بجانب تھے، وہ چاہتے تھے صلح ہو، لیکن سب کو ساتھ لے کر ہو، ان کا کہنا تھا کہ یہ دو شخصوں کی ذاتی لڑائی نہیں تھی بلکہ دو اداروں کا جھگڑا تھا، دونوں ہی اداروں کے سرکردہ افراد مل بیٹھ کر کسی اصول کے تحت اور کسی بنیاد پر اس جھگڑے کو نمٹا سکتے ہیں، بعد کے حالات نے ثابت کردیا کہ وہ خود بھی صلح جو انسان تھے، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے صلح کی خوشی کے موقع پر دی جانے والی دعوت میں شرکت کی، خود بھی اپنے گھر پر دونوں گھرانوں کو مدعو کیا، حکیم الاسلام عالمی سمینار کے موقع پر دار العلوم دیوبند کی طرف سے دیئے جانے والے عشائیہ میں شریک ہوئے، ۲۵/فروری ۲۰۰۸ء کو دہشت گردی کے خلاف منعقد ہونے والی کانفرنس کے لیے بیماری کے باوجود پیغام لکھوایا، خود شرکت کرنا چاہتے تھے، لیکن بیماری کی وجہ سے ایسا ممکن نہ تھا، اس لیے یہ پیغام ان کے صاحبزادے نے پڑھ کر سنایا۔

میں جانتا ہوں کہ جو کچھ لکھا جارہا ہے وہ تاریخ کا حصہ بنے گا، اس لیے میں ذمہ داری کے احساس کے ساتھ لکھ رہا ہوں، افسوس حضرت شاہ صاحبؒ کے آخری ماہ وسال دارالعلوم (وقف) کے حوالے سے بڑے تکلیف دہ گزرے ہیں، بعض خارجی عناصر کی ریشہ دوانیوں سے دارالعلوم (وقف) کے دونوں بڑے ذمہ داروں میں دوری پیدا ہوئی، اور بہت سے مواقع پر اس دوری کا احساس کرایا گیا، ایسا ہی ایک موقع تھا ''حکیم الاسلام عالمی سمینار'' کا جب ان کو اس سے پوری طرح دور رکھا گیا، یہاں تک کہ وہ دیوبند میں رہے اور انہیں اس سمینار میں شریک تک نہیں کیا گیا، ہر شخص ان کی عدم موجودگی پر سوالیہ نشان بنا ہوا تھا، ہم اہل دیوبند بھی یہ منظر خاموشی سے دیکھ رہے تھے، حالات دن بہ دن ناگفتہ بہ ہوتے جارہے تھے ایک وقت وہ آیا کہ دارالعلوم وقف کے انتظامی معاملات ہندی اور اُردو کے اخبارات میں اچھالے جانے لگے تو ہم جیسے لوگوں کے دل بے چین ہو گئے جو اس دارے سے لگاؤ رکھتے ہیں اور اس کے ذمہ داروں کے ساتھ شاگردی اور قرابت داری کا تعلق بھی رکھتے ہیں، چناں چہ ہم چند سر پھرے لوگوں نے یہ فیصلہ کیا کہ دونوں اکابر سے مل کر ان پیچیدہ معاملات کو درست کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، پوری دیانت داری اور اخلاص کے ساتھ ہم نے مصالحت کی کوششوں کا آغاز کیا، ان دونوں بزرگوں سے اور ان کے صاحبزادوں سے اور دارالعلوم وقف کے دیگر بڑے ذمہ داروں سے ملاقاتیں کیں، ان ملاقاتوں کے نتیجے میں جو تجویزیں سامنے آئیں ان کو تحریری شکل دی گئی، میٹنگیں ہوئیں، مصالحت کے فارمولے تیار کئے گئے اتفاق رائے سے کچھ فیصلے بھی ہوئے اور امید بندھی کے اب اس ادارے کے حالات سابقہ سطح پر آجائیں گے، اور یہ حضرات پھر سے شیر و شکر ہو کر ادارے کی تعمیر و ترقی میں اپنا بھرپور کردار ادا کریں گے، ایسا ہونا بالکل طے تھا کہ کچھ طالع آزما سامنے آئے اور انہوں نے اپنی سازشوں سے ہماری ساری امیدیں

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

خاک میں ملا دیں، یہ وہ لوگ تھے جن کے مادی مفادات اس مصالحت کی زد میں آرہے تھے، ع اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

یہ تمام باتیں اس لیے لکھی گئیں کہ بعض غلط فہمیاں صحیح بات معلوم نہ ہونے کی وجہ سے معاشرے میں پھیل جاتی ہیں، اور سینہ بہ سینہ منتقل ہوکر غلط نتائج اخذ کرنے کا سبب بن جاتی ہیں، اس طرح کی باتیں لکھنا مشکل ضرور ہے اور بعض احتیاط پسند لوگ اس طرح کی تحریروں سے قلم کو بچانا بھی چاہتے ہیں، لیکن سچائی سچائی ہوتی ہے اسے زیادہ دیر تک چھپانا مشکل ہے اگر اس طرح کی تحریروں سے غلط فہمیوں کے دبیز پردے چاک ہوتے ہوں تو لکھنے میں تأمل نہیں کرنا چاہئے، پتہ نہیں میرا یہ نقطۂ نظر صحیح ہے یا غلط اس کا فیصلہ آپ پر چھوڑتا ہوں۔

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

رفتید ولے نہ از دلِ ما

شیخ الحدیث حضرت مولانا نصیر احمد خاںؒ

۴ رفروری ۲۰۱۰ء کی صبح دارالعلوم دیوبند کی مسجد سے سے اعلان ہوا کہ شیخ الحدیث حضرت مولانا نصیر احمد خان صاحب انتقال فرما گئے، دل ودماغ کے خرمن پر یہ خبر صاعقہ بن کر گری، حالانکہ حضرت عُمر کی اس منزل میں تھے جہاں پہنچ کر کسی بھی وقت اس سانحے سے سابقہ پیش آ سکتا تھا، مگر خبر سن کر کچھ دیر کو ایسا محسوس ہوا کہ شاید اعلان غلط ہوا ہے یا شاید ہمارے کانوں نے غلط سنا ہے، لیکن جب گھر سے باہر نکل کر تیز رفتاری کے ساتھ طلبہ کو اِدھر اُدھر آتے جاتے دیکھا اوران سے پوچھا تو پتہ چلا کہ خبر صحیح ہے، واقعی اب حضرت اس دنیا میں نہیں رہے، سوائے یقین کے کوئی چارہ نہ رہا زبان سے بے ساختہ نکلا إنا للّٰہ وانا الیہ راجعون. حضرت مولانا نصیر احمد خاں صاحبؒ نے خاصی طویل عُمر پائی ۱۳۳۵ھ مطابق ۱۹۱۷ء سال پیدائش ہے، اس لحاظ سے آپ نے چھیانوے قمری سال اس جہانِ آب وگل میں گزارے، بہت کم لوگ اس عُمر کو پہنچتے ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کا آپ پر خصوصی کرم تھا کہ اس طویل عمری کے باوجود آخر تک آپ کے ہوش وحواس سلامت رہے اور جسمانی معذوری جیسی کوئی صورت بھی پیدا نہیں ہوئی، عموماً اتنے عمر رسیدہ لوگ بالکل معذور ہوکر ہاتھوں میں آجاتے ہیں، بہت سے لوگ ہوش وحواس تک کھو بیٹھتے ہیں، بلا شبہ آپ نے انتہائی قابل رشک زندگی

گزاری اور نہایت قابل رشک موت پائی، انتقال سے کچھ دیر پہلے اپنے ایک صاحب زادے سے سورۂ یٰسین شریف کی تلاوت سُنی اور قبلہ رُو ہو کر لیٹ گئے، اسی حالت میں رات دو بج کر دس منٹ پر روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی اور اپنے مالک حقیقی سے جا ملی، انتقال کی خبر عام ہوتے ہی تمام راستوں کا رُخ اسی محلے کی طرف ہوگیا جہاں حضرت کا قیام تھا، اساتذہ، طلبہ اور اہل شہر کا ہجوم درِ دولت پر امنڈ پڑا، لمبی لمبی قطاریں لگا کر زیارت کی گئی، نماز جنازہ اور تدفین میں شرکت کے لئے نہ صرف قرب وجوار کے علاقوں سے بلکہ دور دراز کے قصبوں اور شہروں سے بھی لوگوں کے دیوبند پہنچنے کا سلسلہ شروع ہوگیا جو تدفین کے وقت تک بلکہ بعد تک جاری رہا، کاندھا دینے والوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ احاطۂ مولسری سے قبرستان قاسمی تک پہنچنا مشکل ہوگیا، ہر شخص کاندھا دینے کی سعادت حاصل کرنا چاہتا تھا، ہزاروں لوگوں نے اس گنج گراں مایہ کو باچشم نم سپرد خاک کیا، ہندوستان کے طول وعرض میں حادثۂ وفات کی خبر پلک جھپکتے پہنچ گئی، اس کے ساتھ ہی ملک بھر میں پھیلے ہوئے ہزاروں مدارس میں قرآن کریم کی تلاوت اور دعائے مغفرت کا سلسلہ شروع ہوگیا، اس سے بڑھ کر قابل رشک موت کیا ہوگی، یقیناً یہ اس شغف واشتغال کی برکت تھی جو حضرت شیخ کو عُمر بھر علوم نبویہ علی صاحبہا الصلاۃ والسلام کے ساتھ رہا اگر کوئی شخص اتنی طویل مدت تک قال اللہ وقال الرسول کی صدائے دل نواز بلند کرتا رہے تو دنیا وآخرت میں اس کی نیک بختی پر کون بدبخت شبہ کرسکتا ہے؟

حضرت شیخ الحدیث کے مختصر حالات زندگی یہ ہیں کہ آپ کی پیدائش مغربی یوپی کے مشہور شہر بلند شہر کے گاؤں بسی کے ایک رئیس گھرانے میں ہوئی، والد ماجد انگریزی حکومت میں اعلا سرکاری ملازم تھے، مگر علم دوست اور دین دار انسان تھے، علما کی قدر کرتے تھے، مشہور محدث حضرت مولانا خلیل احمد امبیٹھوی کے مرید تھے، اسی کا اثر

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

تھا کہ گھر میں دین داری کا ماحول تھا، والدہ ماجدہ بھی نیک اور خدا ترس خاتون تھیں، بیعت وارادت کے بعد جب یہ سنا کہ حضرت شیخ الہندؒ ترکِ موالات کی تحریک چلا رہے ہیں تو بلا تردد سرکاری ملازمت سے مستعفی ہوگئے اور کاشت کاری میں مشغول ہوگئے حضرت شیخ ابھی چار پانچ سال ہی کے تھے کہ والد محترم نے داعی اجل کو لبیک کہا، اس طرح آپ کے بڑے بھائی حضرت مولانا بشیر احمد خان صاحب نے آپ کی کفالت اور تعلیم وتربیت کی ذمہ داری سنبھالی، آپ ان دنوں مدرسہ منبع العلوم گلاؤٹھی میں مدرس تھے، اپنے چھوٹے بھائی کو اپنے پاس رکھ کر انھیں پڑھایا لکھایا اور جوہر قابل بنا کر دارالعلوم کے سپرد کیا، شیخ نصیر احمد خان صاحب نے مدرسہ منبع العلوم ہی میں قرآن کریم حفظ کیا اور وہیں رہ کر اپنے برادر معظم کے پاس میزان سے بخاری تک تمام متداول درسی کتب پڑھیں، ۱۳۶۲ھ مطابق ۱۹۲۴ء میں حضرت مولانا بشیر احمد خاں صاحب مدرس کی حیثیت سے دارالعلوم دیوبند تشریف لائے تو آپ کے بھائی بھی ساتھ ساتھ تھے، آپ اگرچہ گلاؤٹھی میں بخاری پڑھ چکے تھے لیکن علوم حدیث میں مزید دقّت نظر پیدا کرنے کے لیے آپ نے دارالعلوم میں داخلہ لے لیا اور دورۂ حدیث شریف کی تکمیل کی، اس سال شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ نینی الہ آباد جیل میں نظر بند تھے، آپ کی عدم موجودگی میں ترمذی شریف اور بخاری شریف شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ نے پڑھائی، ۱۳۶۳ھ مطابق ۱۹۴۳ء میں جب حضرت مدنیؒ جیل سے رہا ہوکر تشریف لائے تو حضرت شیخ نے تیسری بار حصول برکت کی غرض سے پھر ان کتابوں کے اسباق میں حاضری کا شرف حاصل کیا، ابوداؤد اور مسلم شریف بھی پڑھیں، اسی کے ساتھ مختلف علوم وفنون کی متعدد کتابوں کے درس میں بھی شرکت کی، اگلے دوسال بھی آپ نے ایک طالب علم کی حیثیت سے دارالعلوم ہی میں گزارے، اس دوران تجوید وقرأت کی بہت سی کتابیں پڑھیں، طب اور

معقولات کے درس میں بھی شرکت کی، ان دو سالوں میں آپ ہدایہ آخرین، سراجی بیضاوی، دیوان متنبّی، توضیح تلویح، مسلم الثبوت، ملا جلال، قاضی مبارک، صدرا میر زاہد، حمد اللہ وغیرہ کتابوں کے اسباق میں شریک رہے، جس قدر بھی پڑھا خوب محنت سے پڑھا، مختلف فنون میں کمال حاصل کیا اور اعلی نمبرات کے ساتھ شاندار کامیابی کے مستحق قرار پائے، دارالعلوم دیوبند میں آپ نے جن اساتذۂ فن کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا ان کے اسمائے گرامی ہیں: شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ، شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی امروہویؒ، حضرت مولانا عبدالخالق ملتانیؒ حضرت مولانا عبدالحق اکوڑہ خٹک، حضرت مولانا حافظ عبدالرحمٰن امروہویؒ، حضرت مولانا قاضی شمس الدین صاحبؒ، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ حضرت مولانا قاری حفظ الرحمٰن صاحب پرتاب گڑھیؒ اور حضرت مولانا حکیم محمد عمر صاحبؒ دیوبندی وغیرہ۔

فراغت کے بعد ملتان کے ایک بڑے مدرسے میں صدرالقراء کی حیثیت سے تقرر عمل میں آیا لیکن تائی صاحبہ اتنی دور بھیجنے پر راضی نہیں ہوئیں، اس لئے ملتان نہ جاسکے، خدا کو یہ منظور تھا کہ یہیں رہ کر دارالعلوم کی خدمت کریں ۱۳۶۵ھ مطابق ۱۹۴۵ء میں دارالعلوم دیوبند میں مدرس کی حیثیت سے تقرر ہوا، دو سال عارضی طور پر خدمات انجام دیں، دو سال کے بعد استقلال ہوگیا، حضرت شیخ نے دارالعلوم میں میزان سے بخاری تک تقریباً تمام کتابوں کا درس دیا، فن ہیئت سے خاص دلچسپی تھی، اور اس میں انتہائی مہارت رکھتے تھے اس فن میں ایک رسالہ بھی لکھا اور ایک کتاب پر حواشی بھی تحریر فرمائے، بعض کتابوں کا درس خصوصیت کے ساتھ شہرت کا حامل رہا، ۱۳۹۱ھ مطابق ۱۹۷۱ء میں حدیث شریف کی کتابوں کا درس بھی متعلق ہوا ابتداء میں مؤطا مالک پڑھائی، پھر طحاوی شریف پڑھانے کا موقع ملا، اس کے بعد مسلم

شریف پڑھانے کی سعادت حاصل کی، ۱۳۹۷ھ مطابق ۱۹۷۷ء میں حضرت مولانا شریف حسن دیوبندیؒ کے انتقال کے بعد بخاری شریف آپ کے سپرد کردی گئی، اس طرح آپ مدرس بننے کے ٹھیک تیس سال کے بعد شیخ الحدیث کے منصب جلیل پر فائز ہوئے، اور ۱۴۲۹ھ مطابق ۲۰۰۹ء تک پورے بتیس سال تک بخاری شریف پڑھاتے رہے، مختلف جسمانی عوارض اور ضعف ونقاہت کی بنا پر دیانۃً حضرت شیخ نے یہ مناسب سمجھا کہ بخاری شریف کی تدریس کی وقیع اور بھاری بھرکم ذمہ داری سے معذرت کرلی جائے اور وہ منصب صدارت بھی چھوڑ دیا جائے جو حضرت مولانا معراج الحق صاحب دیوبندیؒ کی وفات کے بعد ۱۴۱۲ھ مطابق ۱۹۹۱ء میں آپ کے سپرد کیا گیا تھا دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ نے آپ کی طویل تدریسی اور انتظامی خدمات کے اعتراف واحترام میں آپ کا مشاہرہ برقرار رکھا اور مفوضہ ذمہ داریوں سے سبکدوش کردیا، دارالعلوم دیوبند میں آپ کی تدریسی مدت پینسٹھ سال ہے، غالبًا یہ ایک ریکارڈ ہے، اتنی طویل مدت تک کسی بھی استاذ نے دارالعلوم دیوبند میں تدریسی خدمات انجام نہیں دیں، بتیس برس تک بخاری شریف کا درس بھی ایک ریکارڈ ہی ہے، اس دوران کم وبیش پچیس ہزار طلبہ نے آپ سے بخاری شریف پڑھی اور سند حدیث حاصل کی، اس وقت دارالعلوم دیوبند کے تمام چھوٹے بڑے اساتذہ آپ ہی کے شاگرد ہیں ہندوستان بھر میں اس وقت دارالعلوم دیوبند کے جو فضلائے کرام علوم اسلامیہ کی آب یاری میں مشغول ہیں ان میں بڑی تعداد حضرت شیخ کے تلامذہ کی ہے۔

حضرت شیخ کا درس طلبہ میں ہمیشہ مقبول رہا ہے، نہایت شائستہ وشستہ لب ولہجہ تھا، مرتب اور جامع کلام فرماتے، آواز نہایت بلند تھی، لیکن کرخت نہیں تھی، اسباق کی پابندی میں ضرب المثل تھے، وقت پر درسگاہ میں تشریف لے آتے اور جب تک سبق جاری رہتا پورے ادب واحترام کے ساتھ اپنی نشست پر تشریف فرما رہتے، بخاری

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

شریف کا سبق بعض اوقات کئی کئی گھنٹے جاری رہتا، اس دوران نہ پہلو بدلتے، نہ نشست کی ہیئت تبدیل کرتے، نہ ٹیک لگاتے، جس طرح آ کر بیٹھتے شروع سے آخر تک اسی طرح بیٹھے رہتے، اللہ تعالیٰ نے حسن صورت کے ساتھ حسنِ سیرت بھی عطا کیا تھا، آپ کا ظاہر جتنا اُجلا تھا اتنا ہی اُجلا آپ کا باطن بھی تھا، نہایت متواضع، منکسر المزاج خوش اخلاق، خوش اطوار، حلیم، بردبار، شاید ہی زندگی بھر اپنی ذات سے کسی کو کوئی تکلیف پہنچائی ہو، حالانکہ آپ کئی سال تک دارالاقامہ کے ناظم بھی رہے، پھر نائب مہتمم بھی بنائے گئے، صدر المدرسین کے عہدۂ جلیلہ پر بھی فائز رہے، یہ تینوں عہدے انتظامی ہیں اور ان کا تعلق براہِ راست طلبہ واساتذہ کے انتظام وانصرام سے ہے، ایک منتظم کو بسا اوقات سخت فیصلے لینے پڑتے ہیں جو متعلقہ افراد کے لیے ناگواری کا سبب بھی بن جاتے ہیں، لیکن ہمارے علم میں کوئی ایسا واقعہ نہیں ہے جس سے پتہ چلتا ہو کہ آپ نے ان عہدوں پر رہتے ہوئے کسی کو ادنیٰ درجے کی بھی تکلیف پہنچائی ہو۔

فطری طور پر آپ خدا ترس انسان تھے، معمولات کے انتہائی پابند تھے، قرآن کریم کی تلاوت، نوافل اور اوراد وظائف سے خاص شغف تھا، ہر جمعہ کو نماز جمعہ سے بہت پہلے مسجد میں تشریف لے جاتے، اور نہایت اہتمام کے ساتھ صلوۃ التسبیح ادا فرماتے، جب تک مسجد میں حاضری کی ہمت رہی یہی معمول رہا، ابتدا میں شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ سے بیعت وارادت کا تعلق قائم کیا، ۱۳۷۷ھ مطابق ۱۹۵۷ء میں حضرت مدنیؒ کی وفات کے بعد حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ سے رجوع ہوئے اور خلافت سے سرفراز کئے گئے، حضرت شیخ کے یہاں اخفاء بہت تھا، نہ کسی پر آپ نے کبھی یہ ظاہر کیا کہ میں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ سے مجاز بیعت ہوں اور نہ کبھی کسی کو بیعت کیا کہ یہ راز ظاہر ہو جاتا، وہ تو اتفاقاً کسی شاگرد کے استفسار پر یہ راز منکشف ہو گیا، لیکن جب راز کھل گیا تو مخاطب کو یہ

ہدایت بھی فرمائی گئی کہ اس بات کا کسی سے ذکر نہ کیا جائے، بہت سی خصوصیات کے لحاظ سے حضرت شیخؒ قدیم طرز کے بزرگان دین کے عکس جمیل تھے، حضرت شیخ الاسلامؒ اوران کے گھرانے سے خاص تعلق تھا، بخاری شریف کے ختم پر دُعا کراتے تو اس گھرانے کے لئے اور خاص طور پر حضرت کی اہلیہ محترمہ کے لئے بہ طور خاص دُعا کراتے حضرت مدنیؒ کا ذکر فرماتے تو آواز بھرّ اجاتی، اور آنکھیں بھر آتیں۔

احقر راقم السطور کی خوش قسمتی ہے کہ اسے حضرت شیخ صاحبؒ کے سامنے زانوئے تلمذ طے کرنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے، میرے والد محترم حضرت مولانا واجد حسین صاحب دامت برکاتہم شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل بھی حضرت شیخ کے خصوصی تلامذہ میں تھے، میرے لئے یہ بھی کچھ کم سعادت کی بات نہیں ہے کہ میرے بیٹے عزیزم یاسر ندیم نے بھی حضرت شیخ کی شاگردی کا شرف حاصل کیا ہے اور آپ سے بخاری پڑھی ہے، اس طرح ہمارے خاندان کی تین نسلیں حضرت سے براہ راست مستفید ہوئی ہیں ہم اس شرف وسعادت پر جتنا بھی فخر کریں کم ہے۔

آپ میری طالب علمی کے دور میں دارالاقامہ کے ناظم تھے، اس وقت حضرت مولانا شریف حسن دیوبندی جو احقر کے ماموں بھی تھے، ناظم اعلیٰ تھے، ان دو حضرات کے ساتھ حضرت مولانا محمد نعیم دیوبندیؒ سابق شیخ الحدیث دارالعلوم وقف دیوبند بھی ناظم تھے، ان تینوں حضرات سے راقم السطور کو گہری قربت حاصل تھی، اور میں اس حوالے سے بہ کثرت دارالاقامہ کے دفتر میں آتا جاتا تھا، یہ تینوں حضرات بھی مجھ پر نہایت شفقت فرماتے تھے، دارالعلوم سے فراغت کے بعد میں کچھ دنوں کے لئے لکھنؤ جاکر مقیم ہوگیا، ان ہی دنوں حضرت شیخؒ نے اپنے ایک مکتوب گرامی کے ذریعے مجھے دیوبند واپسی کا حکم دیا اور تحریر فرمایا کہ ہم تینوں نے تمہیں حیدرآباد کے فلاں مدرسے میں صدر مدرس بنا کر بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے، تمہیں درس وتدریس میں لگنا

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

چاہئے وغیرہ وغیرہ، حسب الحکم میں دیوبند ہوتا ہوا حیدرآباد پہنچ گیا، اسی دوران حضرت نائب مہتمم بنائے گئے، حیدرآباد کے قیام کے دوران مجھے حضرت کے خط ہی سے اطلاع ملی کہ مجھے مجلس شوریٰ نے اجلاس صد سالہ کے شعبۂ تصنیف وتالیف میں تصنیفی وتالیفی خدمت کے لئے منتخب کیا ہے، حکم تھا فوراً دیوبند پہنچو، احقر اسی وقت دیوبند پہنچا اور اپنی ڈیوٹی سنبھالی، اس دوران بار بار دارالاہتمام میں حاضری ہوتی تھی اور حضرت کی خدمت میں بیٹھنا بھی نصیب ہوا کرتا تھا، یہ بھی حسن اتفاق ہی ہے کہ حضرت کا دولت کدہ جس محلے میں واقع ہے اسی محلے میں احقر کا غریب خانہ تھا، اس طرح اکثر وبیشتر آتے جاتے راستے میں مسجد میں حضرت کی زیارت رہتی تھی، کسی شخص کا کوئی بھی کام ہوتا ہم بلا تکلف گھر کے دروازے پر دستک دیدیا کرتے تھے، ہم نے حضرت کو اس گستاخی پر کبھی کبیدہ خاطر یا ناراض نہیں پایا، اپنی کاروباری مصروفیات کی وجہ سے میں حضرت شیخ کی خدمت میں حاضری کا سلسلہ باقی نہیں رکھ پایا، لیکن ختم بخاری شریف کے موقع پر احقر لازماً دارالحدیث میں حاضر ہوکر درس اور دُعا دونوں میں شرکت کی سعادت حاصل کرتا تھا، آپ جیسے سادہ مزاج نیک نفس، باوقار متواضع، حلیم الطبع، منکسر المزاج علما کم ہی ہوتے ہیں، آپ کے کئی صاحبزادے حیات ہیں، جو سب کے سب حافظ قرآن ہیں، معنوی اولاد کی تو صحیح تعداد بھی شمار نہیں کی جاسکتی، یہ سب لوگ آپ کے لئے صدقۂ جاریہ ہیں جب تک ان کے سانسوں میں گرمی باقی رہے گی اپنے حسنِ عمل سے اپنے استاذ گرامی قدر کے درجات کی بلندی کا ذریعہ بنے رہیں گے ان شاء اللہ۔

جدید عربی زبان سیکھنے اور بولنے کا

مفید اور آسان کورس

تالیف: .... مولانا ندیم الواجدی

معلم العربیہ اردو میں جدید عربی زبان کی تعلیم کے لیے نہایت سہل اور مفید سلسلۂ نصاب تین حصوں میں مکمل ہے، تقریباً تمام ضروری قواعد کا احاطہ کر دیا گیا ہے۔

عربی بولئے عربی مدارس کے اساتذہ، طلبہ، عربی زبان کے اسکالرس حجاج کرام، عرب ممالک میں تجارت، ملازمت اور سیاحت کی غرض سے جانے والوں کے لیے عربی زبان میں بول چال کی کتاب اردو ترجمہ کے ساتھ۔

عربی میں خط لکھئے عربی اُردو میں خطوط نویسی کے موضوع پر اپنی نوعیت کی پہلی کتاب، سو سے زیادہ عربی خطوط کے رواں دواں اور شگفتہ و سلیس ترجمے کے ساتھ تہنیت، تعزیت، شکوہ شکایت، دعوت، محبت، تجارت، تعلیم وغیرہ موضوعات سے متعلق بے شمار خطوط اور تار کے نمونے۔

عربی میں ترجمہ کیجئے عربی زبان میں ترجمہ نگاری اور مضمون نویسی کے لیے رہنما کتاب، دینی، اخلاقی، معاشرتی، سوانحی، وصفی، فکری، تعلیمی، تربیتی، طبی سائنسی، زرعی، لغوی، ادبی، فنی، سیاسی، تاریخی اور دوسرے موضوعات پر نمونے کے مضامین، شروع میں ترجمہ نگاری اور مضمون نویسی کے اصول و قواعد پر مشتمل ایک تفصیلی مقدمہ، کتاب کے آخر میں ایک ہزار سے زائد مشکل الفاظ کے معنی۔

طلب کیجئے ـــ **دار الکتاب دیو بند**

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

ایک عظیم اسلامی انسائکلو پیڈیا

تفسیر، حدیث، فقہ، تصوُّف اور اسرارِ شریعت کا حسین مجموعہ

احیاء العلوم (اردو)

تالیف: حجۃ الاسلام امام غزالیؒ

ترجمہ: مولانا ندیم الواجدی

حجۃ الاسلام امام غزالیؒ کا اسم گرامی کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے، وہ پانچویں صدی کے مشہور بزرگ اور عالم تھے، ان کی شہرت وعظمت کی سب سے بڑی بنیاد وہ کتاب ہے جو ''احیاء علوم الدین'' کے نام سے مشہور ہے اور سالہا سال سے مرجعِ خاص وعام بنی ہوئی ہے۔

یہ کتاب اپنے نام سے حقیقی مطابقت رکھتی ہے، اس نے مٹتے ہوئے علوم کو زندگی بخشی، کفر والحاد کی تاریکیوں میں ایمان ویقین کے چراغ روشن کئے، شاہی ایوانوں میں زلزلہ برپا کیا، خانقاہوں کے فرسودہ اور باطل تصورات منہدم کئے اور ان کو شرعی سانچوں میں ڈھالا، یہ وہ عظیم کتاب ہے جس کی اس زمانے کے نام نہاد علمائے سو نے سخت مخالفت کی، اس کے خلاف فتوے صادر کئے اور اُسے گمراہیوں کا پلندہ بتایا لیکن دنیا ہی میں اس یاوہ گوئی کی سزا بھگتی، یہ ایک مینارۂ نور ہے جس کے ذریعہ ہزاروں لاکھوں گم کردہ راہ مسافروں نے ہدایت کی راہ پائی، یہ ایک شمعِ یقین ہے جس نے شکوک وشبہات کے اندھیرے مٹائے اور متأثر ذہنوں کو منزل کا پتہ بتایا، یہ کتاب اپنے مصنف کے ہم عصر علمائے سو کی مخالفتوں کے باوجود ہر دور میں مقبول رہی، ہر زمانے میں لوگوں نے اسے حرزِ جاں بتایا، اور اس کے علوم سے فیض اٹھا کر اپنی زندگی کے بے رنگ خاکوں میں شریعت کا رنگ بھرا، یہ وہ واحد کتاب ہے جس پر تصوف کے چاروں سلسلے متفق نظر آتے ہیں، اور ہر سلسلۂ تصوف میں اسے یکساں مقبولیت حاصل ہے اس کتاب کا ترجمہ دنیا کی تقریباً تمام اہم زبانوں میں ہو چکا ہے، اصل کتاب عربی

زبان میں ہے، اور چار ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے، دیوبند کی علمی سرزمین سے جدید اسلوب میں اس کا اردو ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔

پہلی جلد: علم، عقائد کے اصول، طہارت کے اسرار واحکام، نماز کے اسرار واحکام، زکوۃ کے اسرار واحکام، روزہ کے اسرار واحکام، حج کے اسرار واحکام، تلاوتِ قرآن کریم کے آداب، دعائیں اور اذکار، مختلف اوقات کے اوراد ووظائف۔ **دوسری جلد:** کھانے پینے کے آداب، نکاح کے آداب، روزی کمانے کے آداب، حلال وحرام، معاشرت کے احکام، گوشہ نشینی، سفر کے آداب، وجد وسماع، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، آدابِ زندگی اور اخلاق نبوت۔ **تیسری جلد:** عجائب قلب کا بیان، ریاضت نفس، شہوت شکم اور شہوتِ فرج کی آفتیں، غصے، کینے اور حسد کی آفتیں، زبان کی آفتیں، دنیا کی مذمت۔ مال اور بخل کی مذمت۔ تکبر اور خود پسندی کی مذمت۔ دھوکا کھانے کی مذمت۔ **چوتھی جلد:** توبہ، صبر وشکر، خوف اُمید ورجاء، فقر اور ترک دنیا، وحدانیت باری تعالیٰ اور توکل، محبت، شوق انس اور رضا، نیت صدق اور اخلاص۔ مراقبۂ نفس اور محاسبۂ ذات، فکر، تذکیر موت۔

اردو ترجمہ کی خصوصیت: یہ ترجمہ دارالعلوم دیوبند کے ممتاز فاضل اردو عربی کے مشہور مصنف مولانا ندیم الواجدی کے قلم سے ہے، ترجمہ مندرجہ ذیل خصوصیات کا حامل ہے، زبان وبیان نہایت سادہ سلیس وشگفتہ، مشکل مضامین کی تسہیل، جا بہ جا تشریحی حواشی، قرآنی آیات کے حوالے اور اردو ترجمہ، احادیث کی تخریج، عربی اشعار کا اردو ترجمہ، ذیلی عنوانات کا اضافہ اور دیگر خصوصیات، پوری کتاب چار ضخیم جلدوں میں اعلا کتابت اور عمدہ کاغذ پر معیاری طباعت۔

دارالکتاب دیوبند۔ یوپی: ۲۴۷۵۵۴

Simpo PDF Merge and Split Unregistered Version - http://www.simpopdf.com

مولانا ندیم الواجدی کی کچھ نئی تصانیف

(۱) جمع الخصائل شرح الشمائل

(۲) اسلام؛ حقائق اور غلط فہمیاں

(۳) نئے ذہن کے شبہات اور اسلام کا موقف

(۴) اسلام اور ہماری زندگی

(۵) ہمارے مدارس؛ مزاج اور منہاج

(۶) رشحات قلم

(۷) آئینۂ افکار

(۸) خدا رحمت کند

(۹) مسلمانوں کی ملّی اور سیاسی زندگی

(۱۰) رمضان کیسے گزاریں (اُردو)

(۱۱) آج رات کی تراویح (اُردو)

(۱۲) رمضان کیسے گذاریں (ہندی)

(۱۳) آج رات کی تراویح (ہندی)

دار الکتاب دیوبند